انسان اور دیوتا
نسیم حجازی

اِنسان اور دیوتا

نسیم حجازی

جہانگیر بک ڈپو

• لاہور • راولپنڈی • ملتان • حیدر آباد • کراچی

ناشر: ریاض اے۔ شیخ (ایڈووکیٹ)

آپ کے مشورے اور شکایات کے لئے۔
E-mail:info@jbdpress.com
www.jbdpress.com

اشاعت: 2005

سرورق: JBD آرٹ سیکشن، لاہور
قیمت: -/225 روپے

ESTD.1923

آفس: 257 ریوانہ روڈ، لاہور۔ فون: 042-7213318 فیکس: 042-7213319
سیلز ڈپو: اردو بازار، لاہور فون: 042-7220879، سیلز ڈپو: اردو بازار، کراچی۔ فون: 021-2765086
سیلز ڈپو: اقبال روڈ نزد کمیٹی چوک، راولپنڈی۔ فون: 051-5552929
سیلز ڈپو: نزد یونیفارم سنٹر جامع مسجد صدر، رسالہ روڈ حیدرآباد۔ فون: 0300-3012131
سیلز ڈپو: اندرون بوہڑ گیٹ، ملتان۔ فون: 061-4781781
نیاز جہانگیر پرنٹرز، غزنی سٹریٹ اردو بازار، لاہور نے پرنٹ کی۔ فون: 042-7314319

عنوانات

بھارت ماتا

کے

سوتیلے بیٹوں کے نام!

نسیم حجازی

دیوتاؤں کے سپاہی

ساون کے دن تھے۔ دریائے بیاس اپنی پوری شان وشوکت کے ساتھ بہہ رہا تھا۔ کنارے پر چند کشتیاں جن کے رسّے بڑے بڑے پتھروں کے ساتھ بندھے ہوئے تھے پانی کی لہروں پر ہچکولے کھا رہی تھیں چند ملّاح کشتیوں کے پاس کھڑے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔

ایک بوڑھے ملّاح نے اپنی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر دوسرے کنارے تک نگاہ دوڑائی اور مُڑ کر ایک نوجوان سے جو لباس سے فوجی افسر معلوم ہوتا تھا سوال کیا:

"کیوں مہاراج! آپ کو یقین ہے کہ وہ آج ضرور آجائیں گے۔"

نوجوان نے جواب دیا "وہ آتے ہی ہوں گے؟"

"تو کیا اُن کے لیے آج ہی دریا عبور کرنا ضروری ہے۔ وہ ایک دو دن پانی اُتر جانے کا انتظار نہیں کر سکیں گے؟"

"ہرگز نہیں۔ سیناپتی جی، مہاراج کے ساتھ وعدہ کر چکے ہیں کہ وہ دس دن کے اندر اندر یہ مہم سر کرلیں گے۔ وہ ایک پل بھی ضائع نہیں کرنا چاہتے۔"

"لیکن مہاراج! آپ انہیں ضرور سمجھائیں۔ ایسے طوفان میں کشتی ڈالنا خطرے سے خالی نہیں۔"

"تم شاید سیناپتی سکھدیو کو نہیں جانتے وہ اپنی دھن کے پکّے ہیں۔"

ملاح نے پوچھا "وہ تیرنا جانتے ہیں؟"

"کون؟"

"سیناپتی جی۔"

"اس سے تمہارا مطلب؟"

"مہاراج! اگر وہ تیرنا نہ جانتے ہوں تو آپ انہیں کشتی پر سوار ہونے سے منع کریں۔ بڑے آدمیوں کی جان بہت قیمتی ہوتی ہے۔"

نوجوان نے مسکراتے ہوئے کہا "تم فکر نہ کرو وہ تیرنا جانتے ہیں اور اگر تیرنا نہ بھی جانتے ہوں تو بھی وہ ملّاحوں سے کام لینا جانتے ہیں۔"

"مہاراج! اس جگہ سے دریا عبور کرتے ہوئے اگر کشتی اُلٹ گئی تو اس میں ہمارا قصور نہ ہوگا۔ ہم اس راستے سے واقف نہیں۔ دوسرے کنارے کی اونچی چٹانوں کے درمیان کشتی لگانے کے لیے بہت تنگ جگہ نظر آتی ہے۔ اگر ہمیں اپنے گھاٹ سے دریا عبور کرنے کا حکم ہوتا تو ہمیں اس پانی کی پروا بھی نہ ہوتی۔ ہمیں اس جگہ کشتیاں لانے میں چار دن لگے ہیں اس وقت پانی بہت کم تھا لیکن بھگوان جانتا ہے کہ ہم جان جوکھوں میں ڈال کر یہاں پہنچے ہیں۔ ایک کشتی راستے میں چٹان کے ساتھ ٹکرا کر پاش پاش ہو چکی ہے اور اب خبر نہیں کیا ہوگا۔ اگر وہاں سے دریا عبور کرلیتے تو کیا حرج تھا؟"

بوڑھا ملاح یہاں تک کہہ کر نوجوان کے جواب کا انتظار کرنے لگا لیکن وہ بے پروائی سے دوسرے کنارے کی طرف دیکھ رہا تھا اور ملاح کو اپنی بات دہرانے کی جرأت نہ ہوئی۔

اس نوجوان کا نام رام داس تھا اس کی عمر اگرچہ چوبیس سال کے قریب تھی تاہم چہرے کی بشاشت اور تر و تازگی سے وہ اٹھارہ سال کا نوجوان معلوم

ہوتا تھا اس کے چہرے سے سپاہیانہ ہیبت کی بجائے کچھ اس قسم کی سنجیدگی اور شرافت ٹپکتی تھی کہ دیکھنے والا ایک ہی نگاہ میں محبت، عقیدت اور اعتماد کے جذبات سے مغلوب ہو کر رہ جاتا۔ رام داس تیوری سے زیادہ مسکراہٹ سے کام لینے کا عادی تھا۔

تھوڑی دیر بعد رام داس نے مُڑ کر بوڑھے ملّاح کی طرف دیکھا اور سوال کیا "تم نے پہلے کبھی اس جگہ سے دریا عبور نہیں کیا؟"

ملّاح نے جواب دیا "مہاراج! ہمارے باپ دادا نے بھی کبھی اس طرف کشتی لانے کی جرأت نہیں کی۔ سنا ہے کہ راجہ گوبند رام کے سیناپتی نے ان لوگوں پر سردیوں کے موسم میں چڑھائی کی تھی لیکن انہوں نے کئی کشتیاں چٹانوں سے پتھر پھینک کر ہی غرق کر دی تھیں۔ سیناپتی جی ان لوگوں کو سزا دینے کے لیے ایک مہینہ پہاڑوں میں پھرتے رہے اور آخر کار پانچ عورتوں، تین بچوں اور دو بوڑھوں کو جن میں سے ایک اندھا تھا قید کر کے لے گئے۔"

رام داس نے کہا "یہی وجہ ہے کہ ہم گرمیوں میں دریا عبور کر رہے ہیں۔"

"مہاراج! گرمیوں میں پتھروں کا وزن کم تو نہیں ہو جاتا۔"

رام داس نے ہنستے ہوئے جواب دیا "سردیوں میں دریا کا پانی اُتر جاتا ہے اور وہ لوگ ہمارے حملے کا خطرہ محسوس کر کے ہوشیار ہو جاتے ہیں لیکن گرمیوں میں وہ دریا کو ناقابلِ عبور سمجھ کر مطمئن ہو جاتے ہیں۔"

رام داس یہ کہہ کر دریا کے کنارے ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ اچانک دوسرے کنارے پر پہاڑیوں کے عقب سے کالے کالے بادل نمودار ہوئے اور آن کی آن میں دھوئیں کی طرح آسمان پر چھا گئے۔ برسات کی پُرنم ہوا کے چند جھونکے آئے اور ہلکی ہلکی بوندیں پڑنے لگیں۔ تھوڑی دیر بعد بجلی چمکی۔ بادل گرجا اور

موسلا دھار بارش ہونے لگی۔

بوڑھے ملّاح نے آگے بڑھ کر کہا "مہاراج! آپ جھونپڑی میں آجائیں۔"

رام داس اُٹھ کر ملّاح کے ساتھ چل دیا۔

چند قدم کے فاصلے پر سرکنڈے کی جھونپڑی کے پاس سفید رنگ کا ایک گھوڑا بندھا ہُوا تھا۔ بوڑھے ملّاح نے جلدی سے اپنی چادر اتار کر گھوڑے پر ڈال دی لیکن رام داس نے کہا "اپنی چادر اتار لو۔ یہ اسے بھیگنے سے نہیں بچا سکتی۔"

ملّاح اپنے ایثار کا ثبوت دینے پر تُلا ہُوا تھا لیکن ہوا کے ایک تند جھونکے نے چادر کو گھوڑے کی پیٹھ سے اڑا کر دس پندرہ قدم کے فاصلے پر پھینک دیا۔ بوڑھا ملّاح چادر کے تعاقب میں بھاگا اور رام داس ہنستا ہُوا جھونپڑی میں داخل ہُوا۔ باقی ملّاح سمٹ کر ایک کونے میں کھڑے ہو گئے۔ ایک ملّاح نے اپنی چادر زمین پر بچھا دی۔ رام داس ابھی بیٹھنے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ ایک ملّاح جو دروازے میں کھڑا باہر جھانک رہا تھا، چلایا۔ "وہ آ گئے وہ آ گئے!! راجہ کی فوج آ گئی!!!"

رام داس اور ملّاح جھونپڑی سے نکل کر بارش میں کھڑے ہو گئے۔

سکھدیو، راجہ کی فوج کا سیناپتی مشکی رنگ کے ایک خوبصورت گھوڑے پر سوار تھا اور چار سو کے قریب پیادہ سپاہی دو لمبی قطاروں میں اس کے پیچھے آ رہے تھے۔ جھونپڑی کے قریب پہنچ کر سکھدیو نے گھوڑا روکا۔ بوڑھے ملّاح نے بھاگ کر گھوڑے کی لگام تھام لی۔ سکھدیو گھوڑے سے اُترا۔ رام داس نے آگے بڑھ کر پرنام کیا۔

سکھدیو نے پوچھا "کشتیاں پہنچ گئیں؟"

رام داس نے جواب دیا "جی ہاں۔"

"کتنی ہیں؟"

"سات ہیں۔ لیکن ایک ذرا ٹوٹ گئی ہے۔"

"ملاحوں کا مکھیا کون ہے؟"

بوڑھے ملاح نے جلدی سے گھوڑے کی باگ دوسرے کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے ہاتھ باندھ کر کہا "حکم مہاراج!"

"ایک پھیرے میں کتنے آدمی پار لے جاؤ گے؟"

"مہاراج! ایک کشتی میں چالیس آدمی جا سکتے ہیں لیکن۔۔۔۔"

"لیکن کیا؟"

"مہاراج! بارش تو آپ دیکھ ہی رہے ہیں، ذرا آگے بڑھ کر دریا کی روانی بھی دیکھ لیجیے۔ ایسے وقت میں دریا عبور کرنا بہت مشکل ہے۔ دریا کا یہ حصہ بہت خطرناک ہے جگہ جگہ پانی میں چھپی ہوئی چٹانیں کشتیوں کے پرخچے اڑا دیتی ہیں۔ دوسرے کنارے پر کشتی لگانے کے لیے صرف ایک چھوٹا سا گھاٹ ہے جو اس وقت بارش کی وجہ سے نظر بھی نہیں آتا۔ اگر ہماری کشتی وہاں پہنچ گئی تو خیر، ورنہ نیچے کی طرف دور دور تک بلند چٹانیں ایک دیوار کی طرح کھڑی ہیں۔ وہاں کشتی لگانے کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ آپ بوڑھے آدمی کی بات مانیں۔ ایک دو دن انتظار کریں۔ اگر آج بارش تھم گئی تو پرسوں تک پانی اتر جائے گا۔"

سکھدیو نے کہا "پرسوں تک! میں اتنی دیر انتظار نہیں کر سکتا۔ مجھے آج ہی دریا عبور کرنا ہے۔"

"مہاراج! آپ کا حکم سر آنکھوں پر، لیکن خطرہ بہت ہے۔ اگر آپ اپنی ہی مرضی پر چلنا چاہتے ہیں تو کم از کم میری ایک بات ضرور مان لیجیے۔"

"وہ کیا؟"

"ہم کشتیاں اپنے گھاٹ پر واپس لے جاتے ہیں۔ کل تک ہم وہاں

پہنچ جائیں گے اور وہاں سے آپ کو دریا کے پار پہنچا دیں گے۔"

سکھدیو نے بڑے کرخت لہجے میں جواب دیا "تم یا خود بے وقوف ہو یا ہمیں بے وقوف سمجھتے ہو۔ اگر اس جگہ سے دریا عبور کرنا ہوتا تو ہمیں اتنی تکلیف اٹھانے کی کیا ضرورت تھی۔ دشمن سے اگر ہمیں یہ امید ہوتی کہ وہ مقابلے کے لیے میدان میں آئے گا۔ تو ہم بیس کوس تو کیا چالیس کوس نیچے جا کر دریا عبور کرتے لیکن ہمارا دشمن شیر نہیں جو سامنے آ جائے، بلکہ خرگوش ہے جو ہماری آہٹ پاتے ہی کوسوں دور بھاگ جاتا ہے۔ سوئے ہوئے خرگوش کو جگا کر پکڑنے کی کوشش کرنا بے وقوفی ہے۔ اس جگہ سے دریا عبور کر کے ہم خرگوش کو نیند کی حالت میں پکڑ سکیں گے۔"

"مہاراج! خرگوش پکڑا جائے یا بھاگ جائے ہمیں تو آپ کا حکم ماننا ہے اگر آپ خفا نہ ہوں تو میں آپ سے آخری بار کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔"

سکھدیو فطرتاً مغرور نہ تھا لیکن اسے سیناپتی کے عہدے پر فائز ہوئے صرف بیس دن ہوئے تھے اور ان بیس دنوں میں وہ زیادہ تر یہی سوچا کرتا تھا کہ وہ ضرورت سے زیادہ نرم دل ہے۔ ایک سپاہی کو اتنا نرم دل نہیں ہونا چاہیے چنانچہ بعض اوقات وہ ان سپاہیوں کو جو اس سے بہت زیادہ بے تکلف تھے مرعوب کرنے کے لیے بگڑنے کی کوشش کرتا۔ اپنے خوبصورت چہرے کو جو ہر وقت مسکرانے کے لیے بنایا گیا تھا خواہ مخواہ غضب ناک بنا لیتا لیکن اس کی اصلی فطرت اس کے ارادوں پر غالب آ جاتی اور وہ اپنے مضبوط ارادوں کے باوجود یہ بھول جاتا۔ کہ وہ سیناپتی ہے۔ وہ دوسروں کے سامنے اپنے پرانے دوستوں کو سخت سست کہتا لیکن تنہائی میں انہیں بلا کر تسلی دیتا اور کہتا "کیوں بھئی! خفا ہو گئے۔ اتنی سی بات پر خفا ہو گئے، تمہارا کیا خیال ہے کہ میں سیناپتی بن

کرمغرور ہو گیا ہوں۔ نہیں تمہارا خیال غلط ہے میں وہی سکھدیو ہوں اس وقت میں کسی اور خیال میں تھا۔"

یہی وجہ تھی کہ بوڑھے ملاح کو بے وقوف کہنے کے بعد سکھدیو نے اسے تسلی دینا اپنا فرض سمجھتے ہوئے اس جگہ سے دریا عبور کرنے کے متعلق اپنے اغراض و مقاصد کی پوری پوری تشریح کر دی لیکن جب اس نے خرگوش کے پکڑے جانے کے متعلق بے اعتنائی ظاہر کرنے کے بعد ایک نیا مشورہ دینے کی اجازت طلب کی تو سکھدیو نے اس کے الفاظ سے زیادہ رام داس کی مسکراہٹ سے اندازہ لگایا کہ سیناپتی کا وقار خطرے میں ہے اس نے جھنجھلا کر کہا۔ "بکو کیا بکتے ہو؟"

بوڑھا ملاح سکھدیو کے لہجے میں اس فوری تغیر کی وجہ نہ سمجھ سکا۔ اس نے پریشان ہو کر کہا۔ "مہاراج! ہم آپ کے نوکر ہیں آپ خفا کیوں ہوتے ہیں۔ اگر آپ حکم دیں تو ہم ہاتھ پاؤں باندھ کر دریا میں کود پڑیں۔ ہمیں اپنی جان کی پروا نہیں لیکن آپ کے سپاہیوں کی جان بہت قیمتی ہے۔ میں صرف یہ کہنا چاہتا تھا کہ اگر آپ اسی وقت دریا عبور کرنا چاہتے ہیں تو پہلے ایک کشتی جانے دیجئے۔ اگر وہ صحیح سلامت پہنچ گئی تو باقی بھی پہنچ جائیں گی۔ ملاح بھی تھوڑے ہیں۔ ہم ایک کشتی پہنچا کر تین کشتیاں ڈال لیں گے۔ تین چار پھیروں میں آپ کی ساری فوج پہنچ جائے گی۔"

سکھدیو نے محسوس کیا کہ اس دفعہ بوڑھے ملاح پر اس کا غصہ قطعاً بے محل تھا اس نے ندامت کو چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "بہت اچھا ایک کشتی پر کتنے آدمی سوار ہو سکیں گے؟"

"مہاراج! پہلے پھیرے میں صرف بیس آدمی ہوں تو بہتر ہو گا۔"

سکھدیو نے رام داس کی طرف دیکھا اور کہا۔ "رام داس! فوج سے بیس

چیدہ سپاہی علیحدہ کرو۔"

"ابھی؟"

"اور کب؟ دریا عبور کرنے کے لیے اس سے اچھا موقع اور کیا ہو سکتا ہے! ہم دشمن کو بھاگنے کا موقع نہیں دینا چاہتے۔ میں رات کے وقت دریا عبور کرنا چاہتا تھا لیکن اب دیوتاؤں کی کرپا سے بارش شروع ہو گئی ہے ہمیں اس سے فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ میں خود پہلی کشتی پر جاؤں گا۔ اگر ہم پہنچ گئے تو باقی سپاہیوں کو کشتیوں میں سوار کروا دینا ورنہ فوج لے کر واپس چلے جانا۔"

رام داس نے جواب دیا۔ "سیناپتی کا حکم ماننا میرا دھرم ہے لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ خطرے کے وقت آپ آگے جائیں اور میں پیچھے رہوں۔ پہلی کشتی پر مجھے جانے دیجئے۔ آپ فوج کی پشت پناہ ہیں۔ آپ کی جان ملک کے لیے بہت قیمتی ہے۔"

سکھدیو نے مسکراتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ رام داس کے کندھوں پر رکھ دیے اور بولا:

"رام داس! تم جانتے ہو کہ راجہ کے دربار میں اس مہم کو سر کرنے کے لیے کسی کو میری تجویز سے اتفاق نہ تھا۔ میں اپنی ذمہ داری پر اس مقام سے دریا عبور کر رہا ہوں۔ اگر میں کسی حادثے کا شکار ہو جاؤں تو گنگا رام اور اس کے ساتھی زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکیں گے کہ میں تجربہ کار نہ تھا لیکن کسی کو یہ کہنے کی جرأت نہ ہو گی کہ میں بزدل تھا۔ اگر میں خود پیچھے رہوں اور کشتی کو کوئی حادثہ پیش آ جائے تو دربار میں کوئی آواز میرے حق میں نہیں ہو گی۔ میں سب کی نظروں سے گر جاؤں گا اور سیناپتی بننے کے متعلق گنگا رام کے خواب پورے ہو جائیں گے۔ اب ہمیں جلدی چلنا چاہیئے اگر بارش تھم گئی تو ہمارا بنا بنایا کھیل بگڑ جائے گا۔"

(۲)

کشتی کا رسا کھولا گیا اور ملاح جل کی دیویوں اور دیوتاؤں کا نام لے لے کر لمبے لمبے بانسوں کے ساتھ کشتی کھینے لگا۔ بوڑھا ملاح کشتی کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک بھاگ بھاگ کر ملاحوں کو ہدایات دے رہا تھا۔ بارش ہر لحظہ تیز ہو رہی تھی۔

کشتی ابھی زیادہ دور نہیں گئی تھی کہ پانی کا بہاؤ اسے نیچے کی طرف کھینچنے لگا ملاح اپنی انتہائی طاقت صرف کرنے کے بعد کشتی کو چند گز اوپر لے جاتے لیکن پانی کی تیزی پھر غالب آ جاتی اور کشتی کئی گز نیچے چلی جاتی۔ بوڑھا ملاح گلا پھاڑ پھاڑ کر اپنے ساتھیوں کا حوصلہ بڑھا رہا تھا۔ سکھدیو بظاہر اطمینان کے ساتھ دریا کی لہروں کی طرف دیکھ رہا تھا تاہم بوڑھے ملاح کی چیخ پکار اسے کبھی کبھی پریشان کر دیتی۔

منجدھار میں پہنچ کر ملاح زیادہ جوش و خروش کے ساتھ جل کے دیوتاؤں کو مدد کے لیے پکارنے لگے۔ کشتی کو اب اوپر دھکیلنا تو درکنار سیدھا لے جانا بھی دشوار تھا۔ ملاحوں کی چیخ پکار سے سپاہیوں کے دل ڈوبے جا رہے تھے۔ سکھدیو ان کے مغموم چہرے اور سہمی ہوئی نگاہیں دیکھ کر بوڑھے ملاح کے قریب جا کھڑا ہوا اس نے اپنے اضطراب کو چھپانے اور چہرے کو شگفتہ بنانے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا "ہماری کشتی کہاں لگے گی؟"

ملاح نے ہاتھ سے دوسرے کنارے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا۔

مہاراج ادھر دیکھئے ان دو چٹانوں کے درمیان ایک چھوٹا سا گھاٹ ہے"

کشتی وہاں نہ پہنچ سکی تو نیچے کی طرف کئی کوس تک کوئی ایسی جگہ نہیں جہاں ہم کشتی لگا سکیں۔ اس کنارے کے ساتھ ساتھ پانی کا بہاؤ بہت تیز ہے اگر ہم

نے کشتی واپس موڑنے کی کوشش بھی کی تو بھی ہمیں کافی دور تک نیچے جانا پڑیگا راستے میں کئی ایسی چٹانیں ہیں جو پانی زیادہ ہونے کی وجہ سے نظر نہیں آتیں اور کشتی کے لیے بہت خطرناک ہیں۔"

سکھدیو یہ سن کر خاموش ہو گیا اور بوڑھا ملاح پھر اپنی چیخ پکار میں مصروف ہو گیا۔

کشتی دو دفعہ بھنور میں پھنسی اور ڈوبتے ڈوبتے بچی۔ بارش تھم چکی تھی اور گھاٹ بہت قریب نظر آ رہا تھا لیکن ملاحوں کے چہروں پر اطمینان کے آثار اب بھی نہ تھے۔ بوڑھا ملاح بدستور چلا چلا کر کنارے کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔

ملاح تھک کر چور ہو چکے تھے اور ان میں سے اکثر پانی کے مقابلے میں اپنی شکست کا اعتراف کر رہے تھے۔ کشتی آہستہ آہستہ کنارے کی طرف بڑھ رہی تھی۔

بوڑھے ملاح کا گلا بیٹھ چکا تھا لیکن منزلِ مقصود قریب دیکھ کر وہ اپنی پوری طاقت سے چلایا۔

شاباش بہادرو! ہم پہنچ گئے۔ ہمت کرو۔ ہمت کرو۔"

ملاحوں نے اپنی رہی سہی طاقت کے ساتھ کشتی کنارے لگانے کی کوشش کی لیکن پانی کا ایک زبردست ریلا آیا اور کشتی چند گز نیچے چلی گئی۔ بوڑھے ملاح نے اضطراری حالت میں اپنی پگڑی اتار کر دریا میں پھینک دی اور دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پیٹنے لگا۔ ملاحوں نے کشتی روکنے کی کوشش کی لیکن اس دفعہ ان کی کوشش بے سود تھی۔ ان کے سامنے گھاٹ کی بجائے مہیب چٹانیں ایک دیوار کی طرح کھڑی تھیں۔ جوں جوں کشتی گھاٹ سے دور جا رہی تھی یہ چٹانیں زیادہ خوفناک نظر آتی تھیں۔

تھکاوٹ اور مایوسی کی وجہ سے ملاحوں کی ہمت جواب دے چکی تھی اور ان کے ہاتھوں میں بانسوں کی گرفت ڈھیلی پڑ چکی تھی۔

کشتی ایک خطرناک رفتار سے کنارے کے ساتھ ساتھ بہہ رہی تھی اور بوڑھا ملاح کشتی کے اگلے سرے پر کھڑا آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر پانی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اچانک وہ دہشت زدہ ہو کر چلایا "چٹان . . . چٹان! . . . ہوشیار! . . . . ہوشیار!!" . . . .

سکھدیو نے غور سے پانی کی طرف دیکھا۔ اسے پانی کی سطح سے اوپر ایک پتھر کی نوک کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔ ملاحوں نے فوراً کشتی کا رُخ بدلنے کی کوشش کی۔ لیکن پانی کی تیزی نے کشتی کو چٹان کی زد سے باہر نہ نکلنے دیا۔ کشتی چٹان کی سطح سے رگڑ کھاتی ہوئی گزری۔ سکھدیو نے اطمینان کا سانس لیا لیکن ملاح یک زبان ہو کر شور مچانے لگے۔

"کشتی ٹوٹ گئی! کشتی ڈوب رہی ہے! اپنی جان بچانے کے لیے تیار ہو جاؤ!"

کشتی کے پیندے میں شگاف ہو چکا تھا اور پانی ایک فوارے کی طرح اچھل اچھل کر اندر آ رہا تھا۔ بوڑھا ملاح سکھدیو کی طرف دیکھ کر چلایا۔

"مہاراج! کشتی ڈوب رہی ہے۔ ناتھو، شمبھو، کالو! مہاراج کی جان بچاؤ!"

سکھدیو نے اپنا ترکش اور کمان دریا میں پھینکتے ہوئے کہا؛

"مجھے کسی کی مدد کی ضرورت نہیں۔" یہ کہنے کے بعد وہ تلوار اٹھا کر پھینکنے کا ارادہ کر رہا تھا لیکن کسی خیال سے رک گیا۔

سپاہی سہمی ہوئی نگاہوں سے کبھی کشتی میں جمع ہونے والے پانی اور کبھی سکھدیو کی طرف دیکھتے۔ سکھدیو نے مغموم لہجے میں کہا۔

"سماج کے بہادرو! بھگوان کی یہی مرضی تھی۔ سماج کی سیوا کے لیے ہمارے بزرگ بڑی بڑی قربانیاں دیتے رہے ہیں۔ موت کے ڈر سے تمہارے چہرے مغموم نہیں ہونے چاہئیں۔ تمہاری رگوں میں بہادروں کا خون ہے۔ ہمت اور استقلال سے کام لو۔ پانی کی لہریں دیکھ کر ہمت نہ ہارو۔ میں جانتا ہوں کہ اب واپس جانا بہت مشکل ہے۔ ہمارے لیے ایک ہی راستہ ہے کہ ہم اس کنارے کے ساتھ ساتھ تیرتے چلیں۔ ان چٹانوں میں کہیں نہ کہیں باہر نکلنے کا راستہ ضرور ہوگا کنارے پر پہنچ کر تمہیں شاید دشمن کا سامنا کرنا پڑے۔ اس لیے تلواریں پاس رکھو باقی ہتھیار پھینک دو۔ جو تیرنا کم جانتے ہوں وہ تلواریں بھی پھینک دیں۔ ملاحوں میں سے جو دوسرے کنارے پر جانے کی ہمت رکھتے ہیں وہ واپس جا سکتے ہیں۔"

بوڑھا ملاح چلایا۔

"کشتی جا رہی ہے۔ جا رہی ہے! ہوشیار! ہوشیار!!"

---

(۳)

سکھدیو دوسرے سپاہیوں اور ملاحوں کی طرح اپنی جان بچانے کے لیے پوری جدوجہد کر رہا تھا۔ ملاحوں نے فرداً فرداً سکھدیو کے قریب پہنچ کر اسے سہارا دینے کی کوشش کی لیکن اس طوفان میں بڑے سے بڑے تیراک کے لیے اپنی جان بچا کر نکل جانا بھی بڑی بات تھی۔ سکھدیو کی جوانمردی اور غیرت نے کسی کی مدد لینا گوارا نہ کیا۔

ملاح دوسرے کنارے کا رخ کر چکے تھے لیکن سپاہیوں میں سے کسی

کو ان کی تقلید کی ہمت نہ ہوئی۔ پانی کی لہروں نے سپاہیوں کو منتشر کر کے چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں تقسیم کر دیا۔ جو تیرنا نہیں جانتے تھے چند بار ہاتھ پاؤں مار کر چیختے چلاتے پانی کی آغوش میں روپوش ہو گئے۔ دریا کے بہاؤ کا سارا زور کنارے کی ناقابلِ عبور چٹانوں کے ساتھ ساتھ تھا۔ پانی کے پیہم تھپیڑوں نے بعض چٹانوں کے نچلے حصوں میں بڑے بڑے خلا پیدا کر دیے تھے۔ اور ان مقامات پر نہایت خوفناک بھنور پیدا ہو رہے تھے۔

سکھدیو اور اس کے چند ساتھی ایک بھنور میں پھنس گئے۔ سکھدیو انہیں موت کے منہ میں چھوڑ کر زبردست جد و جہد کے بعد بھنور سے باہر نکلا۔ اتنی دیر میں اس کے دوسرے ساتھی بہت دور جا چکے تھے۔ کچھ دیر اور تیرنے کے بعد سکھدیو ایک اور بھنور میں پھنس گیا مگر پانی کا چکر اسے زبردستی کھینچ کر کنارے کی طرف لے گیا۔ چٹان میں ایک جگہ پانی کی سطح کے برابر ایک نوکدار پتھر ابھرا ہوا تھا۔ سکھدیو نے اس پتھر کو دونوں ہاتھوں میں مضبوطی کے ساتھ پکڑ لیا۔ لیکن وہ دم نہ لینے پایا تھا کہ اٹھتی ہوئی لہروں کے چند تھپیڑوں نے یہ عارضی سہارا بھی اس کے ہاتھوں سے چھین لیا اور پھر وہ اسی خوفناک بھنور میں چکر کھانے لگا۔ کئی غوطے کھانے کے بعد سکھدیو ادھ موا سا ہو کر بھنور کے چکر سے باہر نکلا اور دریا کے کھلے پانی میں تیرنے لگا۔

سکھدیو میں اب ہاتھ پاؤں ہلانے کی سکت نہ تھی۔ اس کا جسم سردی سے سُن ہو رہا تھا اور سر درد سے پھٹا جا رہا تھا۔ اس نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی لیکن اپنے ساتھیوں میں سے اسے کوئی نظر نہ آیا۔ ہر طرف پانی کی سرکش موجیں موت کا مہیب راگ الاپ رہی تھیں۔ انتہائی مایوسی کی حالت میں زندہ رہنے کی خواہش نے تھوڑی دیر کے لیے اس کی نیم مُردہ رگوں میں ایک نئی

حرارت پیدا کر دی۔ اس رنگ و بو کی دنیا میں چند سانس اور لینے کی تمنا سماج کے مستقبل کو شاندار بنانے اور سماج کے پروہت کو خوش کرنے کے لیے اپنی جان قربان کر دینے کی مقدس خواہش پر غالب آگئی۔ ایک لمحہ کے لیے اس دنیا کی تمام رنگینیاں اور دل فریبیاں جو زمین کے ذرّوں سے لے کر آسمان کے ستاروں تک پھیلی ہوئی ہیں۔ اس کی آنکھوں کے سامنے بکھر گئیں۔ سکھدیو نے آسمان کی طرف دیکھا اور درد بھری آواز میں چلایا۔

"بھگوان — ! بھگوان — ! میں زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ میں زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ میں ابھی جوان ہوں۔ تیرے دیوتاؤں کو میری ضرورت ہے۔ بھگوان ! . . . بھگوان !!"

سکھدیو کی آواز دریا کے ہنگامے میں فنا ہو گئی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو ابل پڑے اور ان آنسوؤں کے ساتھ اس کی رہی سہی ہمت بھی رخصت ہو گئی۔ ۔ ۔ ۔ جب تک ہوش رہا وہ آہستہ آہستہ ہاتھ پاؤں مارتا رہا۔ بعض اوقات پانی کی لہریں اسے اپنے دامن میں چھپا لیتیں اور وہ نیم بے ہوشی کی حالت میں آہستہ آہستہ ہاتھ پاؤں مارتا ہوا اوپر ابھر آتا۔

دیر تک موت و حیات کی کش مکش میں مبتلا رہنے کے بعد سکھدیو کی آنکھوں کے سامنے سیاہی طاری ہونے لگی اور اس کے کانوں سے دریا کی موجوں کا شور محو ہونے لگا۔

---

(۴)

ہوش آنے پر سکھدیو کو چند غیر مانوس آوازیں سنائی دیں۔ اس نے آنکھیں

کھولیں اور اپنے ارد گرد چند اجنبی صورتیں دیکھ کر پھر بند کر لیں۔ گزشتہ واقعات ایک لمحہ کے اندر اندر اس کی آنکھوں میں پھر گئے۔

کیا میں زندہ ہوں؟ یہ سوچتے ہی اس نے پھر آنکھیں کھولیں اور بدحواس ہو کر تماشائیوں کی طرف دیکھنے لگا۔

اس نے اچانک یہ محسوس کیا کہ وہ انتہائی بے چارگی کی حالت میں ان لوگوں کے درمیان پڑا ہوا ہے جو اس کے بدترین دشمن تھے لیکن اسے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ ان کے چہرے نفرت اور حقارت کی بجائے ہمدردی اور تشویش ظاہر کر رہے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جن کے متعلق اس کا انصاف پسند راجہ اور پروہت یہ حکم صادر فرما چکے تھے کہ ان کی جھونپڑیاں جلا دی جائیں اور انہیں سخت سے سخت اذیتیں دے کر مجبور کیا جائے کہ وہ اپنی سرسبز چراگاہوں کو چھوڑ کر کہیں دور چلے جائیں۔

یہ وہ لوگ تھے جنہیں نزدیک سے دیکھنا، جن کے ساتھ ہم کلام ہونا، جن کی آواز سننا اور جن کو چھونا وہ ایک بدترین پاپ سمجھتا تھا۔ جنہیں سماج کا قانون اچھوت قرار دے چکا تھا۔ جن کے ساتھ ظلم کرنا اس کا پیدائشی حق تھا۔

یہ سب کچھ تھا لیکن سکھدیو ان لوگوں کے رحم و کرم پر تھا۔ انہیں کی بوسیدہ جھونپڑی میں ایک پھٹے پرانے بستر پر لیٹا ہوا وہ ان کی شکلیں دیکھ چکا تھا۔ ان کے منہ سے نکلی ہوئی آوازیں سن چکا تھا۔ ان کی چھوئی ہوئی چیزیں چھو چکا تھا۔ ہر لحظہ اس کے دھرم کی دولت لُٹ رہی تھی۔ سماج کے خوف سے اس کا دل کانپنے لگا۔

جسم میں اتنی طاقت نہ تھی کہ وہ وہاں سے بھاگ اٹھتا۔ اسے ایک بہادر

سپاہی کی طرح اپنی جان کا خوف نہ تھا لیکن اتنی بری جگہ ایسے لوگوں کے ہاتھوں مارا جانا اسے گوارا نہ تھا۔

تماشائی اس کے متعلق عجیب و غریب باتیں کر رہے تھے۔ ایک نوجوان بھاگتا ہوا جھونپڑی کے اندر داخل ہوا اور اس نے کہا:

"راستہ چھوڑو" سردار آتا ہے۔" تماشائی جھونپڑی کے کونوں میں سمٹ گئے —

ایک بوڑھا شخص لاٹھی ٹیکتا ہوا جھونپڑی میں داخل ہوا۔ اس کے ساتھ ایک نوجوان بلند قامت لڑکی تھی۔ بوڑھا سردار سکھدیو کے قریب آ کر اسے غور سے دیکھنے لگا۔ یہ جاننے کے باوجود کہ اس کی جان اس بوڑھے شخص کے قبضہ میں ہے سکھدیو نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے حقارت سے آنکھیں پھیر لیں۔

بوڑھے سردار نے پوچھا "آپ کون ہیں؟"

سکھدیو نے اس سوال کے جواب میں پھر ایک بار سردار کی طرف دیکھا اور خاموش رہا۔

سردار نے پھر کہا "آپ اونچی ذات کے سپاہی معلوم ہوتے ہیں۔ یہاں کیسے پہنچے؟"

سکھدیو کی خاموشی پر ایک شخص نے جواب دیا "مہاراج! یہ دریا میں ڈوب رہا تھا ہم نے بڑی مشکل سے نکالا تھا۔"

"تم نے بہت اچھا کیا۔"

یہ کہہ کر سردار سکھدیو کی طرف متوجہ ہوا۔ "آپ اطمینان سے یہاں پڑے رہیں آپ بہت تھکے ہوئے نظر آتے ہیں۔ صبح تک آپ کی طبیعت ٹھیک ہو جائے گی۔"

ہم دریا کا پانی اترتے ہی آپ کو پار پہنچا دیں گے۔"

سکھدیو کی پریشان صورت پر قدرے اطمینان کے آثار پیدا ہوئے لیکن سردار کے منہ سے تسلی کے چند کلمات ان ہزاروں کہانیوں کی تردید نہ کرسکے جو ان لوگوں کی وحشت اور بربریت کا ڈھنڈورا پیٹنے کے لیے سماج کے اونچے ایوانوں میں بیان کی جاتی تھیں اور جنہیں سکھدیو کے کان بچپن سے سنتے آئے تھے۔

اس کے دل کی آواز نے اپنا تسلی آمیز لہجہ بدل کر کہا "یہ لوگ ایسے ناپاک لوگ! رحم کے لفظ سے آشنا نہیں۔ یہ تجھے زیادہ سے زیادہ المناک سزا دینے سے پہلے تیری حوصلہ افزائی کرنا چاہتے ہیں۔ تیرے دل میں زندہ رہنے کی تمنا پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ تجھے آگ میں ڈالنے سے پہلے ایک خیالی جنت کی سیر کروانا چاہتے ہیں۔" انتہائی بے کسی کی حالت میں تماشائیوں پر اچٹتی ہوئی نظر ڈالنے اور سردار کی طرف غور سے دیکھنے کے بعد اس کی نگاہیں اس نوجوان لڑکی پر مرکوز ہو کر رہ گئیں جو سردار کے قریب کھڑی تھی۔

سکھدیو نے اچانک یہ محسوس کیا کہ ان ناپاک، مفلس اور نادار لوگوں کے درمیان ایک ایسا وجود بھی ہے جو سماج کی حسین پریوں سے مشابہت رکھتا ہے اس کا لباس دوسری عورتوں سے ستھرا تھا۔ اس کے چہرے پر صبح کاذب کے دھندلکے اور صبح صادق کی سپیدی کی آمیزش سے پیدا ہونے والی ایک دلفریب جھلک تھی۔ اس کے خدوخال میں غایت درجہ کی سادگی، بھولا پن اور جاذبیت تھی۔ بڑی بڑی آنکھوں میں ستاروں کی چمک اور شب کی سیاہی تھی لیکن ان میں شوخی سے زیادہ سنجیدگی پائی جاتی تھی۔ مضبوط اور سڈول جسم جنسِ لطیف کی نزاکت سے زیادہ نسوانی رُعب اور دبدبہ کا آئینہ دار تھا۔ غرض وہ جمالِ انسانی کا ایک ایسا سادہ اور دلفریب مجموعہ تھی، جو پہلی نگاہ میں جاذبِ توجہ اور دوسری

نگاہ میں دل فریب نظر آنے لگے۔

سکھدیو کے سامنے ایک ایسی تصویر تھی جو آنکھوں کو خیرہ کرکے دل میں ایک ہنگامی تلاطم برپا نہیں کرتی بلکہ غیر شعوری طور پر دل کی گہرائیوں میں اتر کر ہلکے دھیمے اور میٹھے سُروں میں ایک ایسا راگ چھیڑتی ہے، جس کی تانیں وقت کی رفتار کے ساتھ بلند ہوتی رہتی ہیں اور بالآخر دل و دماغ کی تمام وسعتوں کو اپنی آغوش میں لے لیتی ہیں۔ لیکن سکھدیو کے ضمیر پر مقدس سماج کا بیٹا ہونے کا احساس کچھ اس طرح غالب تھا کہ وہ اس دوشیزہ کی طرف ایک نظر سے زیادہ نہ دیکھ سکا۔ اچھوت لڑکی کے اپوتر ہونے کا احساس نگاہوں کی تشنگی پر غالب آگیا۔

سردار نے کہا "ایسے موسم میں آپ دریا میں کیوں کودے؟ معلوم ہوتا ہے کہ آپ اچھے تیراک ہیں، ورنہ اونچی ذات کے لوگ بیاس کے تیز اور گہرے پانی سے آجکل دُور ہی رہتے ہیں۔"

سکھدیو نے سردار کی طرف دیکھا۔ دل نے زبان کو کچھ کہنے کی دعوت دی لیکن وہ اُلجھے ہوئے خیالات کی ترجمانی سے قاصر رہا۔ بوڑھے سردار نے شفقت آمیز لہجے میں کہا: "آپ اس قدر پریشان کیوں ہیں؟ حوصلہ کیجیے! ان لوگوں میں آپ کا کوئی دشمن نہیں۔ آپ کے راجہ کے بہادر سپاہی کئی بار ہمیں لوٹنے، ہماری جھونپڑیاں جلانے اور ہمیں غلام بنانے کی نیت سے اس زمین پر اپنے پوتر پاؤں رکھ چکے ہیں لیکن یہ پرانے وقتوں کی باتیں ہیں۔ اب آپ شاید پہلے آدمی ہیں جنہیں ہماری جنم بھومی میں ایک مہمان کی حیثیت سے قدم رکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ اگرچہ ہم اس قابل نہیں کہ آپ کی پوری پوری تواضع کرسکیں لیکن آپ اطمینان رکھیں۔ ہماری جان و مال سے کوئی شے بھی آپ کے پوتر پاؤں کی مٹی سے زیادہ عزیز نہیں سمجھی جائے گی۔"

سردار نے لوگوں کی طرف دیکھا اور کہا۔ "تمہیں یہ ثابت کرنا ہوگا کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں صحیح ہے" اور اس نے آگے بڑھ کر جھکتے ہوئے سکھدیو کے پاؤں چھو لیے۔ سکھدیو ابھی تک تم کی بجائے آپ کہہ کر مخاطب کیے جانے پر ہی حیران تھا۔ سردار کی اس غیر متوقع حرکت کے بعد وہ اپنے دل پر ندامت کا ایک ناقابلِ برداشت بوجھ محسوس کرنے لگا۔ اس کے جی میں آئی کہ اس جھونپڑی میں جس کا ہر تنکا اسے نفرت سے گھور رہا تھا اٹھ کر بھاگ جائے اور پھر اسی دریا میں چھلانگ لگا دے لیکن جسم میں اتنی طاقت نہ تھی وہ انتہائی اضطراب کی حالت میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ لوگ اپنے سردار کی تقلید میں یکے بعد دیگرے اس کے پاؤں چھونے لگے۔ لیکن ان کے ہاتھوں کا لمس اس کے پاؤں کے لیے جلتے ہوئے انگاروں سے زیادہ تکلیف دہ تھا۔ سکھدیو کے ضمیر نے بلند آواز میں کہا "کاش! یہ بوڑھا ان میں سے ہر ایک کو باری باری میرے پاؤں چھونے کی بجائے میرے سینے کو تیز خنجروں سے چھلنی کرنے کا حکم دیتا۔

جب تمام لوگ سردار کے حکم کی تعمیل کر چکے تو اس نے نوجوان لڑکی کی طرف دیکھا اور کہا۔ "بیٹی کنول! تم کیا سوچ رہی ہو۔ مہمان کی عزت کا فرض سب سے زیادہ اس بدنصیب قوم کے سردار کے گھرانے پر عائد ہوتا ہے۔"

نوجوان لڑکی ہچکچاتی ہوئی آگے بڑھی۔ سکھدیو کی طرف حیا، مسرت اور گھبراہٹ میں کھوئی ہوئی ایک دلفریب مسکراہٹ کے ساتھ دیکھا جھکی، سکھدیو کے پاؤں پر کانپتا ہوا ہاتھ رکھا اور دھڑکتے ہوئے دل کو تھامے، آنکھیں جھکائے سمٹتی ہوئی سردار کے قریب آ کھڑی ہوئی، ایک لمحہ کے لیے اس کی تمام رگوں کا خون سمٹ کر گالوں میں آ گیا اور پھر کچھ دیر سرخ اور سفید لہریں ایک دوسرے کا تعاقب کرتی رہیں۔ ایک برقی لہر سکھدیو کے پاؤں سے اس کے دل اور دل سے دماغ تک پہنچی۔ لیکن سماج کے مغرور بیٹے نے اپنے دل میں کسی لطیف خیال کو جگہ نہ دی۔

شام ہو چکی تھی۔ سردار نے چند آدمیوں کے سوا باقی تمام کو اپنے اپنے گھروں کی راہ لینے کا حکم دیا اور سکھدیو سے مخاطب ہو کر کہا۔

"آپ محلات میں رہنے والے ہیں۔ شاید اس بدبودار جھونپڑی میں آپ کو نیند نہ آ سکے اور یہاں گرمی بھی ہے۔ اگر آپ حکم دیں تو آپ کے سونے کا انتظام باہر کر دیا جائے۔ بادل چھٹ چکے ہیں اور باہر ہوا بہت اچھی ہے۔"

سکھدیو جواب دیے بغیر اٹھا اور سردار کے پیچھے چل دیا۔ ایک شخص نے باہر کھلے میدان میں چارپائی لا کر ڈال دی۔ سردار نے سکھدیو کی طرف دیکھ کر کہا۔

"آپ آرام کریں! میرے آدمی آپ کی حفاظت کا خیال رکھیں گے۔"

سکھدیو ہچکچاتا ہوا چارپائی پر بیٹھ گیا۔ سردار نے چند آدمیوں کو رات بھر پہرہ دینے کا حکم دیا۔ آٹھ دس آدمی سکھدیو کے ارد گرد بھیگی ہوئی گھاس پر بیٹھ گئے سکھدیو کا پریشان ضمیر بلند آواز میں پکار اٹھا۔ یہ بہت زیادتی ہے میں رات بھر اتنے آدمیوں کو تکلیف دینے کا حق دار نہیں۔

اس دل میں جسے سماج کی تربیت ان لوگوں کے لیے پتھر سے زیادہ سخت بنا چکی تھی۔ رحم کی کوئی دبی ہوئی چنگاری جاگ اٹھی اس نے سوچا "اگر میں اپنی پوری جماعت کے ساتھ دریا عبور کر لیتا تو ان سادہ لوح انسانوں کا کیا حشر ہوتا! یہ لوگ اس قدر بدنام کیوں ہیں! ہمارے ملک کے سماج نے انہیں انسانوں کا درجہ کیوں نہیں دیا! یہ میرے ساتھ اس قدر شرافت سے پیش کیوں آئے؟ میرے پاؤں چھونے کی بجائے انہوں نے میری بوٹیاں کیوں نہ نوچ ڈالیں، اگر مجھے ان کے ساتھ دشمنی کا فطری حق ہے تو مجھ میں کون سی ایسی خوبی ہے جو ان لوگوں کے رحم کا مستحق بناتی ہے؟" اس نے چاند کی روشنی میں بوڑھے سردار کی طرف دیکھا اور اس

کے چہرے پر شفقت، مروت اور ہمدردی کے آثار دیکھ کر اس کا دل بھر آیا۔

سردار نے کہا " اچھا میں جاتا ہوں۔ آپ کو اگر کسی شے کی ضرورت ہو تو ان آدمیوں میں سے کسی کو میرے پاس بھیج دیں۔"

سردار زیادہ دُور نہ گیا تھا کہ سکھدیو نے چارپائی سے اٹھ کر کانپتی ہوئی آواز میں کہا: ٹھہریے!

سردار نے واپس مڑ کر پوچھا "کیوں کیا بات ہے؟"

سکھدیو نے کہا " مجھے ان آدمیوں کے درمیان نیند نہیں آئے گی۔ آپ مجھ پر اعتبار کریں میں بھاگنے کی کوشش نہیں کروں گا . . . میں تنہا رہنا چاہتا ہوں۔ آج کی رات . . . !"

سردار نے قریب آ کر جواب دیا: اگر آپ جانا چاہیں تو آپ کو کون روک سکتا ہے اگر دریا کی یہ حالت نہ ہوتی تو میں شاید آج ہی آپ کو پار پہنچا دیتا۔ آپ کے دل میں یہ خیال کیوں پیدا ہوا کہ آپ ہماری قید میں ہیں میں نے ان آدمیوں کو آپ کی خدمت میں اس لیے چھوڑا تھا کہ شاید آپ تنہائی میں سونے کے عادی نہ ہوں۔ شہر کے بسنے والے جنگلوں سے خوف کھاتے ہیں۔"

سکھدیو نے مغموم لہجے میں کہا " میں انہیں تکلیف نہیں دینا چاہتا۔ آپ انہیں اپنے اپنے گھر جا کر آرام کرنے کا حکم دیں۔"

سردار کے اشارے سے تمام آدمی اٹھ کر اپنے گھروں کی طرف چل دیے۔ اس نے سکھدیو سے کہا " اس کام کے لیے مجھ سے کہنے کی ضرورت نہ تھی آپ خود انہیں حکم دے سکتے تھے۔ یہ سب مہمانوں کی سیوا کرنا جانتے ہیں اور آپ جیسے مہمانوں کی سیوا کرنے کا موقع بار بار نہیں ملتا۔"

سکھدیو کے دل پر ایک گہرا چرکا لگا اور وہ نڈھال سا ہو کر چارپائی پر بیٹھ

گیا۔ سردار وہاں سے رخصت ہو کر تھوڑی دُور چلنے کے بعد اپنے مکان میں داخل ہوا۔ مکان کے وسیع صحن میں چند عورتیں باتیں کر رہی تھیں انہوں نے سردار کو دیکھتے ہی اپنے اپنے گھروں کی راہ لی۔

---

(۵)

سردار، کنول سے کچھ کہے بغیر صحن میں ایک چارپائی پر لیٹ کر گہرے خیالات میں کھو گیا۔ سردار کا نام ساون تھا اور وہ اس علاقہ میں جس کا کچھ حصہ میدانی اور زیادہ حصہ پہاڑی تھا۔ ان آزاد قبائل کا راہنما تھا جنہیں دریا کے پار اونچی ذات والوں کی سماج کا پروہت اچھوت قرار دے چکا تھا۔ یہ لوگ پنجاب کی ان قدیم اقوام سے تعلق رکھتے تھے جنہیں وسطی ایشیا کے آرین فاتحین کے پے در پے حملوں نے پنجاب کے وسیع میدانوں سے بھگا کر شمال مشرق کے دشوار گزار پہاڑوں میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا تھا۔ آرین یا اونچی ذات کے لوگ مغلوب ہو جانے والے دشمنوں کو سماج کے شودر بنا چکے تھے لیکن پھر بھی ہزاروں لوگ ایسے تھے جنہوں نے اپنی آزادی کی قیمت پر سماج کا قابلِ نفرت حصہ بننا گوارا نہ کیا۔ اور زرخیز میدانوں کو چھوڑ کر کانگڑہ اور کشمیر کے درمیان پھیلے ہوئے پہاڑوں میں آباد ہو گئے۔ میدانی علاقوں کے وہ آرین حکمران جن کی ریاستوں کی حدود ان پہاڑی علاقوں سے ملتی تھیں اپنی اپنی شہرت اور ناموری کے لیے ان آزاد اقوام پر تسلط جمانے کے لیے انفرادی جدوجہد میں مصروف تھے۔ ایک راجہ جس قدر پہاڑی علاقوں میں اپنی فتوحات کے جھنڈے گاڑتا اسی قدر وہ اپنی رعیت اور پروہتوں کی نظر میں قابلِ عزت خیال کیا جاتا۔ میدانی علاقوں کے راجوں کی طرح پہاڑی باغی اقوام کے بھی کئی سردار تھے۔ دُوسرے پہاڑی سرداروں

کی طرح ساون بھی ان چند قبائل کا راہنما تھا جنہیں آریہ فاتحین کا غلام بننے سے نفرت
تھی اور اس کے پڑوس میں میدانی علاقہ کا راجہ بھی ان چند راجاؤں میں سے ایک تھا جو
سماج کی عزت اور اپنی شہرت و ناموری کے لیے ساون اور اس کی سرکش قوم کو مغلوب
کر کے سماج کے شودر بنانا چاہتا تھا۔

اونچی ذات کے راجہ اور پروہت کے لیے یہ لوگ کسی خطرے کا باعث نہ
تھے لیکن انہیں یہ گوارا نہ تھا کہ انسانوں کا ایسا گروہ جسے ان کے دیوتا ٹھکرا چکے
ہوں پہاڑوں کی سرسبز چراگاہوں پر قبضہ جما کر آسمان کی بارش اور زمین کی زرخیزی سے
وہ فوائد حاصل کر سکے جو سماج کے طاقتور دیوتا فقط اونچی ذات کے انسانوں کے
لیے مخصوص کر چکے تھے۔

لیکن اونچ ذات کی روحانی طاقت کا احترام اور ان کی جسمانی طاقت کا خوف
پہاڑ میں رہنے والے سرکش لوگوں کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور نہ کر سکا۔

پڑوس کے راجہ کے آباؤ اجداد گزشتہ صدیوں میں یکے بعد دیگرے ان
لوگوں پر اپنی طاقت آزما چکے تھے لیکن گھنے جنگلوں اور دشوار گزار پہاڑوں میں
قدرت نے ان بے دست و پا لوگوں کی پناہ کے لیے ہزاروں قلعے تعمیر کر دیے
تھے۔ گزشتہ بارہ برس میں پڑوس کے راجہ کی طرف سے ان لوگوں پر کوئی حملہ نہیں
ہوا تھا۔ شاید اس لیے کہ اس عرصہ میں حکومت کی باگ ڈور جن لوگوں کے ہاتھ میں
تھی وہ اپنے آباؤ اجداد کی ناکامیوں سے سبق حاصل کر چکے تھے اور یا شاید اس
لیے کہ اونچی ذات والوں کا سماج خود ہی ایسے لوگوں کو انسانی حقوق سے محروم
کرنے کا قدیم نظریہ بدل چکا تھا الغرض گزشتہ بارہ برس کے امن اور سکون نے
ان لوگوں کو مطمئن کر دیا تھا اور یہ دریا کے پار نشوونما پانے والے سماج کو ایک
طاقتور لیکن پرامن ہمسایہ سمجھنے کے عادی ہو چکے تھے۔

معمولی ضروریات کے لیے بعض لوگ کبھی کبھی دریا عبور کر کے سماج کی مقدس
زمین میں بھی داخل ہو جاتے لیکن وہاں بھی ان کے تجارتی اور کاروباری تعلقات
صرف ان قبائل تک ہی محدود تھے جو سماج کے جبر و استبداد کے سامنے سر جھکا
کر پرامن شودروں کی حیثیت اختیار کر چکے تھے۔ بعض ناوانوں نے اونچی ذات
کے مقدس ایوانوں کی زیارت کے شوق میں شہروں تک جانے کی جرأت کی لیکن
ان میں ایسے خوش نصیب بہت کم تھے جنہیں ایسے خطرناک مقامات کی سیاحت
کے بعد زندہ اپنے گھر لوٹنے کا موقع ملا۔ اس لیے ساون نے چند سال سے یہ
حکم دے رکھا تھا کہ اس کی قوم کا کوئی آدمی دیوتاؤں کی مقدس زمین میں داخل نہ
ہو لیکن پھر بھی بعض لوگ کبھی کبھی دریا عبور کر کے اسے بھرشٹ کر ہی آتے۔

ساون طبعاً شریف تھا اس کی سادگی اور تدبر نے قوم کے ہر بچے اور بوڑھے
کو اس کا گرویدہ بنا دیا تھا۔ وہ گزشتہ چند برسوں سے زندگی کے پرسکون سمندر
میں اپنی قوم کی کشتی کی پتوار سنبھالے ہوئے تھا۔ اس زمانہ میں اس بوڑھے
ملاح کو کسی طوفان سے واسطہ نہ پڑا لیکن دریا کے پار سونے والے طوفان بارہ
برس بعد پھر ایک بار ایک نوجوان راجہ اور ایک بوڑھے پروہت کی شخصیت میں
جاگ اٹھے۔ نوجوان راجہ کو تخت نشین ہوئے دو سال اور پروہت کو اپنے منصب
پر فائز ہوئے چھ مہینے نہ ہونے پاتے تھے کہ دریا کے پار بسنے والے آزاد قبائل
کے خلاف سماج کے دیوتاؤں کی دبی ہوئی آواز پھر بلند ہوئی۔ بارہ برس کے بعد
سکھدیو اونچی ذات والوں میں سے پہلا شخص تھا جس نے سماج کی طاقت کا مظاہرہ
کرنے کے لیے شودروں کی اس ناپاک زمین کو اپنے پوتر چرنوں سے سرفراز کیا تھا۔

---

(۶)

سردار بستر پر لیٹا ہُوا ان عجیب وغریب حالات میں اپنے مہمان کی آمد کے متعلق سوچ رہا تھا کنول اس کی اکلوتی بیٹی کچھ دیر چارپائی پر بیٹھی اس کی طرف دیکھتی رہی۔ بالآخر وہ اٹھی اور ساون کے قریب آ کر بولی:

"باپو! آج آپ بہت پریشان ہیں کھانا لاؤں۔"

ساون نے کنول کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا "نہیں! مجھے بھوک نہیں۔"

کنول پھر بولی۔ "باپو! — وہ مہمان شاید بھوکا ہو۔ . . . . آپ نے اس کو کچھ کھانے کے لیے نہیں کہا۔

سردار نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے جواب دیا "مجھے خیال تو آیا تھا لیکن مشکل یہ ہے کہ اونچی ذات کے لوگ ہمارے ہاتھ کی کوئی چیز نہیں کھاتے۔"

"کیوں باپو؟"

"کنول! تو نہیں جانتی۔ ان کا دھرم انہیں ایسا کرنے سے منع کرتا ہے۔ اگر وہ مجبور نہ ہوتا تو ہماری چارپائی پر بھی نہ لیٹتا۔"

کنول نے کہا "باپو! اگر مجبوری اسے ہمارے بستر پر سلا سکتی ہے تو مجبوری کی حالت میں ہمارے ہاتھ کا کھا لینے میں کیا برائی ہے۔ آپ پوچھ تو لیتے؟"

سردار نے جواب دیا "مجھے ڈر تھا کہ وہ ناراض ہو جائے گا اس لیے میں نے پوچھنے کی جرأت نہ کی۔"

کنول نے کہا "شاید وہ بہت بھوکا ہو اور ناراض نہ ہو۔"

کنول! ہمارے گھر کا کھانا کھا لینے میں اس کا دھرم بھرشٹ ہو جائیگا مہمان کا دھرم خراب کرنا میں پاپ سمجھتا ہوں اگر وہ بھوکا بھی ہو تو بھی میں اپنی

طرف سے اسے کھانے کی دعوت نہیں دے سکتا۔

"اگر وہ خود مانگ لے تو؟"

"تو پھر کوئی بات نہیں لیکن وہ مانگے گا نہیں۔"

"تو باپو اس کا مطلب یہ ہُوا کہ وہ بیچارہ جب تک ہمارے پاس رہے گا، بھوکا رہے گا۔"

"کنول! تم اس کی اتنی فکر کیوں کرتی ہو۔ ہم صبح اسے دریا کے پار پہنچانے کی کوشش کریں گے۔ جاؤ تم سو جاؤ۔"

کنول مایوس ہو کر اپنے بستر پر لیٹ گئی اس نے آنکھیں بند کر کے سو جانے کی کوشش کی لیکن اسے نیند نہ آئی۔ عورت کی وہ فطرت جو کسی اجنبی سے صرف اس لیے دلچسپی لیتی ہے کہ وہ ایک پردیسی ہے اور اس کا پرسانِ حال کوئی نہیں — جو کسی تھکے ماندے مسافر کو دیکھ کر فوراً اس کی بھوک اور پیاس کا اندازہ لگاتی ہے — جو کسی زخمی کی تکلیف کو اپنی تکلیف سمجھ لیتی ہے۔ کنول کو بار بار سکھ دیو کی بھوک کی شدت کا احساس کرنے پر مجبور کر رہی تھی۔

دیر تک چاند کے سامنے سے گزرنے والے ہلکے ہلکے بادلوں کو دیکھنے کے بعد وہ اپنے بستر سے اٹھی۔ سردار گہری نیند میں خراٹے لے رہا تھا۔ کنول دبے پاؤں مکان کے ایک کمرے میں داخل ہوئی۔ ایک ٹوکرے سے چند آم نکال کر جھولی میں ڈالے اور جھجک جھجک کر قدم اٹھاتی ہوئی مکان سے باہر نکل آئی۔

سکھدیو کی چارپائی خالی پڑی تھی۔ کنول کچھ دیر پریشانی کی حالت میں وہاں دھر اُدھر دیکھتی رہی۔ اچانک چاند بادل کے نقاب سے باہر نکلا اور اس کی نگاہیں دُور دُور تک کام کرنے لگیں۔ سکھدیو چند قدم کے فاصلے پر سر جھکائے آہستہ آہستہ ٹہلتا ہُوا چارپائی کی طرف آ رہا تھا۔ کنول نے جلدی سے آم اس کے بستر پر ڈھیر کر دیے

اور واپس لوٹنے کو تھی کہ اچانک کسی خیال نے اُس کا راستہ روک لیا۔ جوں جوں سکھدیو قریب آ رہا تھا کنول کے دل کی دھڑکن تیز ہو رہی تھی۔ ایک نامعلوم خوف اسے وہاں سے دھکیل کر گھر کی طرف لے جا رہا تھا اور ایک نامعلوم کشش اسے وہاں ٹھہرنے پر مجبور کر رہی تھی۔

سکھدیو نے چارپائی کے قریب پہنچ کر اچانک کنول کی طرف دیکھا تو ٹھٹک کر رہ گیا۔ اس نے کنول سے کچھ کہے بغیر چارپائی پر لیٹ جانا چاہا لیکن وہاں آموں کا ڈھیر دیکھ کر کھڑا رہا۔ تھوڑی دیر تذبذب کے بعد اس نے کنول کی طرف دیکھا اور کہا "تم نے میرے لیے یہ تکلیف کیوں اٹھائی؟"

سکھدیو کے لب و لہجہ میں کوئی ایسی بات نہ تھی جس سے وہ پریشان ہوتی وہ جرأت کر کے ایک قدم آگے بڑھی اور بولی "پتاجی کو ڈر تھا کہ آپ خفا ہو جائیں گے...... اس لیے وہ آپ کو کھانے کی دعوت نہ دے سکے... انہوں نے خود بھی کچھ نہیں کھایا...... میں روٹی نہیں لائی.... یہ آم ہیں... اگر کہیں تو روٹی بھی لے آؤں اور دودھ بھی۔"

کنول کا ہر لفظ سکھدیو کے دل سے توہمات کے ہزاروں نقاب الٹ رہا تھا وہ محسوس کر رہا تھا کہ اس پُرسکون ماحول میں اس بھولی بھالی دوشیزہ کے الفاظ اس کے کانوں کو ہی مسحور نہیں کر رہے بلکہ ان کا خلوص درختوں کے پتوں اور آسمان کے ستاروں کو بھی متاثر کر رہا ہے۔

اس نے کہا "نہیں۔ روٹی اور دودھ کی مجھے ضرورت نہیں۔ تم جا کر آرام کرو۔"

کنول نے سراپا التجا بن کر کہا "تو آپ آم کھا لیں گے...." "کھانے کی چیز کھا لینے میں کیا حرج ہے...... آپ شاید کل بھی دریا عبور نہ کر سکیں.... شاید چند دن اور یہیں رہیں.... اتنے دن بغیر کچھ کھائے...!"

سکھدیو نے پہلی دفعہ ایک لمحہ کے لیے غور سے کنول کی طرف دیکھا....

اسے کنول کا سادہ اور معصوم چہرہ یہ کہتا ہوا دکھائی دیا "تم مجھ کو کیا ہو اگر تمہاری بھوک کا احساس نہ ہوتا تو میں اس وقت یہاں نہ آتی"۔ سکھدیو نے محسوس کیا کہ دیوانی اچھوت لڑکی اسے مقدس سماج کا دیوتا سمجھ کر اس کی پوجا کے لیے نہیں آئی بلکہ اس کی بیچارگی پر ترس کھا کر اس کو کھانے کی دعوت دینے کے لیے آئی ہے۔ سماج کا مغرور سپاہی زیادہ دیر اچھوت لڑکی کے سامنے گردن جھکا کر کھڑا نہ رہ سکا۔ وہ آم ایک طرف ہٹا کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اور کنول کچھ کہے بغیر اپنے گھر کی طرف چل دی۔

سکھدیو دیر تک چارپائی پر بیٹھا رہا۔ اچھوت لڑکی کے ہاتھ لگ جانے کے باوجود آموں کی مہک میں کوئی فرق نہ پڑا تھا۔ سکھدیو کی بھوک ناقابلِ برداشت تھی لیکن اس کے باوجود ذات کی برتری کا احساس آموں کی مہک پر قربان ہونے کے لیے تیار نہ تھا۔ سکھدیو نے ایک آم اٹھایا اور تصور کی آنکھیں سماج کے چہرے پر غم و غصہ کے آثار دیکھنے لگیں۔ اس نے گھبرا کر آم وہیں رکھ دیا۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد پھر آموں کے ڈھیر کی طرف دیکھا۔ اگر ان آموں کی قیمت فقط کسی پیٹ بھر لینے والی شئے پر قیاس کی جا سکتی تو سکھدیو نے کچھ سوچے اور بے قرار آنتوں کا مشورہ لیے بغیر انہیں اٹھا کر دور پھینک دیا ہوتا لیکن اچھوت لڑکی کے بھینٹ کئے ہوئے آم فقط آم نہ تھے۔ سکھدیو سپاہیانہ عزم کا مالک ہونے کے باوجود دیر تک کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔ ضمیر کی ایک آواز اسے ہندو سماج کے احترام پر مجبور کر رہی تھی اور اس کی دوسری آواز کسی ایسے جذبے کے احترام کا سبق دے رہی تھی جس سے چند گھڑیاں قبل وہ قطعاً ناآشنا تھا۔ اس کے دل میں دیوتاؤں سے بگاڑ کی ہمت تھی نہ کسی معصوم دل کو ٹھوکر لگانے کا حوصلہ۔

بالآخر عقل نے فیصلہ صادر کیا کہ سماج کے دیوتا اس وقت بھی تیری حرکات

دیکھ رہے ہیں لیکن اس گنہ گار قوم کے سب افراد سو رہے ہیں۔ اس نے قدرے
اطمینان کی حالت میں آم اپنی جھولی میں ڈالے اور ایک طرف چل دیا۔

---

(۷)

مینڈکوں اور جھینگروں کے ترانے بارش کے دیوتا سے مزید لطف و کرم کی
تمنا کر رہے تھے۔ دریا کی لہریں بدستور بڑی بڑی چٹانوں کو سنگ ریزوں اور سنگریزوں
کو ریت کے ذروں میں تبدیل کرنے کے قدیم مشغلے میں مصروف تھیں۔

سکھدیو جھولی میں آم لیے دریا کے کنارے ایک چٹان پر کھڑا اُس چور
کی طرح جو چوری کا مال چھپانے کا ارادہ کر رہا ہو اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔

سماج کا وہ بہادر بیٹا جس کی تربیت تیروں کی بارش اور تلوار کے سائے
میں ہوئی تھی، جسے برہمو سماج کے دشمنوں کی لاشوں کو روندنا اور ان کے خون
میں تیرنا سکھایا گیا تھا دیر تک ایک اچھوت لڑکی کے بھینٹ کئے ہوئے آموں
کے متعلق کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔ سکھدیو نے اپنی کمزوری پر ایک مصنوعی قہقہہ لگایا۔
اس کے قہقہے کی آواز تھوڑی دیر کے لیے فضا میں گونج کر تحلیل ہو گئی لیکن اس
نے محسوس کیا کہ اس کے مصنوعی قہقہہ کے جواب میں تمام کائنات ہنس رہی ہے،
اسے دریا کی لہریں، چاند اور ستارے سب اپنے خلاف سرگوشیاں کرتے ہوئے نظر
آئے اس کا ضمیر بلند آواز سے کہہ رہا تھا۔

"اگر تیرے دھرم میں کمزوری نہیں آئی تو دھرم کے قانون کے خلاف ایک
اچھوت لڑکی کے احترام کے کیا معنی! تو ایک طرف دیوتاؤں کو خوش رکھنا چاہتا
ہے اور دوسری طرف یہ بھی چاہتا ہے کہ ہندو دھرم کے دشمنوں کو بھی تیری طرف

سے کوئی رنج نہ پہنچے۔ تیرا دل گواہی دیتا ہے کہ اچھوتوں کے سردار کی شرافت اور
اچھوت لڑکی کی مہمان نوازی برہمو سماج کے مغرور بیٹوں کو شرمسار کر رہی ہے لیکن
تو اس کا اعتراف کرنے سے گھبراتا ہے۔ کیا تو اب بھی یہ سمجھتا ہے کہ اگر یہ آم
کھانے کی بجائے انہیں دریا میں پھینک دے تو اس جگہ سے واپس جا کر تو سماج
کی زنجیر کا اتنا ہی مضبوط حصہ رہے گا جتنا کہ پہلے تھا۔۔۔۔!!

نہیں! ہرگز نہیں!! تو سر سے لے کر پاؤں تک تبدیل ہو چکا ہے تو وہ
سکھدیو نہیں رہا جو سماج کی زنجیر کی ایک مضبوط کڑی بن سکے۔ اب تم وہ سپاہی
نہیں رہے جو راجہ اور پروہت کی معمولی سی خوشی کے لیے سینکڑوں انسانوں کے سر
قلم کرنے کے لیے تیار ہو جاتے تھے۔ اب تم راجہ اور پروہت کے حکم کے باوجود
کسی شخص کی گردن پر تلوار اٹھانے سے پہلے بہت کچھ سوچا کرو گے۔ ہو سکتا ہے کہ
آئندہ تمہیں ہر شودر میں اس بوڑھے سردار اور اس بھولی بھالی لڑکی کی روح نظر آنے لگے
اور تم ان لوگوں کی حمایت میں ہندو دھرم کے خلاف بغاوت کرنے پر آمادہ ہو جاؤ۔"

بغاوت کا خیال آتے ہی سکھدیو کا دل دھڑکنے لگا۔ اس نے محسوس کیا
کہ وہ کوئی بہت بڑا پاپ کر چکا ہے اور کوئی نامعلوم طاقت اسے دیوتاؤں کے
قدموں سے دُور لے جا رہی ہے اور اس روندی ہوئی ذلیل قوم کے ہزاروں افراد
چاروں طرف سے بھاگ بھاگ کر اس کے گرد جمع ہو رہے ہیں اور بوڑھا سردار اور
نوجوان لڑکی اس کا دامن پکڑ کر کہہ رہے ہیں۔

"بتاؤ! ہم میں کیا برائی ہے، ہم نے کیا قصور کیا ہے؟ تم ہم سے نفرت کیا
کرتے ہو۔ ہمارے خون کے پیاسے کیوں ہو؟" سکھدیو نے محسوس کیا کہ وہ ان
ستم رسیدہ لوگوں کے درمیان ایک مجرم کی طرح کھڑا ہے اور اس کا دل ندامت
کے بوجھ سے پسا جا رہا ہے۔ لیکن اس موقع پر ضمیر کی دوسری آواز جو کسی حد تک

مغلوب ہو چکی تھی آخری بار چلائی "سکھدیو! تم گمراہ ہو رہے ہو، دھرم کی لاج رکھو!
سکھدیو کپکپا اٹھا اور اپنے دل کو تسلی دینے کے لیے بلند آواز میں پکارا :-
"نہیں! نہیں!! میرا ان ذلیل لوگوں کے ساتھ کوئی تعلق نہیں- انہیں دیوتا ٹھکرا چکے ہیں- مجھے ان کے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں ہو سکتی۔"

اس کی مُردہ رگوں میں پھر ایک بار زندگی کا خُون دوڑنے لگا اور وہ محسوس کرنے لگا کہ مقدس دیوتا جنہیں وہ دیکھ نہیں سکتا، اپنی زبردست روحانی طاقت کی بدولت پانی کی سطح پر چل کر اس کی مدد کے لیے آ رہے ہیں اور وہ دیارِ غیر میں ایک بے خانماں مسافر کی حیثیت سے نہیں بلکہ شودروں کی ناپاک بستی میں ہندو سماج کے لاڈلے بیٹے کی حیثیت میں داخل ہُوا ہے اس نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے اپنی جھولی سے ایک آم نکالا اور دریا میں پھینک دیا- آم گرنے کی آواز دریا کی لہروں کے ہنگامے میں گم ہو گئی اور سکھدیو کو پھر ایک بار دریا، پہاڑ، چاند، ستارے اپنے خلاف سرگوشیاں کرتے اور قہقہے لگاتے نظر آنے لگے- اس کی رگوں میں خون کی رفتار سست پڑنے لگی- اچھوتوں کے لباس میں ستم رسیدہ انسانیت کی پکار پھر ایک بار اس کے ضمیر کا دروازہ کھٹکھٹانے لگی- سکھدیو نے محسوس کیا کہ ہندو سماج کے مقدس دیوتا جو پانی کی سطح پر چل کر اس کی مدد کو آئے تھے- پھر اپنے اپنے مندروں میں جا کر سو گئے تھے- اور وہ پھر ایک بار اکیلا چٹان پر کھڑا زمین و آسمان کی لامحدود وسعتوں میں فطرت کی تلخ حقیقتوں کا سامنا کر رہا ہے- اس نے تھوڑی دیر کے لیے آنکھیں بند کر لیں اور تصور میں دیکھا کہ بدنصیب قوم کے ہزاروں افراد اپنے سردار سمیت اس کے سامنے کھڑے ہیں- اسے کنول پھر ایک بار یہ کہتے ہوئے سنائی دی-

"پتاجی کو ڈر تھا کہ آپ خفا ہو جائیں گے اس لیے آپ کو کھانے کی دعوت

نہ دے سکے- انہوں نے خود بھی کچھ نہیں کھایا- میں روٹی نہیں لائی یہ آم ہیں ... کھانے کی چیز کھا لینے میں کیا حرج ہے ؟"

سکھدیو نڈھال سا ہو کر چٹان پر بیٹھ گیا- اس نے اچانک یہ محسوس کیا کہ وہ آم جسے وہ دریا میں پھینک چکا تھا- دوسرے کنارے پر جہاں سے دیوتاؤں کی مقدس زمین شروع ہوتی ہے، جا لگا ہے اور اس جگہ کی خاک میں نمُو بخشنے والی قوتوں نے اسے ایک تناور درخت بنا دیا ہے ـــــ اور مقدس دیوتا اس کا میٹھا پھل کھا رہے ہیں- سکھدیو کے دل سے توہمات کا نقاب یکسر اٹھ گیا- اس نے اپنی جھولی سے دوسرا آم نکالا- اور دریا کی لہروں یا دیوتاؤں کی زمین کی بجائے اپنے بھوکے پیٹ کو اس کا زیادہ حقدار سمجھتے ہوئے کھانے لگا- بھوکے پیٹ نے اچھوت لڑکی کے اپوتر آم کی مٹھاس اور ذائقے کی جی بھر کر داد دی- آم ختم کر کے سکھدیو گٹھلی دریا میں پھینکنے لگا تھا کہ اچانک کسی خیال نے اس کا ہاتھ روک لیا اس نے گٹھلی اپنے قریب رکھ لی- تمام آم کھا چکنے کے بعد اس نے گٹھلیاں اور چھلکے وہاں سے اٹھائے اور واپس پہنچ کر اپنی چارپائی کے قریب ڈھیر کر دیئے۔

سماج کا باغی

سورج مشرق کے اونچے اونچے پہاڑوں کے عقب سے نمودار ہُوا۔ سکھدیو نے انگڑائی لے کر آنکھیں کھولیں۔ سب سے پہلے اس کی نظر بوڑھے سردار پر پڑی جو اس سے دو تین قدم کے فاصلے پر ایک چارپائی پر بیٹھا ہُوا تھا چند آدمی نیچے گھاس پر بیٹھے ہوئے تھے۔ گزشتہ تمام واقعات بجلی کی سی تیزی کے ساتھ سکھدیو کی آنکھوں کے سامنے پھر گئے اور وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

سردار اٹھ کر آگے بڑھا اور اس نے سکھدیو کے پاؤں چھونے کی کوشش کی۔ سکھدیو نے اس کے ہاتھ پکڑ کے پیچھے ہٹا دیا اور چارپائی سے اتر کر اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اس نے اس ماحول کی تلخی کو ایک اداس مسکراہٹ میں چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "آپ مجھے زیادہ نادم نہ کریں۔"

سردار نے جواب دیا "آپ کی عزت اور سیوا میرا فرض ہے۔"

"نہیں۔ میں آپ کا مجرم ہوں . . . ایک ایسا مجرم جو کسی حالت میں بھی آپ کے نیک سلوک کا حق دار نہیں۔"

"یہ نہ کہیئے! آپ ہمارے دیوتا ہیں۔"

"کاش! میں دیوتا ہونے کی بجائے آپ جیسا انسان ہوتا۔"

سردار نے پریشان ہو کر سوال کیا "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔"

"میں درست کہہ رہا ہوں۔ میں دیوتا نہیں راجہ کی فوج کا ایک سپاہی ہوں

میں جس ارادے سے اس جگہ پہنچا تھا اگر وہ آپ کو معلوم ہو جائے تو مجھے یقین ہے کہ آپ اس قدر فیاضی سے کام نہ لیں۔ سنیئے! اگر دریا کا طوفان مجھے بے بس بنا کر اس جگہ نہ لے آتا تو آج اس زمین پہ آزادی کا سانس لینے کی بجائے ایسے لوگوں کی قید میں ہوتے جن کے دل میں آپ کے لیے رحم کی کوئی گنجائش نہیں۔ آپ کے جھونپڑے جلا دیئے جاتے اور آپ کی چراگاہوں پہ ہمارا قبضہ ہوتا۔ کیا اب بھی مجھے آپ ایک دیوتا سمجھتے ہیں؟"

سردار نے جواب دیا: اگر آپ کو ان جھونپڑوں اور چراگاہوں کی ہم سے زیادہ ضرورت ہو تو ہم خوشی سے انہیں چھوڑ کر کسی اور جگہ جانے کو تیار ہیں۔ اس وسیع زمین پر ایسی ہزاروں چراگاہیں تلاش کی جا سکتی ہیں اور لاکھوں جھونپڑے بنائے جا سکتے ہیں۔ جنگ کیے بغیر ہار مان لینے والوں سے جنگ کرنا عقلمندی نہیں"

سکھدیو نے جذبات کی شدت سے مغلوب ہو کر کہا:

"بھگوان کے لیے مجھے زیادہ شرمندہ نہ کریں! میں آج سے پہلے شاید ایک انسان کہلانے کا حق دار بھی نہ تھا۔ آپ نے مجھے وہ سبق دیا ہے جس کی ضرورت شاید ہمارا سماج کئی صدیوں تک بھی محسوس نہیں کرے گا۔ آپ انسان نہیں دیوتا ہیں۔ میں آپ کا داس ہوں۔" یہ کہتے ہوئے سکھدیو نے جھک کر بوڑھے سردار کے پاؤں چھونے کی کوشش کی لیکن اس نے سکھدیو کو گلے لگا لیا۔ اچھوت کا چھوت سے [illegible]ل گیہ ہوتا تھا کہ دونوں کے دلوں سے بیک وقت یہ آواز اٹھی کہ ہم اس دنیا میں ایک دوسرے سے اس قدر بیگانے اور اجنبی رہنے کے لیے پیدا نہیں ہوئے تھے۔ ہماری جدائی غیر فطری بات تھی۔ سکھدیو کو خود غرض انسانوں کا سماج ایک تصنع، ایک دھوکا اور ایک فریب نظر آنے لگا۔ وہ ایک باغی تھا۔ اس راجہ اور اس [illegible]ت کا باغی جس کی خاطر اس نے ایک دن پہلے موت کے منہ میں کودنے سے

دریغ نہ کیا تھا۔ اچھوتوں کے سردار کا ناپاک جسم جس پر اسے اپنی تلوار کی تیزی کو آزمانا تھا اسے اب انسانی برادری کا قابلِ نفرت نہیں بلکہ قابلِ رحم حصہ نظر آتا تھا۔

سردار نے کہا "یہاں دھوپ آگئی ہے۔ چلیئے ان درختوں کے نیچے بیٹھیں۔"

سکھدیو، سردار کے ساتھ ہولیا۔ سردار کے اشارے سے وہ آدمی چارپائیاں اٹھا کر سردار کے مکان کے قریب ایک آم کے درخت کے نیچے لے گئے۔ چند قدم کے فاصلے پر ایک چھوٹا سا چشمہ تھا۔ سکھدیو نے ایک پتھر پر بیٹھ کر منہ ہاتھ دھویا اور پھر سردار کے ساتھ ہولیا۔ درخت کے نیچے پہنچ کر سردار اور سکھدیو ایک دوسرے کے قریب چارپائیوں پر بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر بعد کنول مٹی کا برتن اور ایک پیالہ اٹھائے آئی اور سردار کے سامنے رکھ کر کھڑی ہوگئی۔

"کنول یہ کیا ہے؟" سردار نے حیران سا ہو کر پوچھا۔

"پتاجی! دودھ لائی ہوں۔ آج آپ نے ناشتہ نہیں کیا۔" یہ کہہ کر کنول نے معنی خیز نگاہوں سے سکھدیو کی طرف دیکھا۔

سردار نے بھی سکھدیو کی طرف دیکھا اور کہا:

"کنول رات بھی ضد کر رہی تھی کہ میں آپ کو کھانے کی دعوت دوں لیکن اس خیال سے کہ آپ ہمیں اچھوت سمجھتے ہوں گے میں نے جرأت نہ کی اب یہ مجھ سے پوچھے بغیر دودھ لے آئی ہے اگر آپ اسے پینا اپنے دھرم کے خلاف سمجھیں تو میں ایک گائے یہاں منگوا دیتا ہوں۔ آپ پتوں کا دونا بنا کر اپنے ہاتھوں سے گائے کا دودھ دوہ لیں۔"

سکھدیو نے کہا: "آپ کے آم کھانے کے بعد میرا دھرم مجھے یہ دودھ پینے سے منع نہیں کرتا۔ آپ کے آم بہت میٹھے تھے۔ مجھے یقین ہے یہ دودھ بھی کڑوا نہیں ہوگا۔"

"کون سے آم؟" سردار نے تعجب سے سوال کیا۔

"وہی جو آپ نے رات کے وقت بھیجے تھے۔ میں سچ کہتا ہوں میں نے ایسے آم کبھی نہیں کھائے۔"

سردار کو اور زیادہ پریشان دیکھ کر کنول بولی "پتاجی! آپ سو گئے تھے میں انہیں آم دے آئی تھی میرا خیال تھا کہ یہ کھا لیں گے۔"

سردار نے سکھدیو کی طرف دیکھا اور کہا "اچھا یہ دودھ بھی حاضر ہے۔"

سردار کے اشارے سے کنول نے دودھ کا کٹورا بھر کر سکھدیو کو پیش کیا سکھدیو کو پیاس بھی تھی اور بھوک بھی۔ آموں کی طرح اسے دودھ بھی پہلے سے زیادہ میٹھا اور لذیذ معلوم ہوا اس نے دو کٹورے اپنی مرضی سے پیئے اور تیسرا سردار کے اصرار پر۔

سکھدیو کے بعد سردار نے دودھ پیا اور کنول برتن لے کر اندر چلی گئی۔

سردار نے کہا "مجھے ڈر تھا کہ آپ ہمارے ہاتھ کی کوئی چیز نہیں کھائیں گے اس لیے میرا ارادہ تھا کہ آپ کو کل دریا کے پار پہنچا دوں۔ لیکن اب آپ کو چند دن اور یہاں رہنے پر مجبور کروں گا۔ آپ کو ہمارے پاس کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔"

سکھدیو نے جواب دیا: "آپ کی دعوت کا شکریہ۔ لیکن اگر آپ مجھے یہاں رہنے کی دعوت نہ بھی دیتے تو بھی میں اتنی جلدی واپس جانے کا ارادہ نہ کرتا۔ ہمارا قانون کسی دوسری قوم کے انسان کو اپنی چار دیواری کے اندر داخل ہونے کی اجازت نہیں دیتا۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ اگر کوئی خود غرض سماج سے کنارہ کش ہو کر آپ کے پاس چلا آئے تو آپ شاید اسے واپس بھیج دینا گوارا نہیں کریں گے۔"

"ہم ایسے شخص کو اپنی آنکھوں پر بٹھائیں گے۔ اسے اس سرزمین کی نعمتوں سے فائدہ اٹھانے کا اتنا ہی حق ہوگا جتنا کہ ہمیں ہے۔"

سکھدیو نے کہا: میرے لیے سماج کے دروازے بند ہو چکے ہیں۔"

سردار نے جواب دیا: "آپ ہمارے جھونپڑوں کو بہت وسیع پائیں گے۔"

---

(۲)

چند دن اور اس معصوم ماحول میں رہنے کے بعد سکھدیو محسوس کرنے لگا کہ وہ برسوں اس بستی میں رہ چکا ہے۔ زندگی کے گزشتہ پچیس برس جو وہ اونچی ذات والوں میں گزار چکا تھا اسے ایک خواب نظر آنے لگے۔ وہ ان لوگوں کے سینوں میں ایک ایسی مشعل کی روشنی دیکھ چکا تھا جو اس ملک کے آرین فاتحین کی محفل سے صدیوں پیشتر بجھ چکی تھی۔ وہ اونچے ایوانوں کو اس مشعل کی روشنی سے آشنا کرنا چاہتا تھا لیکن ان ایوانوں میں سونے والے مہیب طوفانوں کا خوف ایسے ارادوں پر غالب رہا۔

سکھدیو صبح شام بعض اوقات سردار کے ساتھ اور اکثر تنہا دریا یا پہاڑوں کی طرف سیر کے لیے چلا جاتا اسے قدرت کا ہر منظر خود غرض انسانوں کے سماج پر مسکراتا ہوا نظر آتا۔ وہ واپس جا کر اونچی ذات والوں کو ایک نیا پیغام سنانے کے لیے بے قرار تھا لیکن کوئی زبردست کشش اسے چند دن اور پہاڑوں اور وادیوں میں گھومنے پر مجبور کر رہی تھی۔ کسی کی معصوم نگاہیں اس کے دل کے خاموش تاروں کو جنبش دے کر ایک ایسا نغمہ پیدا کر رہی تھیں جس کے زیر و بم سے اسے قدرت کے تمام مناظر متاثر دکھائی دیتے تھے کسی کی حیا میں ڈوبی ہوئی مسکراہٹ اسے خوابوں کی حسین دنیا کی طرف بلا رہی تھی کسی کی زبان کا ہر لفظ اس کے لیے ایک راگ بن رہا تھا۔

کنول اسے اس خستہ حال قوم کی بیٹی سے زیادہ اس خطۂ زمین پر قدرت کے حسین مناظر کا ایک جزو معلوم ہوتی تھی لیکن سکھدیو کو اس بات کا اعتراف گوارا نہ تھا کہ کنول کی طرف اس کا میلان اس کی جسمانی خوبیوں کی وجہ سے تھا۔ اسے اس بات پر فخر تھا کہ وہ ظالم سماج کے خلاف بغاوت کر کے شودروں کی جماعت میں داخل ہو چکا ہے لیکن اپنے دل پر ایک اچھوت لڑکی کی فتح اس کے نزدیک ایک بدترین شکست کے مترادف تھی۔ وہ چاروں طرف سے ہار مان کر اپنے دل کو اتنا فریب ضرور دینا چاہتا تھا کہ کنول کے ساتھ اس کا لگاؤ محض رحم و انصاف کے ان مقدس جذبات کی پیداوار تھا جن کے ماتحت وہ نوعِ انسان کے ہر گرے ہوئے فرد کو اٹھانے کے لیے تیار تھا لیکن اچھوت قوم کی ایک حسین لڑکی کو ایک شمع تصور کر کے اس پر پروانہ وار فدا ہو جانا اس کے وقار کے منافی تھا۔ وہ کسی کے لیے شفقت کا ہاتھ اٹھانے سے پہلے اسے اپنے لطف و کرم کا متمنی دیکھنے کا آرزو مند تھا لیکن جوں جوں دن گزرتے گئے اس کا یہ وہم دور ہوتا گیا کہ حسن اور معصومیت کی یہ ملکہ اپنے غرور کا تاج اتار کر اس کے پاؤں پر رکھ دے گی۔

سکھدیو کے ساتھ کنول کی ابتدائی دلچسپی ان نسوانی جذبات کی پیداوار تھی۔ جن کی بدولت نوجوان لڑکیاں کسی پردیسی کے دکھ اور تکلیف کو اپنا دکھ اور اپنی تکلیف سمجھنے پر مجبور ہو جاتی ہیں لیکن جب سردار کی قوم کے سینکڑوں افراد سکھدیو کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانے لگے تو کنول قدرے تکلف سے کام لینے لگی۔ ابتدا میں وہ سکھدیو کی غریب الوطنی سے متاثر ہو کر اسے اپنی طرف سے دل جوئی کا حقدار سمجھتی تھی لیکن سکھدیو کی اجنبیت دور ہوتے ہی اس کا مردانہ وقار اسے مسرت اور خوف کے ملے جلے جذبات سے مغلوب کرنے لگا۔

سردار کی بیٹی اپنے باپ کی طرح بھٹکے ہوؤں کی قیادت اور گرے ہوؤں کی

امانت اپنا فرض سمجھتی تھی لیکن اپنے دھڑکتے ہوئے دل اور لرزتے ہوئے جسم کے لیے اسے کسی کے طاقتور ہاتھوں کا سہارا گوارا نہ تھا۔ سکھدیو کی مصیبت زدہ صورت پر ترس کھانے والی آنکھیں اپنے دل میں کروٹیں لینے والے طوفان پر پردہ ڈالنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

---

(۳)

ایک شام سکھدیو حسبِ معمول سیر کے لیے نکلا۔ آسمان پر بادل چھا رہے تھے اور ساون کی بھیگی ہوئی ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے بارش کی آمد کا پیغام دے رہے تھے۔ سکھدیو دریا کے کنارے ایک اونچی چٹان پر کھڑا ہو کر بہتے ہوئے پانی کا دلکش منظر دیکھنے لگا۔ دریا کی لہریں اس کی آنکھوں کے سامنے گزشتہ واقعات دہرانے لگیں اور وہ گرد و پیش سے بے خبر سا ہو کر پھر ایک بار اپنی زندگی کا وہ حسین ترین نغمہ سننے لگا جس کے الفاظ یہ تھے:

"پتاجی کو ڈر تھا کہ آپ خفا ہو جائیں گے .... میں روٹی نہیں لائی .... یہ آم ہیں .... کھانے کی چیز کھا لینے میں کیا حرج ہے؟"

اس کے بعد اسے کنول کے موجودہ طرزِ عمل کا خیال آیا اور اس نے محسوس کیا کہ فضا میں اداسی چھا رہی ہے اس نے اپنے دل میں کہا: "میں یہاں کیا کر رہا ہوں۔ میرا یہاں کون ہے۔ کنول جیسی بھولی بھالی لڑکی میرے دل تک کیونکر پہنچ سکتی ہے۔ لیکن اس کا کیا قصور؟ میں نے خود اپنے دل کا حال اس سے چھپائے رکھا .... اور اگر میں اس پر اپنے دل کی کیفیت ظاہر بھی کر دوں تو بوڑھا سردار یہ کیسے گوارا کرے گا کہ اس کی لاڈلی بیٹی ایک اجنبی کے ساتھ منسوب ہو جائے

اس کے تمام احسانات کے بعد میں یہ جرأت کیسے کر سکتا ہوں کہ اس کے سامنے اتنے بڑے انعام کے لیے ہاتھ پھیلاؤں۔ وہ مجھے شرافت کا مجسمہ خیال کرتا ہے اور میری طرف سے ایسی کوئی حرکت یقیناً مجھے اس کی نظروں سے گرا دے گی .... نہیں! نہیں!! مجھ سے یہ نہیں ہو سکے گا۔ میں یہاں نہیں رہوں گا لیکن میں اب کہاں جا سکتا ہوں۔ اپنے دیس میں اب کھشتری ہو کر رہنے کی میرے لیے کوئی جگہ نہیں۔ میں کہیں دور چلا جاؤں گا۔ ان اونچے پہاڑوں میں شاید کہیں مجھے سکون حاصل ہو سکے۔"

اپنے دل میں اس قسم کے ہزاروں منصوبے باندھتا ہوا سکھدیو واپس مڑا۔ چٹان سے نیچے اتر کر اس نے ابھی چند قدم ہی اٹھائے تھے کہ اسے تھوڑی دور گھاس پر کوئی بیٹھا ہوا نظر آیا۔ شام کے دھندلکے میں وہ اسے پہچان نہ سکا لیکن قریب پہنچ کر اس کا دل دھڑکنے لگا۔ کنول منہ دوسری طرف کیے بیٹھی تھی اور زمین سے گھاس کے تنکے اکھاڑ اکھاڑ کر ایک طرف پھینک رہی تھی۔ سکھدیو کے پاؤں کی آہٹ پا کر اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔ سکھدیو نے دھڑکتے ہوئے دل پر قابو پا کر پوچھا۔

"کنول اس وقت یہاں کیا کر رہی ہو؟"

کنول نے زمین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا "یہاں میں نے آم کی گٹھلیاں بوئی تھیں۔ برسات کی وجہ سے گھاس بہت زیادہ ہو گئی ہے۔ میں اسے صاف کر رہی تھی۔"

سکھدیو نے نیچے دیکھا۔ آم کے چھوٹے چھوٹے پودوں کی کونپلیں زمین سے باہر پھوٹ نکلی تھیں۔

سکھدیو نے کہا: "معلوم ہوتا ہے کہ تمہیں آموں کا بہت شوق ہے۔ تم

نے پہلے بھی کبھی آم بوئے ہیں؟"

کنول نے جھجکتے ہوئے جواب دیا: "نہیں . . . . یہ آم اس دن آپ نے کھائے تھے میں نے گٹھلیاں لا کر اس جگہ بو دیں۔ یہ تمام اُگ آئی ہیں۔"

کنول کے یہ سیدھے سادے الفاظ سکھدیو کی توقع سے بہت زیادہ تھے اس کا دل جو ایک لمحہ پیشتر ایک تلخ احساس کے ماتحت بیٹھا جا رہا تھا خوشی سے اچھل پڑا۔

دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور آنکھیں جھکا لیں۔ محبت کی پریاں آم کے پودوں کے درمیان رقص کر رہی تھیں۔ سکھدیو پودوں کے قریب بیٹھ گیا اور ان کے گرد اُگی ہوئی گھاس اکھاڑنے لگا۔ ان پودوں کی نرم و نازک کونپلوں میں اسے کنول کے دل کی سادگی اور رنگینی نظر آنے لگی۔ اسے اپنی شکست کا اعتراف کر لینے میں کوئی عذر نہ تھا۔

اچانک ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا اور بارش کے موٹے موٹے قطرے گرنے لگے۔ سکھدیو اور کنول بھاگ کر ایک درخت کے نیچے پہنچے اور ایک دوسرے سے ذرا ہٹ کے کھڑے ہو گئے لیکن جب بارش کا زور بڑھا اور ہوا کے تُند جھونکے کے ساتھ آنے والے چھینٹوں کی وجہ سے کوئی جگہ محفوظ نہ رہی تو دونوں درخت کے ایک موٹے تنے کے نیچے سمٹ کر ایک دوسرے کے قریب کھڑے ہو گئے۔

نیچ ذات کی کم مائیگی کے احساس سے بیگانہ اور اونچی ذات کے تقدس سے بے نیاز دو دھڑکتے ہوئے دلوں کے درمیان اجنبیت کے تمام پردے اُٹھ چکے تھے۔

سکھدیو نے کہا "کنول! تم نے وہ آم کیوں بوئے تھے؟"

"آم آپ کو پسند نہیں؟"

"کیوں نہیں۔ تمہارے ہاتھ کے آم تو بہت میٹھے ہوتے ہیں۔ ان آموں کی مٹھاس میں اب تک محسوس کر رہا ہوں۔"

"آپ بھوکے تھے ورنہ ان آموں میں کوئی خاص خوبی نہ تھی۔"

سکھدیو نے تھوڑی دیر سوچنے کے بعد کہا "کنول! میں تمہارے پاس صرف چند دن اور ہوں۔"

"چند دن؟" کنول نے چونک کر پوچھا۔

"ہاں کنول! مجھے ڈر ہے کہ اگر میں زیادہ دن ادھر ٹھہرا تو آپ لوگ اکتا جائیں گے۔"

"اگر آپ اس خیال سے جانا چاہیں تو پتا جی آپ کو اجازت نہیں دیں گے لیکن اگر آپ ہم سے اکتا کر جانا چاہیں تو آپ کو کون روک سکتا ہے۔ آپ اپنی مرضی کے مالک ہیں۔"

"لیکن اس بستی میں ایک وجود ایسا بھی ہے جو مجھے روک سکتا ہے اور جس کا معمولی سا اشارہ میرے ارادوں کو توڑ سکتا ہے۔"

"وہ کون؟"

"تم نہیں جانتیں اسے؟"

"نہیں! اگر مجھے اس کا پتہ چل جائے تو میں خود اس کی منت کروں۔ کہ وہ ہمیشہ آپ کے ارادے توڑتا رہے۔"

"کنول تمہیں معلوم نہیں وہ تمہی تو ہو۔"

"میں؟"

"ہاں تم!"

تو میں ایک بار نہیں ہزار بار کہتی ہوں کہ آپ نہ جائیں۔"
سکھ دیو نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا "میں نہیں جاؤں گا کنول! میں نہیں جاؤں گا! میں جا بھی کہاں سکتا ہوں؟"

دونوں تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہو گئے۔ تاریکی بڑھ رہی تھی ہوا رک چکی تھی لیکن بارش کا زور پہلے سے بھی زیادہ تھا۔

کنول نے کہا "بارش شاید کم نہ ہو ہمیں چلنا چاہیے۔ پتا جی پریشان ہو نگے۔"

"چلو"!

دونوں ایک ساتھ ہی چند قدم آگے بڑھے تھے کہ بادل گرجا اور کنول نے سہم کر سکھ دیو کا بازو تھام لیا۔

"ڈر گئیں؟"

"نہیں" کنول نے سکھ دیو کا بازو چھوڑتے ہوئے کہا۔

چند بار بجلی چمکی لیکن سکھ دیو اور کنول بجلی کی روشنی میں اپنا راستہ تلاش کرنے کی بجائے بار بار ایک دوسرے کی صورت دیکھنے کی کوشش کرتے مکان سے تھوڑی دور کنول رک گئی۔ اس نے آہستہ سے کہا:

"آپ یہیں ٹھہریں۔ میں پہلے اندر چلی جاؤں۔ آپ تھوڑی دیر بعد آئیں۔"

---

(۴)

سکھ دیو گذشتہ واقعات کو ایک معمہ سمجھتا تھا لیکن کنول سے تنہائی میں اس غیر متوقع ملاقات کے بعد اسے یہ تمام واقعات ایک دوسرے سے اس قدر مربوط نظر آنے لگے کہ وہ کسی ایسی نامعلوم طاقت کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو جاتا جو

کے دل و دماغ میں چھپ کر اپنے کسی اعلیٰ و ارفع مقاصد کے لیے کام کر رہی تھی۔ اپنے من کے اُجڑے ہوئے مندر کو بسانے کے لیے وہ سماج کے ان دیوتاؤں کی بجائے جو اسے اپنے اور کنول کے درمیان چھوت چھات اور نفرت و حقارت کی ایک دیوار کھینچنے کے مجرم نظر آتے تھے۔ کسی ایسے بھگوان کی زبردست طاقت کے تصور کو جگہ دے رہا تھا جس نے اسے دریا میں ڈوبنے سے بچایا تھا۔ جس نے مصیبت کے وقت اس کے بدترین دشمن کو اس کا بہترین دوست بنا دیا تھا۔ جس نے ایک بھولی بھالی لڑکی کو مہمان نوازی کے عجیب و غریب انداز سکھا دیے تھے اور جس نے اسے اپنی زبردست طاقت سے مرعوب کر کے کنول کے ہاتھ سے آم کھانے پر مجبور کر دیا تھا۔ سکھ دیو یہ سمجھتا تھا کہ کنول اس دن جب کہ وہ بے حد مایوس تھا صرف اپنے ہاتھ کے لگائے ہوئے پودے دیکھنے کے لیے ہی نہیں آئی تھی بلکہ قدرت نے اس بہانے انہیں ایک دوسرے سے کچھ کہنے اور سننے کا موقع دیا تھا اسے یقین تھا کہ ان کی روحیں ایک ساتھ رہنے کے لیے پیدا ہوئی ہیں اور وہ طاقت جو اس مقصد کی تکمیل کے لیے یہ سب کچھ کر چکی ہے۔ عنقریب کوئی ایسا قدم اٹھائے گی جس سے کنول اور اس کے درمیان رہی سہی رسمی اور ظاہری دیواریں بھی ٹوٹ جائیں گی۔

اس قیدی کی طرح جو منصف کی نیک نیتی پر یقین اور اپنی معصومیت کے احساس کی بدولت عدالت میں پابہ زنجیر کھڑا ہونے کے باوجود یہ سمجھ کر مسکرا رہا ہو کہ عدالت کا فیصلہ اس کے خلاف نہیں ہو سکتا۔ سکھ دیو نے اطمینان کے ساتھ ان لوگوں میں دو مہینے گزار دیے۔

اس دوران میں اس نے سردار سے درخواست کی کہ وہ اسے اپنے لیے ایک علیحدہ جھونپڑی تعمیر کرنے کی اجازت دے لیکن سردار نے جواب دیا "آپ جیسے مہمان تو

کے لیے میرا گھر بہت وسیع ہے میں سمجھتا ہوں کہ مجھے پچھلی عمر میں ایک جوان بیٹا مل گیا ہے۔ سکھدیو نے سردار کے اس انکار کو بھی اس طاقت کی منشا کے مطابق سمجھا اور سردار کے مکان میں ایک کمرے کو گوشۂ جنت سمجھنے لگا۔

اس بستی میں صرف سردار کا مکان ایسا تھا جس کی دیواریں پتھر اور چھت لکڑی کی تھی۔ باقی تمام لوگ سرکنڈے کی جھونپڑیوں میں رہتے تھے۔

رات کے وقت عام طور پر سکھدیو کی چارپائی صحن سے باہر کھلی ہوا میں بچھا دی جاتی۔ لیکن بارش کے وقت وہ اپنے کمرے میں سوتا۔ اس کمرے کی آرائش کے لیے چیتے اور ریچھ کی کھالیں بچھا دی گئی تھیں۔ دیوار کے ساتھ ایک تلوار بھی لٹکی ہوئی تھی جو سکھدیو نے اپنے خیال کے مطابق ہمیشہ کے لیے اتار کر پھینک دی تھی۔ لیکن کنول نے ایک قابلِ قدر چیز سمجھ کر اس جگہ رکھ دی تھی۔

سزا

بھادوں گزرتے ہی موسم میں تبدیلی ہونے لگی اور یہ لوگ کھلی ہوا میں سونے کی بجائے اندر سونے لگے۔ سکھدیو جس کمرے میں سوتا تھا اس کے برابر والا کمرہ سردار کا تھا۔ رات کا کھانا کھانے کے بعد کبھی سردار سکھدیو کو اپنے کمرے میں بلا لیتا اور کبھی وہ اور کنول سکھدیو کے کمرے میں آ کر بیٹھ جاتے۔ سردار اپنے عہدِ جوانی کے سیر و شکار کی دلچسپ داستانیں سناتا اور سکھدیو یا تو راجوں مہاراجوں کی لڑائیوں کے واقعات بیان کرتا اور یا نیچ ذات لوگوں سے سماج کے مظالم کا گلہ کرتا۔

جب یہ دلچسپ محفلیں برخاست ہوتیں اور سب اپنے اپنے کمروں میں چلے جاتے تو سکھدیو بستر پر لیٹ کر برابر کی کوٹھڑی میں کروٹیں لینے والی محبوبہ سے تصور میں باتیں کرتا ہوا سو جاتا۔ علی الصباح وہ بیدار ہوتے ہی گاؤں سے کچھ دور ایک جھیل کی طرف چلا جاتا۔ اور جھیل کے ٹھنڈے اور شفاف پانی میں نہانے کے بعد کنول کے بڑے بڑے پھول توڑ لاتا۔

ایک صبح کنول حسبِ معمول دودھ کا کٹورا لیے کر اس کے کمرے میں داخل ہوئی۔ سکھدیو اس کی آمد سے بے خبر کنول کے ایک پھول کو اپنے ہونٹوں سے لگائے اس کی مہک اور ٹھنڈک کا اثر محسوس کر رہا تھا۔

کنول تھوڑی دیر انتظار کرنے کے بعد پیالہ آگے بڑھاتے ہوئے بولی:-

"لیجئے!" سکھدیو نے چونک کر پھول نیچے پھینک دیا اور کنول کے ہاتھوں
سے دودھ کا پیالہ لے کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔
کنول نے اپنے ہونٹوں پر ایک دلفریب مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا۔
"آپ کو یہ پھول بہت پسند ہیں؟"
"ہاں! لیکن اگر ان کا نام کنول نہ ہوتا تو شاید مجھے اس قدر پسند نہ ہوتے۔"
کنول نے حیا اور احسان مندی سے آنکھیں جھکالیں۔ سکھدیو نے کنول
کے چہرے میں ایسی جاذبیت پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔
اس نے کہا "کنول! میں سچ کہتا ہوں تم ان پھولوں سے کہیں زیادہ ....!
سکھدیو ابھی اپنا فقرہ پورا نہ کرنے پایا تھا کہ کنول نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر برابر والے
کمرے کی طرف اشارہ کیا۔
"وہ ابھی تک یہیں ہیں؟"
کنول نے جواب دیا "ہاں!"
"اچھا تو میں آہستہ سے کہتا ہوں کہ تم ان پھولوں سے زیادہ حسین ہو۔"
کنول لجا کر بولی "آپ دودھ پی لیں۔"
"بہت اچھا" سکھدیو نے دودھ کا پیالہ اٹھا کر منہ سے لگایا ہی تھا کہ مکان
سے باہر لوگوں کی چیخ پکار سنائی دی۔
کنول وحشت زدہ ہو کر بولی "شاید باہر لڑائی ہو رہی ہے؟"
سکھدیو نے متعجب ہو کر کہا "لڑائی ــــ! نہیں یہ لڑائی نہیں۔ مجھے چاروں
طرف سے چیخ پکار کی آواز آ رہی ہے۔ شاید وہ آ پہنچے۔"
"کون؟"
"سماج کے بہادر۔ میں ابھی آتا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے سکھدیو نے تلوار اٹھائی

لیکن ابھی کمرے سے باہر نکلا ہی تھا کہ چند آدمی بھاگتے اور چیخیں مارتے ہوئے صحن
میں آداخل ہوئے تمام ایک آواز میں یہ کہہ رہے تھے "وہ آگئے! وہ آگئے!! ہمیں
مار ڈالا۔ سردار کہاں ہے؟"
سکھدیو نے چند بار ان سے یہ پوچھنے کی کوشش کی کہ کیا ہوا۔ کون آگئے
لیکن اسے ہر بار یہی جواب ملا کہ وہ آگئے۔ انہوں نے بستی پر حملہ کر دیا ہے۔
سکھدیو نے بھاگ کر باہر نکلنا چاہا لیکن ایک نوجوان نے اس کا بازو تھام لیا۔
اس نے اپنے آپ کو چھڑانے کی جدوجہد کرتے ہوئے کہا "مجھے چھوڑ دو۔
مجھے جانے دو۔"
نوجوان نے کہا "نہیں وہ بہت زیادہ ہیں۔ آپ موت کے منہ میں نہ جائیے
وہ کسی کو نہیں چھوڑتے۔"
اتنے میں سردار آنکھیں ملتا ہوا اپنے کمرے سے باہر نکلا اور اس نے گھبرا
کر پوچھا "کیا ہوا؟"
ایک شخص بولا "انہوں نے رات کے وقت دریا عبور کر لیا۔ وہ اچانک حملہ
کر کے آس پاس کی تمام بستیاں ویران کر چکے ہیں۔ ان کے بہت سے سپاہی ہماری
بستی میں بھی گھس آئے ہیں اور جو سامنے آتا ہے اسے بے دریغ قتل کر دیتے ہیں۔
بہت سی جھونپڑیوں میں انہوں نے آگ لگا دی ہے اب مقابلے کا وقت نہیں
ہمیں ادھر ادھر بھاگ کر اپنی جان بچانے کی فکر کرنی چاہیئے۔"
سردار نے سکھدیو کی طرف دیکھا اس نے کہا "آپ سب یہیں ٹھہریں میں
جاتا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ میں انہیں روک سکوں گا۔"
اتنے میں چند اور آدمی بھاگتے ہوئے صحن میں داخل ہوئے اور انہوں نے
بتایا کہ راجہ کے سپاہی اسی طرف آ رہے ہیں۔

سردار کے اشارے سے نوجوان نے سکھدیو کو اپنی گرفت سے آزاد کر دیا اور وہ بھاگ نکلا۔

---

(۲)

دور دور کی جھونپڑیوں میں آگ لگی ہوئی تھی اور لوگ وحشت زدہ ہو کر ادھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ اکثر کا رُخ پہاڑوں کی طرف تھا اور بعض ابھی تک اپنے بوڑھے سردار کو اپنی سب سے بڑی پناہ خیال کر کے اس کے گھر کا رُخ کر رہے تھے۔ پیدل سپاہیوں کی ایک ٹولی ایک سوار کی قیادت میں مار دھاڑ کرتی ہوئی سردار کے مکان کی طرف آ رہی تھی۔ سکھدیو بھاگ کر ان کے قریب پہنچا۔ سپاہیوں نے اپنے پرانے سپہ سالار کی طرف دیکھا اور ٹھٹک کر رہ گئے۔ اس ٹولی کا نوجوان سالار بھی سکھدیو کو دیکھتے ہی گھوڑے سے کود پڑا اور سیناپتی! سیناپتی!! کہتا ہوا سکھدیو کے پاؤں پر گر پڑا۔ سکھدیو نے اسے اٹھا کر گلے لگا لیا۔ یہ رام داس تھا۔

"بھگوان کا شکر ہے کہ آپ سلامت ہیں کہیئے آپ کے ساتھ کیا بیتی؟"

سکھدیو نے کہا "یہ باتوں کا وقت نہیں۔ تم فوراً گھوڑے پر سوار ہو جاؤ اور فوج کو قتل و غارت بند کرنے کا حکم دو۔"

"لیکن .... !"

"لیکن کیا؟ .... میں تمہیں حکم دیتا ہوں!"

"آپ کا حکم سر آنکھوں پر، لیکن سیناپتی گنگارام ہے اور اس کا حکم ہے کہ کسی کو زندہ بھاگنے کا موقع نہ دیا جائے۔"

"میں تمہیں حکم دیتا ہوں!" سکھدیو نے اپنی آواز کو زیادہ مؤثر بناتے

ہوئے کہا۔

سابق سپہ سالار کی غضب ناک نگاہوں نے رام داس کے دل میں اطاعت کا پرانا جذبہ بیدار کر دیا وہ فوراً گھوڑے پر سوار ہوا اور آن کی آن میں جھونپڑوں کے پیچھے غائب ہو گیا۔

سکھدیو نے باقی سپاہیوں کو بھی حکم دیا کہ وہ ادھر اُدھر بھاگ کر تمام لشکر کو قتل و غارت بند کر دینے کا حکم پہنچا دیں۔ سپاہی بغیر کسی حیل و حجت کے وہاں سے بھاگے اور چاروں طرف چھائے ہوئے لشکر کے افسروں اور سپاہیوں کو سکھدیو کا پیغام پہنچانے لگے۔

اس بستی کے دوسرے کونے میں گنگارام ایک بلند ٹیلے پر اپنے سفید گھوڑے کی لگام تھامے اپنی سپاہیانہ زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ دیکھ رہا تھا۔ آٹھ دس سوار اپنے سپہ سالار کی حفاظت کے لیے کھڑے نہتوں کو سماج کے بہادروں کی خون آشام تلواروں کے سامنے بدحواس ہو کر بھاگتے اور زخمی ہو کر گرتے اور تڑپتے دیکھ کر اپنے جنگی دیوتاؤں کی شان وار فتح کے نعرے لگا رہے تھے۔ اچانک رام داس سرپٹ گھوڑا دوڑاتا ہوا نمودار ہوا۔ گنگارام کو اس کا میدان سے اس طرح واپس لوٹنا اچھا شگون نظر آیا۔ رام داس نے اس کے قریب پہنچ کر گھوڑا روکا اور کہا:

"مہاراج! سیناپتی مل گئے۔ انہوں نے حکم دیا ہے کہ ہم ان لوگوں کا تعاقب نہ کریں اور قتل و غارت سے اپنے ہاتھ روک لیں۔"

"کونسا سیناپتی یہ حکم دیتا ہے؟ سیناپتی میں ہوں رام داس! تمہارے حواس تو درست ہیں؟"

"میرے حواس درست ہیں مہاراج! میں نے ابھی ابھی سیناپتی سکھدیو کو

دیکھا ہے۔ انہوں نے بڑی سختی سے مجھے حکم دیا ہے کہ ہم ان نہتے لوگوں پر زیادتی نہ کریں۔"

"سکھدیو! وہ یہاں ہے۔ وہ زندہ ہے اور وہ یہ حکم دیتا ہے کہ تم میرا حکم نہ مانو۔ یعنی میرے اور راجہ کے خلاف بغاوت کر دو۔"

"مہاراج! انہوں نے یہ نہیں کہا۔ وہ صرف یہ کہتے ہیں کہ یہ بے گناہ لوگ ہیں۔ انہیں قتل نہیں کرنا چاہیئے۔"

"سکھدیو کہتا ہے کہ یہ لوگ بے گناہ ہیں؟ یہ لوگ جنہوں نے صدیوں سے ہماری حکومت کے خلاف بغاوت کا جھنڈا بلند کر رکھا ہے ــــ کہاں ہے وہ؟"

رام داس نے بستی کی دوسری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "اس طرف آیئے میرے ساتھ۔"

گنگا رام اور اس کے ساتھی گھوڑوں کو سرپٹ دوڑاتے ہوئے رام داس کے پیچھے پیچھے چل دیے۔ گنگا رام کے پہنچنے سے پہلے ہی لشکر کے بہت سے سپاہی سکھدیو کے اس جگہ موجود ہونے کی خبر پا کر اس کے گرد جمع ہو چکے تھے۔

اچھوتوں کا سردار سارن اور اس کے بعض ساتھی یہ محسوس کرتے ہوئے کہ بلا ٹل چکی ہے آہستہ آہستہ آگے بڑھے اور سکھدیو کے قریب پہنچ کر سپاہیوں کے گروہ سے علیحدہ ایک طرف کھڑے ہو گئے۔ سکھدیو نے صرف ایک نظر بوڑھے سردار کے مغموم چہرے اور کنول کی ڈبڈباتی ہوئی آنکھوں کی طرف دیکھا اور ندامت سے سر جھکا لیا۔

ایک نوجوان ایک زخمی بچے کو اٹھائے آگے بڑھا اور اسے سکھدیو کے پاؤں میں لٹا کر اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ سکھدیو نے دیکھا کہ اس ننھے معصوم کے سینے سے خون کا فوارہ چھوٹ رہا ہے اور وہ سہمی ہوئی آنکھوں کے سوا جسم

کے باقی اعضا سے زندگی کے آثار ختم ہو چکے ہیں۔ سکھدیو جانتا تھا کہ اس بچے کی ماں کے علاوہ کئی اور عورتوں، مردوں، بچوں اور بوڑھوں کی نگاہیں اس کی طرف لگی ہوئی ہیں اور ان کی نگاہوں کے سامنے سر اٹھانے کی بجائے اسے اپنی توجہ اس بچے پر مرکوز رکھنا زیادہ آسان نظر آیا وہ اس کے پاس بیٹھ گیا۔ تلوار زمین پر رکھ دی اور بچے کے سر کو اپنے ہاتھ کا سہارا دے کر اوپر اٹھایا اور غور سے اس کی طرف دیکھنے لگا بچے نے ایک گہری سانس لی اور اس کے ساتھ ہی خون کی ایک ہلکی سی دھار منہ سے بہہ نکلی اس کی چمکتی ہوئی خوبصورت آنکھوں میں زندگی کی روشنی کی آخری جھلک آہستہ آہستہ ماند پڑ گئی۔ سکھدیو نے اپنے ہاتھ سے اس کی آنکھیں بند کر دیں اور اس کا سر پھر زمین پر رکھ دیا۔ ایک عورت جگر دوز چیخوں کے ساتھ آگے بڑھی اور اس نے معصوم بچے کی لاش اٹھا کر اپنے سینے کے ساتھ لگا لی۔

سکھدیو اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور سپاہیوں کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ سپاہی جو کئی میدانوں میں سکھدیو کے گھوڑے کو دشمن کی لاشوں پر سے گزرتا ہوا دیکھ چکے تھے ایک اچھوت بچے کی موت پر اسے اس قدر مغموم دیکھ کر حیران رہ گئے۔ بعض اس کی دماغی حالت صحیح ہونے پر بھی شک کر رہے تھے۔

اتنے میں رام داس کے ساتھ گنگا رام اور اس کے ساتھی آ پہنچے۔ گنگا رام قریب پہنچ کر چلایا:

"تم یہاں کھڑے ہو؟ اور یہ بدمعاش اچھوت تمہارے پاس کھڑے ہیں۔ کیا ہو گیا تمہیں بولتے کیوں نہیں؟" یہ کہتا ہوا وہ چند قدم اور آگے بڑھا اور سکھدیو کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

اس کی یہ باتیں سنتے ہی سردار اور اس کے چند ساتھیوں کے سوا باقی تمام لوگ تتر بتر ہو گئے لیکن سکھدیو کی موجودگی میں کسی نے ان کا تعاقب نہ کیا۔

گنگارام نے غصے سے بے قابو ہو کر سکھدیو کی طرف دیکھا اور کہا۔

"سکھدیو! مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ تم ابھی تک زندہ ہو اور ایک سپاہی کی حیثیت میں اس فوج کے پرانے سیناپتی کی تعظیم بھی مجھ پر فرض ہے لیکن اس وقت اس فوج کا سیناپتی میں ہوں۔ تم اس وقت میرے سپاہیوں کو بہکا کر راجہ اور سماج کے خلاف کھلی بغاوت کا ثبوت دے رہے ہو۔ تم خود اپنا فرض پورا نہ کر سکے اور اب ذاتی دشمنی کی بنا پر یہ نہیں چاہتے کہ اس کامیابی کا سہرا میرے سر ہو۔"

سکھدیو نے سپاہیوں کی توقع کے خلاف کچھ کہے بغیر بدنصیب عورت کی گود سے بچے کی لاش چھین لی اور گنگارام کو پیش کرتے ہوئے کہا:

"یہ لو اپنی کامیابی کا تحفہ! اپنی فتح کا سب سے بڑا انعام اپنے ساتھ لے جاؤ اور اس کے خون سے اپنے راجہ اور اپنے سماج کے شاندار کارناموں کی تاریخ لکھو تاکہ تمہاری آنے والی نسلیں یہ نہ کہیں کہ ان کے آباؤ اجداد نیزوں اور تلواروں کے استعمال سے واقف نہ تھے۔"

گنگارام چلایا: "میرا راجہ! میرا سماج! گویا تمہارا ان کے ساتھ کوئی تعلق نہیں اور تم گوشت کے اس ناپاک لوتھڑے کو اٹھا کر ہمارے سامنے اپنا دھرم بھرشٹ کر رہے ہو!"

"یہ معصوم جسم تم سے زیادہ پوتر ہے۔"

گنگارام نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ "سکھدیو! تم چنڈال ہو۔ اس کتیا نے تم پر جادو کر دیا ہے۔"

سکھدیو اپنے سے زیادہ ایک زخم خوردہ ماں کی توہین برداشت نہ کر سکا۔ گنگارام کے ان الفاظ نے اس کی مردہ رگوں میں ایک نئی زندگی اور اس کے منجمد خون میں ایک غیر معمولی حرارت پیدا کر دی۔ اس نے فوراً مڑ کر بچے کی لاش اس کی ماں کے حوالے کی اور جلدی سے تلوار اٹھا کر گنگارام کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ اس نے کہا: "گنگارام! تم بزدل بھی ہو اور کمینے بھی! نیچے اُترو گے یا میں بھی گھوڑے پر سوار ہو جاؤں؟"

گنگارام یہ سنتے ہی گھوڑے سے کود پڑا اور تلوار سونت کر سکھدیو کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ چند افسروں نے مداخلت کی کوشش کی لیکن گنگارام نے کہا: "یہ ہمارا ذاتی معاملہ ہے" سپاہی ادھر ادھر ہٹ کر کھڑے ہو گئے۔

سکھدیو کی زنگ آلود تلوار گنگارام کی چمکتی ہوئی تلوار سے ٹکرانے لگی۔

سپاہیوں کی اکثریت گنگارام سے متنفر تھی لیکن اچھوت بچے کی اپوتر لاش کو ہاتھ لگانے کے بعد انہیں سکھدیو بھی نیک سلوک کا مستحق نظر نہیں آتا تھا۔ بلکہ وہ یہاں تک محسوس کر رہے تھے کہ سکھدیو نے سماج کی جو توہین کی ہے اس کی سزا اسے مل کر رہے گی اور سماج کے دیوتا اسے زک پہنچانے کے لیے گنگارام کی مدد کریں گے۔

کنول اپنے باپ کے قریب کھڑی تھی اور وہ آنکھیں بند کیے انتہائی عجز و انکسار کے ساتھ آسمان اور زمین کی تمام طاقتوں کو سکھدیو کی مدد کے لیے پکار رہی تھی۔

گنگارام کے چند وار روکنے اور ان کا جواب دینے کے بعد سکھدیو نے ایک پُرزور حملہ کر کے گنگارام کو پیچھے دھکیلنا شروع کیا۔ پیچھے ہٹتے وقت گنگارام کا پاؤں گھاس پر سے پھسلا اور وہ سنبھلنے کی کوشش کے باوجود پیٹھ کے بل گر پڑا۔ پیشتر اس کے کہ وہ کھڑا ہونے کی کوشش کرتا۔ سکھدیو کی تلوار کی نوک اس کے سینے پر تھی۔ گنگارام انتہائی بے کسی کی حالت میں اپنے حریف کی طرف دیکھ رہا تھا۔ سکھدیو نے تلوار پیچھے ہٹا لی اور کہا:

اٹھیئے سینا پتی جی! میری تلوار گرے ہوئے دشمن پر وار کرنے کی عادی نہیں ہے۔"

گنگارام پر ان الفاظ نے جادو کا سا اثر کیا۔ اس نے اٹھ کر سنبھلتے ہی زندگی اور موت سے بے پرواہ ہو کر سکھدیو پر پے در پے وار شروع کر دیئے۔ سکھدیو نے چند وار اپنی تلوار پر روکنے کے بعد پھر ایک زوردار حملہ کیا لیکن اس دفعہ اس کی تلوار پوری طاقت کے ساتھ گنگارام کی ڈھال کے ساتھ ٹکرائی اور اس کا تقریباً نصف حصہ ٹوٹ کر نیچے آ گرا۔ گنگارام نے بہادروں کی رسومات جنگ کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے اس موقعہ سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کی کوشش کی اور سکھدیو پر پہلے کی نسبت زیادہ تندی اور تیزی سے وار کرنے لگا۔ تلوار کے بچے کھچے حصے کے ساتھ سکھدیو اب صرف گنگارام کے وار روکنے اور ادھر ادھر ہٹ کر اپنا بچاؤ کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ اس حالت میں سکھدیو کے بازو پر چند معمولی سے زخم آ گئے۔ رام داس نے جب اس کے بازو سے خون بہتا دیکھا تو سکھدیو کے ساتھ پرانی محبت نے جوش مارا اور اس نے تلوار کھینچ لی لیکن اس کے میدان میں آنے سے پہلے ساون بھاگتا ہوا آگے بڑھا اور دونوں ہاتھ بلند کر کے "ٹھہرو! ٹھہرو!!" کہتا ہوا سکھدیو اور گنگارام کے درمیان حائل ہو گیا۔ چشمِ زدن میں گنگارام کی تلوار سردار کی کھوپڑی کو چیرتی ہوئی سینے تک نکل گئی اور وہ لڑکھڑا کر زمین پر گر پڑا۔ زخم کی شدت نے اسے زیادہ دیر تڑپنے بھی نہ دیا۔ سکھدیو نے ٹوٹی ہوئی تلوار زمین پر پھینک دی اور جھک کر بوڑھے سردار کا دایاں ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں سے اٹھایا اور اس پر اپنی پیشانی رکھتے ہوئے کہا:

"میرے محسن! میرے پتا! تم ہمارے درمیان کیوں کود پڑے؟"

سکھدیو کے ان الفاظ نے سپاہیوں کو اور بھی بددل کر دیا اور وہ حیرت

واستعجاب کے عالم میں ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ گنگارام جو بدستور اپنے ہاتھ میں تلوار لیے کھڑا تھا بولا:

"اس پر دیوتاؤں کی لعنت ہو۔ یہ ایک اچھوت کو پتا جی کہتا ہے۔ سپاہیو! یہ سماج کا باغی ہے اسے گرفتار کر لو!"

سپاہی گنگارام کا یہ حکم سن کر پھر ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔
گنگارام نے پھر گرج کر کہا "تم کیا دیکھ رہے ہو گرفتار کیوں نہیں کرتے اسے؟"
یہ کہتے ہوئے گنگارام نے اپنے چند خاص آدمیوں کو اشارہ کیا اور وہ آگے بڑھ کر سکھدیو کے ہاتھ ایک مضبوط رسی سے باندھنے لگے۔ سکھدیو نے ان کی توقع کے خلاف کوئی مزاحمت نہ کی۔ گنگارام کے تیور دیکھ کر رام داس بھی اپنی جگہ پر خاموش کھڑا رہا۔

کنول، جس پر اس کے باپ کی موت نے تھوڑی دیر کے لیے سکتہ طاری کر دیا تھا اچانک آگے بڑھی۔ اس نے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ سکھدیو کی ٹوٹی ہوئی تلوار زمین پر سے اٹھائی اور گنگارام پر حملہ کر دیا۔ ایک سپاہی نے عین موقع پر خبردار ہو کر اپنی تلوار آگے بڑھا دی اور کنول کا وار روکنے کی کوشش کی لیکن وہ پوری طرح کامیاب نہ ہو سکا اور گنگارام کے بازو پر زخم آ گیا۔ دوسرے سپاہی نے جھپٹ کر کنول کے ہاتھ سے تلوار چھین لی۔

سکھدیو کی تمام توجہ سردار کی لاش کی طرف تھی۔ جب اس نے اچانک نگاہ اوپر اٹھائی۔ کنول دو سپاہیوں کی گرفت میں جدوجہد کر رہی تھی۔ سکھدیو کے منہ سے بے اختیار "کنول" کا لفظ نکل گیا اس کے ساتھ ہی اس نے گنگارام کی طرف دیکھا اور کہا: "اس دیوی کو چھوڑ دو اور مجھے جہاں تمہارا جی چاہے لے چلو۔"

گنگارام نے جواب دیا [illegible]

اور یہ میری مجرم ہے اس کا فیصلہ میری مرضی سے ہوگا۔"

"تمہاری مجرم؟"

گنگارام نے اپنے بازو کا زخم دکھاتے ہوئے کہا۔ "ہاں یہ دیکھو لیکن معلوم ہوتا ہے کہ میرے مجرم کے ساتھ تمہیں بھی گہری دلچسپی ہے اور تم اس کا نام بھی جانتے ہو اور شاید اسی کا دل خوش کرنے کے لیے اس ذلیل کتے کو پتاجی کہہ رہے تھے۔"

سکھدیو کی غیرت نے پھر ایک بار جوش مارا اور اس نے سپاہیوں کو ادھر ادھر دھکیل کر اپنے ہاتھوں کو رسیوں کی گرفت سے آزاد کرنے کی کوشش کی لیکن گنگارام نے تلوار کی نوک کنول کے سینے کی طرف کرتے ہوئے کہا۔ "اگر تم نے معمولی سی حرکت بھی کی تو تمہاری کنول کی خیر نہیں۔" سکھدیو اس دھمکی کے سامنے بے بس ہو کر رہ گیا۔

---

(۲۳)

اگلے دن تین کشتیاں دریائے بیاس عبور کر رہی تھیں ایک کشتی میں گنگارام، رام داس اور فوج کے چند سپاہی تھے۔ دوسری کشتی میں سکھدیو اور کنول کے علاوہ چند پہرے دار تھے اور تیسری کشتی میں چند گھوڑے تھے۔ سماج کے باغیوں کے سردار کے قتل کے بعد گنگارام کو اس بات کا پورا پورا یقین تھا۔ کہ وہ دوبارہ منظم صورت میں واپس ہو کر مزاحمت نہیں کریں گے۔ تاہم اس نے احتیاطاً چند افسروں اور سپاہیوں کے سوا باقی فوج کو وہیں چھوڑا اور اس کی کمان اپنے بھائی جے رام کے سپرد کر دی۔ فوج کے بعض افسر اس کے واپس جانے پر خوش نہ تھے لیکن گنگارام کی یہ فتح سکھدیو پر آخری فتح کے مقابلے میں ہیچ نظر آتی تھی۔ وہ راجہ کو اپنی زبان فتح کی خوش خبری سنانا چاہتا تھا اور اپنی آنکھوں سے راجہ کے دربار میں اس شخص

کو ذلیل ہوتا دیکھنے کے لیے بے قرار تھا جو پروہت کے برابر بیٹھا کرتا تھا اور جس کی موجودگی میں وہ راجہ کے دربار میں صرف فوج کے ایک معمولی افسر کی حیثیت سے دیکھا جاتا تھا۔ دربار میں سکھدیو کا مقدمہ پیش کرنے کے لیے اسے فوج کے کسی افسر یا سپاہی پر اعتبار نہ تھا۔

کشتیاں دریائے بیاس کے شفاف پانی کی ہلکی ہلکی لہروں پر رقص کرتی ہوئی کنارے کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ سکھدیو اور کنول ایک دوسرے کے قریب کھڑے دوسرے کنارے کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہے تھے۔

سکھدیو نے ایک ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کنول کی طرف دیکھا اور کہا "کنول! یہ سب کچھ میری وجہ سے ہوا لیکن میں سچ کہتا ہوں کہ مجھے اپنے پتا کی موت کا اتنا غم نہ تھا، جتنا تمہارے پتا کی موت کا ہے۔"

اس کے جواب میں کنول کی خوبصورت آنکھوں سے آنسوؤں کے موٹے موٹے قطرے ابل پڑے۔ دونوں کچھ دیر ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے اچانک کنول کے دل میں ایک خیال آیا اور وہ بولی: "میں آپ سے ایک بات پوچھنا چاہتی ہوں۔"

سکھدیو نے پوچھا: "کیا؟"

کنول نے کہا "آپ نے یہ کیوں کہا تھا کہ اسے چھوڑ دو اور مجھے جہاں بھی چاہے لے جاؤ۔ کیا آپ یہ خیال کرتے ہیں کہ ایک اچھوت لڑکی مصیبت کے وقت آپ کا ساتھ دینے کے قابل نہیں؟"

"میرے لیے تم اچھوت نہیں کنول! لیکن خود کو ڈوبتا دیکھ کر میں تمہیں اپنے ساتھ طوفان کی مہیب لہروں کی طرف گھسیٹنا نہیں چاہتا۔ میں تمہاری جان کی قیمت ہزاروں جانوں سے زیادہ سمجھتا ہوں۔"

کنول نے پھر اسی مغموم لہجے میں کہا۔ "آپ کو شاید یہ معلوم نہیں کہ میں آپ کے ساتھ مرنے کو آپ سے جدا ہو کر زندہ رہنے پر ہزار بار ترجیح دیتی ہوں۔"

کشتیاں کنارے پر آلگیں۔ سکھدیو اور کنول سپاہیوں کی حراست میں کشتی سے اترے۔

گنگا رام نے کہا: "سکھدیو! میں یہ نہیں چاہتا کہ تمہیں راجہ کے دربار میں ایک عام قیدی کی طرح رسیوں میں جکڑ کر لے جاؤں۔ یہ صرف تمہاری توہین نہیں بلکہ سماج کی توہین ہوگی۔ اس لیے اگر تم وعدہ کرو کہ بھاگنے کی کوشش نہیں کرو گے تو میں تمہارے ہاتھ پاؤں ابھی کھلوا دیتا ہوں اور تمہیں تمہاری شان کے شایاں گھوڑا بھی دیا جائے گا۔"

سکھدیو نے جواب دیا: "یہ وعدہ میں اس صورت میں کر سکتا ہوں کہ تم اس لڑکی کے ہاتھ بھی کھلوا دو اور اسے بھی سواری دینے کا وعدہ کرو۔"

"تمہاری پہلی شرط مجھے منظور ہے۔ اس لڑکی کی رسیاں کھول دی جائیں گی لیکن اچھوت لڑکی کو راجہ کی فوج کا گھوڑا نہیں دیا جا سکتا۔ تمہاری نظروں میں اس لڑکی کی عزت کتنی ہی کیوں نہ ہو لیکن ہم ایک اچھوت کو اچھوت سے بڑا درجہ نہیں دے سکتے۔"

سکھدیو نے کہا: "اس صورت میں مجھے یہ اجازت دیجیے کہ میں اپنا گھوڑا اسے پیش کر سکوں۔"

"میں یہ بھی اجازت نہیں دے سکتا۔"

"تو میں پیدل چلوں گا۔"

"بہت اچھا۔ تو آپ وعدہ کرتے ہیں کہ آپ بھاگنے کی کوشش نہیں کریں گے؟"

"میں وعدہ کرتا ہوں۔"

"اچھا تو میں آپ کے ہاتھ کھلوائے دیتا ہوں۔" گنگا رام نے سپاہیوں کی طرف اشارہ کیا اور انہوں نے سکھدیو اور کنول کے ہاتھ کھول دیئے۔

تھوڑی دیر بعد یہ مختصر سا قافلہ دریائے بیاس کے جنوب میں ایک زرخیز میدان سے گزر رہا تھا۔ چند کوس چلنے کے بعد سکھدیو نے کنول سے کہا: "تم تھک گئی ہو گی؟"

کنول نے جواب دیا: "نہیں آپ کے ساتھ چلتے ہوئے مجھے تھکاوٹ محسوس نہیں ہوتی۔"

دوپہر کے وقت یہ قافلہ ایک چھوٹے سے شہر میں پہنچا۔ رام داس کے اصرار پر وہاں سے کنول کے لیے ایک بیل گاڑی مہیا کی گئی اور سکھدیو کو گھوڑے پر سوار ہونے کے لیے رضامند کر لیا گیا۔

شام کے وقت یہ لوگ اپنی منزل مقصود پر پہنچ گئے۔ رات کے وقت شاہی محلات سے لے کر عوام کے جھونپڑوں تک ہر گھر میں گنگا رام کی شاندار فتح اور باغیوں کے سردار کی خوبصورت لڑکی کے ساتھ سکھدیو کے عشق کا چرچا ہو رہا تھا۔ راجہ اور پرجا کو گنگا رام کی فتح کی خوشی سے زیادہ سکھدیو کے حسرتناک انجام کا افسوس تھا۔

پروہت کے اصرار پر راجہ نے سکھدیو اور کنول کو رات بھر قید میں رکھنے کا حکم دے دیا۔

(۴)

اگلے دن سکھدیو راجہ کے دربار میں سر جھکائے کھڑا تھا وہ اپنے خیال کے مطابق خود کو بے گناہ ثابت کر چکا تھا۔ وہ بار بار کہہ چکا تھا کہ انسان کے دماغ سے نکلا ہُوا قانون جس نے کروڑوں انسانوں کے فطری حقوق سلب کر رکھے ہوں۔ مذہب کہلانے کا مستحق نہیں۔ لیکن اس کی قسمت کا فیصلہ کرنے والوں کے نزدیک اس کے خیالات باغیانہ تھے۔ اس نے گنگا رام کے الزامات کی تردید میں ایک لفظ تک نہ کہا اور سارا وقت سماج کے ان دشمنوں کی وکالت کرتا رہا جن کے متعلق سماج کے قانون میں رحم کی کوئی گنجائش نہ تھی۔

راجہ کو ایک طرف سکھدیو اور اس کے آباؤ اجداد کی خدمات کا لحاظ اور دوسری طرف پروہت اور برہمنوں کے بگڑ جانے کا خوف تھا۔ وہ یہ چاہتا تھا کہ دیوتا بھی ناراض نہ ہوں اور سکھدیو کی جان بھی بچ جائے لیکن سکھدیو اپنی تباہی کا سامان خود پیدا کر رہا تھا۔ اس کا یہ کہنا کہ ایک برہمن اور ایک عام انسان میں کوئی فرق نہیں۔ ایسی بات تھی جسے سن کر درباریوں کی اکثریت اس کے خلاف ہو گئی تھی اور وہ اپنے یہ الفاظ واپس لینے کی بجائے ان کی تائید میں کئی ایسے دلائل پیش کر چکا تھا جس سے اس کے بہترین دوستوں کو بھی یہ شبہ ہو گیا تھا کہ سکھدیو ایک اچھوت لڑکی پر فریفتہ ہو کر اپنا دماغی توازن کھو بیٹھا ہے۔

راجہ بعض اوقات سکھدیو کی باتوں سے متاثر ہو کر اس کے حق میں کچھ کہنے کا ارادہ کرتا لیکن پروہت کے تیور دیکھ کر اسے حوصلہ نہ پڑتا۔

سکھدیو کو بھی معلوم تھا کہ اس معاملہ میں پروہت کے سامنے راجہ بے بس ہے اور مقدمہ کا فیصلہ سناتے وقت اس کے منہ سے وہی الفاظ نکلیں گے۔ جو

پروہت کے سفاک چہرے پر نقش تھے۔ راجہ کے متعلق وہ جانتا تھا کہ وہ فطرتاً بے رحم نہیں لیکن پروہت کے متعلق اسے یقین تھا کہ اس کا دل پتھر کی مورتیوں سے بھی زیادہ سخت ہے۔

دوپہر تک راجہ کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔ پروہت کو خیال پیدا ہُوا کہ شاید راجہ سکھدیو سے ذاتی ہمدردی کی بنا پر اسے سزا دینے سے کتراتا ہے۔ اس نے کہا:

"مہاراج! مجرم جو کچھ کہہ سکتا تھا کہہ چکا اب صرف یہ دیکھنا ہے کہ اس کا جرم قابلِ سزا ہے یا نہیں اور اس بات کا فیصلہ ہماری مرضی سے نہیں ہو گا بلکہ ہمیں یہ دیکھنا پڑے گا کہ سماج کا قانون ایسے مجرم کے لیے کیا سزا تجویز کرتا ہے راجہ کی عدالت میں ہر مجرم کو یہ موقع مل سکتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو بے گناہ ثابت کرے لیکن یہ اجازت نہیں دی جا سکتی کہ وہ اپنے گناہوں کو جائز ثابت کرے۔ مہاراج! یہ ثابت ہو چکا ہے کہ مجرم نے ایک طرف تو ایک نیچ ذات لڑکی کے ساتھ پریم کر کے ہندو دھرم کو ذلیل کیا اور دوسرے حکومت کے باغیوں کی حمایت میں مہاراج کے سیناپتی کے ساتھ لڑائی کی۔ مہاراج! مجھے ڈر ہے کہ اگر اس شخص کے ساتھ ذرہ برابر بھی رعایت کی گئی تو اس قسم کے ہزاروں من چلے نوجوان سماج کے مقابلے کے لیے تیار ہو جائیں گے۔"

راجہ، پروہت کے فیصلہ کن الفاظ سُن کر دیر تک سر جھکائے بیٹھا رہا۔ بالآخر اس نے کہا: "مقدمے کا فیصلہ آج شام کو سنایا جائے گا۔ مجرم کو قید خانہ میں لے جاؤ۔"

سپاہی سکھدیو کو قید خانے کی طرف لے گئے۔ راجہ نے پروہت۔ گنگا رام اور چند اور درباریوں کے سوا باقی سب کو رخصت کیا اور ان کے ساتھ مقدمے کے فیصلے کے متعلق مشورہ کرنے لگا۔

(۵)

شام کے وقت شاہی محل سے باہر عورتوں اور مردوں کا بے پناہ ہجوم تھا۔ سکھدیو ننگی تلواروں کے پہرے میں لوگوں کے ہجوم میں سے گزرتا ہوا شاہی دربار میں داخل ہوا۔ سب سے پہلے اس کی نگاہ راجہ پر پڑی۔ راجہ نے اس کی نگاہ کی تاب نہ لا کر پروہت کی طرف دیکھا اور گردن جھکا لی۔ سکھدیو نے راجہ کے دوسرے مشیروں کی طرف دیکھا اور وہ بھی پروہت کی طرف دیکھنے لگے۔

گنگارام اور پروہت کے سوا باقی سب کے دل دھڑک رہے تھے پروہت نے کہا۔ مہاراج! ملزم مقدمے کا فیصلہ سننے کے لیے منتظر کھڑا ہے۔"

راجہ نے چونک کر پروہت کی طرف دیکھا اور کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد نہایت مغموم لہجے میں جواب دیا: "مقدمے کا فیصلہ آپ سنا دیں" اور پھر اسی طرح آنکھیں نیچی کر لیں۔

پروہت نے سکھدیو کی طرف دیکھا اور کہا: "سکھدیو! مہاراج نے اپنی شاہانہ فیاضی سے کام لیتے ہوئے تمہارے بغاوت کے جرم کو معاف کر دیا ہے لیکن مجھے افسوس ہے کہ سماج کی توہین کے جرم میں تمہیں موت کی سزا دی جاتی ہے۔ کل کالی دیوی کے مندر میں تمہارا بلیدان دیا جائے گا۔"

موت کا حکم سننے کے بعد سکھدیو نے پھر ایک بار حاضرینِ دربار کی طرف دیکھا کسی نے اس کے ساتھ آنکھیں ملانے کی جرأت نہ کی۔ اس کے دل کی گہرائیوں سے یہ آواز اٹھی کہ تو مجرم نہیں۔ مجرم یہ لوگ ہیں جن کی گردنیں ندامت کے بوجھ سے جھکی ہوئی ہیں تو ان بدنصیب لوگوں میں سے نہیں جو دنیا میں کوئی نقش چھوڑے بغیر فنا ہو جاتے ہیں۔ تمہارے خون کے چھینٹوں سے باغِ ہستی

کے ہزاروں مرجھائے ہوئے پودے پھلیں پھولیں گے۔

ضمیر کی اس آواز نے سکھدیو کے لبوں پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ پیدا کر دی لیکن اچانک اسے کنول کا خیال آیا اور یہ مسکراہٹ فنا ہو گئی۔ اسی دل کی دوسری آواز یہ تھی کہ بے شک تیری قربانی ایک بہت بڑی قربانی ہے لیکن تو اپنے بعد اس دنیا میں ایک سرسبز پودا بادِ سموم کے جھونکوں میں چھوڑ کر جا رہا ہے۔

سکھدیو کو اس دنیا میں کنول کی بے کسی اپنی بے کسی نظر آنے لگی۔ یہ جاننے کے باوجود کہ اس کی یہ التجا ٹھکرا دی جائے گی۔ وہ بے اختیار ہو کر آگے بڑھا اور راجہ کے قدموں میں گر پڑا۔

"مہاراج!" اس نے کہا: "میں نے جو کچھ کیا درست سمجھ کر کیا لیکن اگر آپ اسے میرا گناہ سمجھ کر میرے لیے موت کی سزا تجویز کرتے ہیں تو میں خوشی سے جان دینے کے لیے تیار ہوں لیکن وہ مظلوم لڑکی بے گناہ ہے اس کا قصور اس کے سوا اور کوئی نہیں کہ وہ اپنے باپ کی موت کو خاموشی سے برداشت نہ کر سکی۔ مہاراج! اگر میرے باپ دادا کی گزشتہ خدمات آپ پر تھوڑا بہت حق رکھتی ہیں تو اس لڑکی کو معاف کر دیجئے اور اسے عزت کے ساتھ اس کی قوم کے لوگوں میں پہنچا دیجئے۔"

سکھدیو اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکا وہ آنسو پونچھتا ہوا اٹھا اور راجہ کے چہرے پر اپنی درخواست کا اثر دیکھنے لگا۔ راجہ نے ملتجی سا ہو کر پروہت کی طرف دیکھا لیکن اس نے منہ پھیر لیا۔ راجہ کی قوتِ برداشت جواب دے چکی تھی وہ اچانک اٹھ کھڑا ہوا اور مسند سے اتر کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

سکھدیو نے پروہت کی طرف دیکھا اور کہا: "میں آپ سے رحم کی درخواست نہیں کرتا۔ صرف اتنا پوچھتا ہوں کہ آپ نے اس لڑکی کے لیے کیا سزا تجویز کی ہے؟"

پروہت نے کہا: "میں تمہیں یہ بتا کر تمہاری تکلیف میں اضافہ نہیں کرنا چاہتا

لیکن اگر تم پوچھنا ہی چاہتے ہو تو سنو! وہ مکار لڑکی سماج کے ایک ہونہار بیٹے کو اپنے دام میں پھنسا کر اسے بھرشٹ کرنے، اس کی آتما کا ستیا ناس کرنے اور اسے سماج کے خلاف بغاوت کے لیے اکسانے کی مجرم ہے۔ تمہارے دل میں اس کے لیے کتنی ہی محبت کیوں نہ ہو۔ سماج کا قانون اسے قابلِ معافی نہیں سمجھتا۔ مہاراج اس لڑکی کی سزا تجویز کر چکے ہیں۔ اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر تمہاری جلتی ہوئی چتا میں پھینک دیا جائے گا۔

پروہت کے ان الفاظ سے سکھدیو کے جسم کا رواں رواں غصے سے لرزنے لگا۔ اُس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا: "ذلیل انسان! کاش تمہیں بھی میری طرح کوئی دھرم لوٹنے اور آتما کا ستیا ناس کرنے والا مل جاتا اور شاید تم بھی ایک وحشی درندے سے انسان بن جاتے۔"

پروہت کی یہ توہین سماج کے بیٹوں کی توقع کے خلاف تھی۔ وہ تمام غصے سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ گنگا رام نے سپاہیوں کی طرف اشارہ کیا اور وہ سکھدیو کے بازو پکڑ کر دربار سے باہر لے گئے۔

شاہی محل کے بیرونی دروازے پر سکھدیو کا پرانا رفیق رام داس کھڑا تھا اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ سکھدیو نے اس کی طرف ایک نظر دیکھا اور آنکھیں پھیر لیں۔

آخری سہارا

رات کے وقت قید خانے کی تنہائی میں سکھدیو کے لیے ہر لمحہ ہفتوں اور مہینوں سے زیادہ طویل تھا۔ زندگی کی روشنی اپنی تمام رنگینیوں کے ساتھ اس کی آنکھوں سے اوجھل ہو رہی تھی اور موت کے اندھیرے اس کے دل و دماغ پر قبضہ جما رہے تھے۔ رات کے سیاہ پردوں میں اسے کالی دیوی کی مہیب تصویر رقص کرتی ہوئی دکھائی دی۔ اس نے گھبرا کر آنکھیں بند کر لیں لیکن یہ بھیانک اندھیرے موت کے مہیب قہقہوں میں تبدیل ہو کر اس کے کانوں میں گونجنے لگے اس کا دم گھٹ رہا تھا اور وہ دیوانوں کی طرح چلّانا چاہتا تھا لیکن یہ کیفیت دیر تک نہ رہی اسے کنول کا خیال آیا اور اس ظلمت کدہ میں ہزاروں مشعلیں روشن ہو گئیں وہ تصور میں وہ منظر دیکھنے لگا جب کنول اس سے جدا ہو کر قید خانے کی ایک علیحدہ کوٹھڑی کی طرف جاتے ہوئے اپنی آنکھوں میں چھلکتے ہوئے آنسوؤں کو چھپانے اور چہرے پر مسکراہٹ پیدا کرنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔

خیالات کی زنجیر اسے جدائی کے آخری منظر سے ملاقات کے ابتدائی مناظر کی طرف لے گئی۔ گزشتہ واقعات کے باہمی ربط نے اسے پھر ایک بار سوچنے پر مجبور کر دیا کہ وہ کشتی کے ڈوب جانے کے بعد زندہ بچ کر کنول کے گھر تک پہنچنے سے اب تک کسی زبردست اور نامعلوم طاقت کے ہاتھوں کھیلتا رہا ہے وہ اپنی مرضی سے بے ہوش ہو کر اچھوتوں کے گھر نہیں پہنچا تھا اسے اپنے ارادے

نے نہیں بلکہ کسی اور کی خواہش نے آم کھانے پر مجبور کر دیا تھا وہ کون تھا جس
نے دریا میں آم پھینکتے وقت اس کے ہاتھ روک لیے تھے۔ وہ کون تھا جس
نے آدھی رات کے وقت کنول کو آم دے کر بھیجا تھا جس نے اس کے ارادے
کے خلاف اس کے من کے مندر سے دیوتاؤں کی تصویریں اٹھا کر ان کی جگہ
ایک اچھوت لڑکی کی تصویر رکھ دی تھی وہ کون تھا جس نے دیوتاؤں کے
ہوتے ایک نیچی ذات کی لڑکی کو اس کے دل پر قبضہ جمانے کے تمام طریقے سکھا
دیئے تھے؟"

ان سوالات پر بار بار غور کرنے سے سکھدیو کا یہ خیال یقین کی حد تک پہنچنے
لگا کہ کوئی زبردست اور نامعلوم طاقت آج تک اس کے ہر نئے اقدام پر اس کی
راہنمائی کرتی رہی ہے اس کے ساتھ ہی اس کے دل میں یہ خیال بھی پیدا ہونے لگا
کہ شاید وہ زبردست طاقت یہ پسند نہ کرے کہ اس کھیل کا آخری منظر اس کی اور اس
کے بعد کنول کی حسرت ناک موت ہو۔ بے کسی اور مایوسی کے بوجھ کے نیچے دبے
ہوئے دل نے اس زبردست طاقت کو اپنا آخری سہارا بنا لینے کی تائید کی سکھدیو
نے منہ کے بل زمین پر گر کر انتہائی عاجزی اور انکساری کے ساتھ یہ کہنا شروع کیا

"اے دیوتا!.... اے دیوتاؤں کے دیوتا....!"

وہ یہاں تک کہہ کر رک گیا اس زبردست طاقت کا جو تصور اس کے دماغ
میں موجود تھا دیوتا کے لفظ میں نہیں سما سکتا تھا۔ اس طاقت کی صفات میں اسے
دیوتا کی ہیئت کو داخل کرنا نامناسب معلوم ہوا اس نے کچھ دیر سوچنے کے بعد
اپنی دعا ان الفاظ میں شروع کی:

"اے مظلوموں اور بے گناہوں کی حمایت کرنے والی زبردست اور انصاف پسند
طاقت! میں نے جو کچھ کیا تیرے اشاروں پر کیا۔ اس وقت تو ہی میرا سہارا ہو سکتی ہے

اگر تو ہے تو میں تجھے مدد کے لیے پکارتا ہوں۔ اگر میں سماج کے انصاف کا حقدار
نہیں تو تیرے رحم کا حق دار ضرور ہوں۔ اگر دیوتاؤں کی طرح تیرا انصاف بھی مجھے
قصوروار ٹھہراتا ہے تو میں خوشی کے ساتھ جان دینے کے لیے تیار ہوں لیکن
ایک بے گناہ لڑکی کا دردناک انجام مجھے تیرا انصاف نظر نہیں آتا۔ نہیں! تو ایسا
نہیں ہو سکتا۔ کاش تیرے کانوں تک میری آواز پہنچ جائے! اے زبردست طاقت
اس وقت تو کہاں ہے؟"

---

(۲)

سکھدیو نے ابھی سر اٹھایا تھا کہ باہر پہریداروں کی چیخ پکار سنائی دی
وہ چونک کر اٹھا اور اپنی تاریک کوٹھڑی کے دروازہ کے ساتھ کان لگا کر سننے
لگا۔ تلواروں کی جھنکار سے اس نے اندازہ لگایا کہ باہر پہریداروں پر کسی نے حملہ
کر دیا ہے۔ تھوڑی دیر میں یہ چیخ پکار زخمیوں کے کراہنے تک محدود ہو کر رہ گئی۔
اور سکھدیو نے پاؤں کی آہٹ سے محسوس کیا کہ چند آدمی اس کی کوٹھڑی کی طرف
آ رہے ہیں۔ اس کا دل دھڑکنے لگا۔ باہر سے آنے والے دروازے کو اندر کی
طرف دھکیلنے لگے۔ چند دھکوں کے ساتھ دروازہ ایک سخت دھماکے کے ساتھ
کھلا۔ سکھدیو جست لگا کر باہر نکلا اور اس نے دیکھا کہ پندرہ بیس آدمی ننگی تلواریں
لیے کھڑے ہیں۔ چہروں پر نقاب ہونے کی وجہ سے وہ کسی کو پہچان نہ سکا۔ ایک
شخص نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا "آئیے میرے ساتھ جلدی کیجئے!
ایک پہریدار ہم سے بچ کر بھاگ گیا ہے۔ تھوڑی دیر میں دوسرے سپاہی آ جائیں گے۔"
سکھدیو اس کی آواز پہچان کر بولا۔ "رام داس! تم؟"

رام داس نے کہا "باتوں کا وقت نہیں۔ آیئے میرے ساتھ!"
سکھدیو نے رام داس کے ساتھ دو تین قدم اٹھائے۔ لیکن پھر رک کر کھڑا ہو گیا۔

رام داس نے برہم ہو کر کہا "چلتے کیوں نہیں آپ! سپاہی ابھی آجائیں گے۔ جلدی کیجئے آپ کے لیے گھوڑا تیار کھڑا ہے۔"

سکھدیو نے غمگین لہجے میں جواب دیا۔ "رام داس! مجھ سے زیادہ وہ مظلوم لڑکی تمہارے رحم کی حق دار تھی۔ اگر تم نے میرے لیے اپنی جان خطرے میں ڈالنے کی جرأت کی ہے تو مجھ سے یہ توقع نہ رکھو کہ میں اسے خطرے میں چھوڑ کر بھاگ جاؤں گا۔"

رام داس نے کہا۔ "وہ شاید اس کوٹھڑی میں ہے آیئے جلدی کریں۔"

سکھدیو، رام داس اور اس کے ساتھی پہرہ داروں کی لاشوں پر سے گزرتے ہوئے ایک کوٹھڑی کی طرف بڑھے اور ایک زبردست دھکے کے ساتھ دروازہ توڑ ڈالا ——— کنول پہلے ہی تمام واقعات کا اندازہ لگا چکی تھی۔ سکھدیو کی آواز بھی اس کے کانوں تک پہنچ چکی تھی وہ دروازہ ٹوٹتے ہی باہر کی طرف لپکی۔ سماج کے چوبد بھاگتے ہوئے قید خانے کی حدود سے باہر نکل آئے۔

ایک شخص آم کے ایک درخت کے نیچے گھوڑا لیے کھڑا تھا۔ رام داس نے کہا "جلدی کیجئے! شاید بھاگنے والے پہریدار نے فوج کو خبردار کر دیا ہے۔ سنیئے! قلعے کی طرف سے آوازیں آ رہی ہیں۔"

سکھدیو جلدی سے گھوڑے پر سوار ہوا اور کنول کو اپنے بازو کا سہارا دے کر پیچھے بٹھا لیا۔

رام داس نے سکھدیو کو اپنی تلوار، کمان اور ترکش پیش کرتے ہوئے کہا۔

"لیجئے! شاید آپ کو ان کی ضرورت پڑے۔ وہ آپ کے تعاقب میں آتے ہی ہوں گے۔ آپ جنگل کا رُخ کریں وہ غالباً دریا کی طرف توجہ کریں گے۔"

سکھدیو نے گھوڑے کو ایڑ لگائی۔ کنول اس کی کمر کے ساتھ لپٹ گئی۔ گھوڑا ایک دو جست لگانے کے بعد رات کے سیاہ پردوں میں غائب ہو گیا۔

رام داس سپاہیوں کو ادھر ادھر فرار ہونے کا حکم دے کر دیر تک وہاں کھڑا گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز سنتا رہا۔ یہ آواز بتدریج کم ہوتی ہوتی ختم ہو گئی اور قلعے کی طرف سے آنے والی آوازیں صاف طور پر سنائی دینے لگیں۔

---

(۳)

رام داس کا یہ قیاس کہ جان بچا کر بھاگنے والا سپاہی فوج کو خبردار کر چکا ہوگا صحیح نکلا لیکن اس کا یہ خیال غلط ثابت ہوا کہ سماج کے سپاہی سکھدیو کے تعاقب کے لیے صرف دریا کا رُخ کریں گے۔ گنگا رام نے اس واقعہ سے باخبر ہوتے ہی شہر کے چاروں طرف سوار دوڑا دیئے اور خود ایک دستے کے ساتھ جنگل کا رُخ کیا۔

سکھدیو ابھی شہر سے تین کوس دور نہ گیا تھا کہ اسے پیچھے سے گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز سنائی دی۔ ایک کوس اور طے کرنے کے بعد وہ گھنے جنگل میں پہنچ چکا تھا لیکن تعاقب میں آنے والے سوار بہت قریب آ چکے تھے۔ سکھدیو نے بھاگتے ہوئے تعاقب کرنے والوں کے تیروں کا شکار ہونے کی بجائے گھنے جنگل اور رات کی تاریکی سے فائدہ اٹھانا بہتر خیال کیا۔

اس نے گھنی جھاڑیوں میں گھوڑا روکا اور نیچے کود کر کنول کو اترنے کے لیے سہارا

دیا اور لگام اس کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے اسے خاموش کھڑی رہنے کی ہدایت کی۔
گنگارام نے گھنے اور تاریک جنگل میں سکھدیو کا کوئی سراغ نہ پاکر سواروں کو گھوڑے روکنے کا حکم دیا۔

سکھدیو تاریکی میں گنگارام کے ساتھیوں کی تعداد کا صحیح اندازہ نہ لگا سکا تاہم اس کے خیال کے مطابق ان کی تعداد پندرہ سے زیادہ اور بیس سے کم تھی

تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد گنگارام کی آواز آئی: "میرا خیال ہے کہ اگر وہ اس طرف آیا ہے تو زیادہ دور نہیں گیا ہوگا۔ آگے جنگل اس قدر گھنا ہے کہ اندھیری رات میں گھوڑا بھگانا آسان نہیں وہ کہیں ادھر ادھر چھپ کر صبح کا انتظار کرے گا صبح تک ہمیں بھی اس کو اسی علاقہ میں تلاش کرنا چاہیئے۔ دن کی روشنی میں ہم اس کا کھوج نکال لیں گے۔"

گنگارام کی آواز پہچان کر سکھدیو کا خون کھولنے لگا۔

گنگارام پھر بولا: "ہمیں یہاں سے دو دو تین تین آدمیوں کی ٹولیوں میں تقسیم ہو کر اس علاقے کو صبح تک اچھی طرح دیکھ لینا چاہیئے۔"

ایک سپاہی بولا: "لیکن مہاراج! ہمیں یہ بھی خیال رکھنا چاہیئے کہ سکھدیو اکیلا نہیں۔ شاید وہ لوگ جو پندرہ بیس پہرہ داروں کو قتل کرکے اسے نکال لائے ہیں اس کے ساتھ ہوں اور وہ دو تین آدمیوں کے سامنے ہتھیار ڈال دینا پسند نہ کریں۔ مجھے تو یہ بھی خطرہ ہے کہ وہ ادھر اُدھر چھپ کر ہمارا انتظار کر رہے ہوں۔"

گنگارام نے جواب دیا: "بزدل نہ ہو۔ بھاگنے والے مقابلہ نہیں کیا کرتے تھوڑی دیر میں ہماری پیادہ فوج پہنچ جائے گی۔ اس وقت ہمیں صرف یہ معلوم کرنا ہے کہ وہ اس جنگل میں ہیں یا نہیں۔"

گنگارام کی باتوں سے سکھدیو آنے والے خطرات کا اندازہ لگا کر ایک فیصلے

پر پہنچ چکا تھا ادھر گنگارام نے اپنا آخری فقرہ پورا کیا اور ادھر ایک تیر سکھدیو کی کمان سے نکل کر اس کی پسلی میں پیوست ہو گیا۔

گنگارام نے ایک ہلکی سی چیخ کے ساتھ اپنا سر زین کے ہتھے پر ٹیک دیا۔

سپاہی ابھی ہوشیار نہ ہوئے تھے کہ چار پانچ اور تیر یکے بعد دیگرے مختلف آدمیوں کو لگے۔ ایک سپاہی نے چلا کر کہا۔ "وہ یہیں ہیں۔ سینا پتی مارے گئے۔ چاروں طرف سے تیروں کی بارش ہو رہی ہے۔ بھاگو! بھاگو!!"

ایک تیر ایک گھوڑے کو لگا اور اس نے تمام گھوڑوں میں کھلبلی مچا دی۔

گنگارام کو گرتا دیکھ کر ایک شخص نے پھرتی سے اپنا گھوڑا آگے کیا اور اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے اپنے گھوڑے پر ڈال لیا اور باگ موڑ لی۔ باقی سپاہی اس کے پیچھے ہو لیے اور آن کی آن میں میدان خالی ہو گیا۔

سکھدیو نے کنول کے ہاتھ سے گھوڑے کی لگام پکڑتے ہوئے کہا "کنول! اگر آج میں تمہارے باپ کی موت کا انتقام لینے میں کوتاہی کرتا تو مجھے ساری عمر افسوس رہتا۔"

کنول نے پوچھا "وہ بھی ان کے ساتھ تھا؟"

"میرا پہلا تیر اسی کے سینے میں لگا تھا۔ اب جلدی کرو! ہمیں راتوں رات یہ جنگل عبور کر لینا چاہیئے۔" سکھدیو یہ کہہ کر گھوڑے پر سوار ہوا اور کنول کو سہارا دے کر پیچھے بٹھا لیا۔

شہروں سے دُور

افق مشرق سے شب کی ردائے سرمگیں سمٹنے لگی اور صبح کے آثار نمودار ہونے لگے۔ گھنے جنگل میں درختوں سے شبنم کی بوندیں ٹپک کر سرسبز گھاس پر گر رہی تھیں۔ سکھدیو اور کنول تھکے ہوئے، گھوڑے سے اتر پڑے۔ اس روح پرور تنہائی میں ان کے دل محبت، آزادی اور مسرت کے دلکش راگ الاپ رہے تھے زندگی اپنی دلفریب حقیقتوں کے ساتھ مسکرا رہی تھی۔

کنول نے غیرارادی طور پر ایک شاخ پکڑ کر پتے توڑنے کی کوشش کی، شاخ میں ہلکی سی جنبش کے ساتھ شبنم کے چند قطرے سکھدیو پر گرے اور وہ پریشان ہو کر رہ گئی۔ سکھدیو نے مسکراتے ہوئے ایک شاخ کو پکڑ کر ہلایا اور خود چھینٹوں سے بچنے کے لیے دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔

کنول ہنستے ہوئے کپڑے جھاڑنے لگی "میں بارش سے نہیں ڈرتی جب آپ ساتھ ہوں میں کسی چیز سے نہیں ڈرتی۔"

سکھدیو بولا "کنول! مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم مر کر پھر زندہ ہوئے ہیں"

کنول نے پوچھا "آپ کو یقین ہے کہ اب ہمیں کوئی خطرہ نہیں؟"

سکھدیو نے جواب دیا "اب ہم خطرے کی حدود سے باہر آ چکے ہیں۔ دو تین کوس آگے چل کر ہم ریاست کی سرحد سے پار ہو جائیں گے۔ اس کے علاوہ گنگا رام کا انجام دیکھ کر اول تو راجہ خود ہی میرے تعاقب میں کسی کو نہیں بھیجے گا

اور اگر یہ مہم کسی کے سپرد کی بھی گئی تو جب تک وہ ہمارے گھوڑے کا کھوج نکالتا ہوا اس جگہ پہنچے گا ہم سرحد پار کر کے کئی کوس آگے جا چکے ہوں گے۔ ابھی تھوڑی دیر میں ہمارا گھوڑا بھی تازہ دم ہو جائے گا۔"

دو خوبصورت چڑیاں اڑتی ہوئی آئیں اور سامنے شاخ پر تھوڑی دیر بیٹھ کر چہچہانے کے بعد پھر اُڑ گئیں۔

سکھدیو کے منہ سے بے اختیار "آزادی" کا لفظ نکلا اور اس نے کنول کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا "کنول تمہیں معلوم ہے ہم کہاں جا رہے ہیں؟"

کنول نے کہا "جب تک آپ ساتھ ہیں مجھے یہ جاننے کی ضرورت نہیں"

سکھدیو نے کہا "میں کچھ دیر پہلے یہ سوچتا تھا کہ اس دنیا میں شاید ہمارے لیے کوئی جگہ نہیں لیکن ان چڑیوں کو دیکھنے کے بعد میں یہ محسوس کرنے لگا ہوں کہ اس دنیا میں ہزاروں ایسی جگہیں موجود ہیں جہاں صرف آزادی کی حکومت ہے خوش الحان پرندوں کی طرح ہم بھی جس جگہ دو گھڑیاں گزارا کریں گے اسے اپنا گھر سمجھ لیا کریں گے۔"

کنول نے کہا "لیکن پرندے بھی وقت پر اپنے گھونسلوں میں جا بیٹھتے ہیں ہمیں کوئی نہ کوئی آرام کی جگہ تلاش کرنی پڑے گی۔"

سکھدیو نے قدرے مغموم لہجے میں کہا "کنول! اب میں کسی شہر میں نہیں جا سکتا اور کسی ایسی بستی میں بھی پاؤں نہیں دھر سکتا۔ جہاں اونچی ذات کے لوگ رہتے ہوں مجھے یا تو اپنی باقی عمر کسی ویران جگہ میں گزارنی ہوگی یا اچھوتوں کی کسی بستی میں پناہ لینا پڑے گی۔ یہ غریب لوگ تمہارے پتا کی طرح بے یار و مددگار لوگوں کو خوشی سے پناہ دیں گے۔ میں ان لوگوں کی زندگی اختیار کروں گا ان کے ساتھ بکریاں چرایا کروں گا اور تم۔۔۔۔۔!"

"اور میں" کنول نے آنکھوں میں آنسو بھرتے ہوئے پوچھا۔

سکھدیو نے کہا "اور تم میرے دل کے مندر کو آباد کرو گی۔ یہ دیوتاؤں کے روٹھ جانے سے سنسان ہو گیا ہے لیکن یہ آنسو! کنول مجھے تمہاری مصیبت کا دکھ ہے لیکن میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ اپنی زندگی میں تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہونے دوں گا۔"

کنول نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا "میں آپ کے ساتھ ہر تکلیف خوشی سے برداشت کروں گی لیکن مجھے اس بات کا افسوس ہے کہ میری وجہ سے آپ آرام کی زندگی چھوڑ کر یہ تمام مصیبتیں اٹھائیں گے۔ میری وجہ سے آپ دوستوں اور رشتہ داروں کو چھوڑ کر اچھوتوں میں گمنام ہو کر رہیں گے۔"

"کنول یہ نہ کہو۔ اگر میں ایک راجہ بھی ہوتا تو بھی اپنی تمام زندگی کو تمہارے ساتھ ان چند لمحات کی خوشی کی قیمت نہ سمجھتا۔ اگر میری طرح یہ بڑے بڑے محلوں میں رہنے والے اونچی ذات کے لوگ اس خوشی اور آزادی کی نعمت سے واقف ہو جائیں جس کا طوفان میرے دل میں موجیں مار رہا ہے تو مجھے یقین ہے کہ وہ اپنے محلات چھوڑ کر پھر ایک بار ایسے جنگلوں میں گھاس پھونس کی جھونپڑیاں تعمیر کرنے پر آمادہ ہو جائیں۔"

کنول دیر تک ٹکٹکی باندھ کر اس کی طرف دیکھتی رہی اس کے چہرے سے حزن و ملال کے بادل چھٹ چکے تھے اور اس کے حسن و جمال کا نکھار سکھدیو کے دل و دماغ کی تمام قوتوں کو مغلوب کر رہا تھا۔ وہ جذبۂ عبودیت جس نے زمین و آسمان کی زبردست قوتوں کے سامنے سربسجود ہونا سیکھا تھا اب اسے ایک اچھوت لڑکی کے سامنے سر جھکا دینے پر آمادہ کر رہا تھا لیکن سکھدیو اپنی اس شکست کو اپنے مردانہ وقار کی توہین سمجھتے ہوئے سنبھل گیا اور چونک کر بولا "کنول چلو! ہمیں دیر ہو رہی ہے۔"

یہ دونوں پھر ایک بار تھکے ماندے گھوڑے پر سوار ہو گئے۔

---

(۲)

شام ہونے کو تھی سکھدیو اور کنول ایک ندی کے کنارے اترے۔ سکھدیو نے گھوڑے کی زین اتاری اور اسے گھاس چرنے کے لیے چھوڑ دیا اور خود سرسبز گھاس پر لیٹ گیا۔ کنول اس کے قریب بیٹھ گئی۔

سکھدیو نے انگڑائی لیتے ہوئے کہا "اب ہمیں کوئی خطرہ نہیں۔ ہاں کنول تمہیں بھوک تو بہت لگ رہی ہو گی؟"

"ہم دونوں بھوکے ہیں" کنول نے جواب دیا۔

"آج رات تو شاید پانی پی کر ہی گزارا کرنا پڑے۔ صبح سویرے ہم چرواہوں کی کسی نہ کسی بستی میں پہنچ جائیں گے۔ اگر گھوڑے میں آگے چلنے کی ہمت ہوتی تو ہم آج ہی چرواہوں کی کوئی نہ کوئی بستی تلاش کر لیتے لیکن وہ جواب دے چکا ہے میں تھوڑی دیر سستانے کے بعد ادھر ادھر دیکھتا ہوں اگر کوئی چرواہا نظر آیا، تو تمہارے لیے دودھ لے آؤں گا۔"

"آپ تھکے ہوئے ہیں آرام کریں۔ مجھے اتنی بھوک نہیں۔ صبح دیکھا جائیگا میں آپ کو اکیلا نہیں جانے دوں گی۔"

سورج غروب ہو چکا تھا اور افقِ مغرب پر بکھرے ہوئے بادلوں کے چند ٹکڑوں کی سرخی پر سیاہی غالب آ رہی تھی۔ شام کی خنک ہوا کے جھونکے ندی کے صاف اور شفاف پانی پر ہلکی ہلکی لہریں پیدا کر رہے تھے۔ آہستہ آہستہ آسمان

پرستاروں کا کارواں نمودار ہونے لگا اور ہوا کی خنکی بڑھنے لگی۔ سکھدیو اٹھ کر کنول کے قریب بیٹھ گیا۔

"کنول؟"

"مہاراج!"

"میں محسوس کرتا ہوں کہ ہم برسوں سے ایک دوسرے کے ساتھی تھے اور کبھی جدا نہیں ہوئے۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان ستاروں کی چھاؤں میں میں پہلے بھی کئی بار تمہارے ساتھ باتیں کر چکا ہوں۔ شاید پچھلے جنم میں ہم دونوں اچھوت تھے اور موت کے بعد کسی پرانے پاپ کی وجہ سے ہم اس جنم میں ایک دوسرے سے بہت دور ہو گئے لیکن زندگی اور موت کا یہ ہیر پھیر ہماری محبت کی زنجیریں نہ توڑ سکا اور ہم نے پھر ایک دوسرے کو ڈھونڈ لیا۔"

کنول نے جواب دیا کہ "میں نہیں سمجھی کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ مجھے تو بار بار یہی خیال آتا ہے کہ آپ مجھ پر ترس کھا کر میری تسلی کے لیے یہ باتیں کر رہے ہیں۔ اگر یہ بات درست ہو کہ پچھلے جنم میں ہم دونوں اچھوت تھے تو مجھے ڈر ہے کہ وہ رشتہ جو ہمارے درمیان اس وقت قائم تھا۔ اب شاید قائم نہ ہو سکے۔"

"کونسا رشتہ؟ کنول! تم یہ کیا کہہ رہی ہو۔ میں تمہارے سوا باقی تمام رشتے توڑ چکا ہوں میرے لیے زندگی اب صرف تم ہو۔" سکھدیو نے کسی حد تک جذبات سے مغلوب ہو کر کنول کا ہاتھ پکڑ لیا اور ہونٹوں سے لگا لیا۔

کنول نے حیا سے مغلوب ہو کر اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور کہا "مجھے آپ کی محبت سے انکار نہیں لیکن رشتے سے میری مراد مرد اور عورت کا جائز تعلق ہے جو شاید ایک ہی ذات کے لوگوں میں ہو سکتا ہے۔ جب آپ کسی بستی میں داخل ہوں گے تو لوگ آپ سے پوچھیں گے کہ یہ آپ کی کون ہے آپ انہیں کیا جواب دیں گے؟

شاید آپ کا یہ جواب کہ ہم ایک دوسرے کے ساتھی ہیں کافی نہ ہو اور ان کی نظر اس زنجیر تک نہ پہنچ سکے جس کے ساتھ ہمارے دل بندھے ہوئے ہیں کیا آپ یہ پسند کریں گے کہ وہ مجھے ایک آوارہ عورت سمجھیں اور طرح طرح کی باتیں کریں؟"

سکھدیو نے کہا "کنول! جو کچھ تم کہنا چاہتی ہو وہ میں سمجھ چکا ہوں۔ جائز تعلق سے تمہاری مراد شوہر اور بیوی کا تعلق ہے۔ دیکھو کنول! اگر تم چاہو تو میں آج سے تمہارا پتی کہلانے کے لیے تیار ہوں ... میں یہ سمجھتا ہوں کہ ہمیں یہ رشتہ جوڑنے کے لیے پروہت کے بھجن اور شہنائیوں کی ضرورت نہیں اور شاید ہمیں کوئی ایسا پروہت مل بھی نہ سکے اس لیے یہ رشتہ ہم سماج کے سامنے نہیں بلکہ اس زبردست طاقت کے سامنے جوڑتے ہیں جس نے ہمیں ایک دوسرے سے ملایا اور سماج کی زبردست کوشش کے باوجود ہمیں موت کے منہ سے چھڑا لیا۔ میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ وہ زبردست طاقت اب بھی ہمارے ساتھ ہے۔ وہ ستاروں کی آنکھوں سے ہمیں ایک جگہ دیکھ کر خوش ہو رہی ہے میں اس کا نام نہیں جانتا لیکن جو میں کہوں تم بھی کہو۔"

سکھدیو نے کنول کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور یہ کہنا شروع کیا:

"اے زبردست اور انصاف پسند طاقت! تو گواہ ہے کہ ہم آج شوہر اور بیوی کا رشتہ جوڑتے ہیں ہم مرتے دم تک ایک دوسرے کا ساتھ دیں گے ہم صرف ایک دوسرے کے لیے زندہ رہیں گے۔ اے زبردست اور انصاف پسند طاقت! ہماری مدد کر۔"

کنول نے دبی زبان سے سکھدیو کے یہ الفاظ دہرا دیئے۔

سکھدیو کی نگاہیں ستاروں سے باتیں کر رہی تھیں کنول کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو چھلک رہے تھے۔

سکھدیو نے کہا "کنول! میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ اس زبردست طاقت کا نام محبت یا محبت کا مرکز ہونا چاہیئے۔"

لیکن سکھدیو کی موجودگی میں کنول نے کسی اور طاقت کے تصور کی ضرورت محسوس نہ کی اور اس نے آگے جھک کر سکھدیو کے پاؤں چھو لیئے۔

"نہیں، نہیں کنول!" سکھدیو نے یہ کہتے ہوئے اسے کھینچ کر اپنی آغوش میں لے لیا۔ دونوں نے لرزتی ہوئی نگاہوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور آنکھیں بند کرلیں۔ دونوں نے ایک دوسرے کے دل کی دھڑکن سنی ایک دوسرے کے تنفس کی حرارت محسوس کی اور دونوں کے کانپتے ہوئے ہونٹ ایک دوسرے سے پیوست ہو گئے۔

کنول نے پوچھا "کیا آپ کو یقین ہے کہ یہاں کوئی خطرہ نہیں ہے؟"

سکھدیو نے جواب دیا "نہیں! یہاں کوئی خطرہ نہیں ہم اپنی ریاست کی سرحد سے بہت دور آ چکے ہیں۔ اونچی ذات والوں کے شہر یہاں سے کوسوں دور ہیں۔ ممکن ہے کہ ہمیں اس غیر آباد علاقے میں آزاد قوم کے چرواہوں کی کوئی نہ کوئی بستی مل جائے۔"

---

(۱۳)

پچھلی رات کی چاندنی میں سکھدیو اور کنول نے ندی عبور کی۔ کنول گھوڑے پر سوار تھی اور سکھدیو اس کی لگام ہاتھ میں لیے آگے آگے چل رہا تھا۔

وہ دیر تک سفر کرتے رہے لیکن چرواہوں کی بستیوں کا کوئی نشان نہ ملا راستے میں پانی کی کمی نہ تھی لیکن بھوک ان دونوں کو نڈھال کر رہی تھی۔ تھکا ماندہ گھوڑا چلتے چلتے رک جاتا اور گھاس کے چند تنکے نوچنے کے بعد پھر چل پڑتا۔

دوپہر کے وقت انہیں درختوں کے درمیان چند بھیڑیں اور بکریاں چرتی ہوئی نظر آئیں اور درختوں کے ایک جھنڈ کی طرف سے بنسری کی دلکش آواز سنائی دی۔ سکھدیو اور کنول بھیڑوں کے قریب پہنچے۔ ایک درخت کے نیچے کسی کا پھٹا پرانا بستر، ایک مٹی کا پیالہ اور مچھلیاں پکڑنے والا ایک چھوٹا سا جال پڑا تھا لیکن انہیں بنسری بجانے والا نظر نہ آیا۔ سکھدیو نے کنول کو گھوڑے سے اتار کر گھوڑا ایک درخت کے ساتھ باندھ دیا اور دونوں درختوں کے جھنڈ میں بنسری بجانے والے کو تلاش کرنے لگے۔

"وہ دیکھیے!" کنول نے ایک درخت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

سکھدیو نے اوپر نگاہ کی تو اسے درخت کی گھنی ٹہنیوں کے درمیان ایک انسان کی صورت دکھائی دی۔

"کیوں بھائی نیچے نہیں آؤ گے؟" سکھدیو نے آگے بڑھ کر کہا۔

"کون!" بنسری بجانے والے نے چونک کر کہا اور اس کے ساتھ ہی بنسری اس کے ہاتھوں سے چھوٹ کر زمین پر گر پڑی۔

سکھدیو نے کہا "بھائی! ہم مسافر ہیں۔ بہت تھکے ہوئے ـــــ اور بہت بھوکے!"

چرواہا درخت کی ٹہنیوں کے ساتھ لٹکتا ہوا نیچے اترا۔ اور سکھدیو اور کنول کی طرف پریشان سا ہو کر دیکھنے لگا۔ اچانک اس کی نظر گھوڑے پر پڑی اور اس نے پوچھا:

"یہ گھوڑا تمہارا ہے؟"

سکھدیو نے جواب دیا "ہاں ہمارا ہے!"

"بہت خوبصورت گھوڑا ہے۔ میں نے ایسا گھوڑا کبھی نہیں دیکھا۔ تم

کس دیس کے رہنے والے ہو؟"

"ہم دور دیس کے رہنے والے ہیں۔"

"آپ شاید میری بنسری کی آواز سن کر ادھر آئے ہیں؟"

"ہاں تم بنسری بہت اچھی بجاتے ہو۔"

"آپ اسے پسند کرتے ہیں؟ لیجئے میں پھر بجاتا ہوں۔ یہ کہہ کر چرواہے نے جلدی سے بنسری اُٹھائی اور ہونٹوں کے ساتھ لگا لی۔

سکھدیو نے کہا" بھائی ٹھہرو! ہم آرام سے بیٹھ کر تمہاری بنسری سنیں گے پہلے ہماری بھوک کا علاج کرو۔"

"آپ بھوکے ہیں؟"

سکھدیو نے جواب دیا" دو دن سے کچھ نہیں کھایا۔"

"اوہو! مجھے آتے ہی کیوں نہ بتایا؟"

"بتایا تھا لیکن تم نے سنا نہیں۔"

"بس میں ابھی آتا ہوں" چرواہا یہ کہہ کر وہاں سے بھاگا اور آن کی آن میں چند بکریاں گھیر کر درخت کے نیچے لے آیا اور مٹی کا پیالہ اٹھا کر دودھ دوہنے لگا۔ سکھدیو اور کنول درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔ چرواہے نے پہلا پیالہ بھر کر سکھدیو کو پیش کیا۔ سکھدیو نے کنول کو پیش کرنا چاہا لیکن اس نے "پہلے آپ" کہہ کر انکار کر دیا۔ سکھدیو نے ایک دو دفعہ اصرار کیا تو چرواہے سے نہ رہا گیا اور وہ بولا" ہمارے ملک میں تو کھانے پینے کی باتوں میں مرد پہل کرتا ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ تمہارے ملک کا رواج الٹا ہے۔"

کنول اس پر ہنس پڑی اور سکھدیو نے مسکراتے ہوئے پیالہ منہ سے لگا لیا۔

کنول اور سکھدیو نے سیر ہو کر دودھ پیا لیکن چرواہے کی تسلی نہ ہوئی اور

جب تک ان دونوں کی قوتِ برداشت نے جواب نہ دے دیا اور وہ پینے کے لیے اصرار کرتا رہا۔

سکھدیو نے پوچھا" بھائی چرواہے تمہارا کیا نام ہے؟"

"بدھو" چرواہے نے جواب دیا۔

"کہاں رہتے ہو؟"

"یہاں سے تین کوس کے فاصلے پر دریائے راوی کے قریب ہماری بستی ہے۔"

"دریا وہاں سے کتنی دور ہے؟"

"ایک کوس۔"

"تمہاری بستی میں کتنے لوگ آباد ہیں؟"

"بہت ہیں۔" اس نے جواب دیا۔

چند اور سوالات کے بعد سکھدیو کو معلوم ہوا کہ دریا کے کنارے چرواہوں کی اور بہت سی بستیاں آباد ہیں اور ان بستیوں کے اکثر لوگ بھیڑ بکریاں پالتے ہیں۔ بعض مچھلیاں پکڑ کر گزارہ کرتے ہیں۔

سکھدیو کے سوالات کا جواب دینے کے بعد چرواہے نے پوچھا" آپ کون ہیں۔ کہاں سے آئے ہیں اور کس طرف جا رہے ہیں؟"

سکھدیو نے اس کے جواب میں اپنی داستان مختصر طور پر بیان کر دی۔ بدھو سکھدیو کی آپ بیتی کا کچھ حصہ سمجھا، کچھ نہ سمجھا۔ لیکن وہ یہ جان چکا تھا کہ ایک حسین و جمیل لڑکی اور ایک خوش وضع نوجوان مصیبت میں ہیں اور یہ احساس اس کے دل میں ہمدردی کے انتہائی جذبات بیدار کرنے کے لیے کافی تھا۔

سکھدیو کی سرگزشت کے اختتام پر بدھو کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن ہمدردی

کے گہرے جذبات جو اس کے دل میں کروٹیں لے رہے تھے، اُن کے اظہار کے لیے اسے اپنی تمام عمر میں سیکھے ہوئے الفاظ ناکافی نظر آنے لگے۔ اس نے دل، دماغ اور زبان کی تمام کوششوں کو بروئے کار لاتے ہوئے کہا:

"آپ نے بہت مصیبت اٹھائی ہے آپ میرے ساتھ چلیں مجھے آپ کی خدمت کر کے بہت خوشی ہو گی ہمارا سردار بہت اچھا آدمی ہے وہ آپ کی رہائش کا انتظام کر دے گا ورنہ میری جھونپڑی آپ کے لیے کافی ہو گی۔ میں اکیلا ہوں اپنے لیے اور جھونپڑی بنا لوں گا۔"

سکھدیو نے بدھو کے ان سیدھے سادے الفاظ کے خلوص سے متاثر ہو کر احسان مندی کے اظہار کی ضرورت نہ سمجھی۔ اس نے اٹھ کر درخت سے گھوڑے کا رسّا کھولا۔ اس کی زین اور لگام اتار کر نیچے پھینک دی اور اسے تھپکی دینے کے بعد ایک طرف ہانک دیا۔

گھوڑا چند قدم آہستہ آہستہ چلنے کے بعد گھاس میں چرنے لگا۔

سکھدیو نے ایک پتھر اٹھا کر اس کی طرف پھینکا اور وہ سرپٹ بھاگ اٹھا۔

بدھو کچھ دیر بھاگتے ہوئے گھوڑے کی طرف دیکھتا رہا اور پھر سکھدیو کی طرف دیکھ کر بولا۔ گھوڑا بہت دور چلا گیا ہے۔ شاید واپس نہ آئے۔ میں پکڑ لاؤں؟

سکھدیو نے جواب دیا "نہیں ہمیں اب اس کی ضرورت نہیں۔ ہم تمہارے ساتھ پیدل چلیں گے۔"

بدھو اس جواب سے مطمئن نہ ہوا اور نہ ہی اس نے اس حماقت کی پوری وجہ دریافت کرنے کی ضرورت محسوس کی۔ تاہم سکھدیو نے اس کی تسلی کے لیے مزید تشریح کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے کہا "ہم تینوں سماج کے چور ہیں۔ وہ

کو شاید آپ کے جھونپڑے پناہ دے سکیں لیکن گھوڑے کو چھپا کر رکھنا مجھے مشکل نظر آتا ہے۔"

اس جواب نے بدھو کو اور بھی پریشان کر دیا۔ وہ سکھدیو کو یہ رعایت دے سکتا تھا کہ اپنے آپ کو جو چاہے سمجھے لیکن اسے یہ حق نہیں دے سکتا تھا کہ وہ ایک حسین عورت کو خواہ وہ اس کی بیوی ہی کیوں نہ ہو لوگوں کے سامنے بدنام کرتا کرتا پھرے۔ کنول کی مصیبت کا حال سنتے ہی اس کے دل میں برادرانہ شفقت کا جذبہ بیدار ہو چکا تھا اور اسے بہن کہہ کر پکارنے کا ارادہ بھی کر چکا تھا۔

سکھدیو اس کے چہرے کا اتار چڑھاؤ دیکھ کر مسکرایا اور بولا "چور سے میرا مطلب یہ نہیں کہ ہم نے کوئی چوری کی ہے میرا مطلب یہ تھا کہ ہم سماج کی قید سے بھاگ آئے ہیں۔ اچھا بھائی! اب بنسری سناؤ۔"

بدھو بنسری بجانے کے معاملے میں کسی کی درخواست ٹھکرا لینے کا عادی نہ تھا۔ اس نے فوراً بنسری اٹھائی اور گھاس پر بیٹھ کر ایک دل کش ترانہ شروع کیا۔ سکھدیو کو یہ دیکھ کر حیرانی ہوئی کہ سیدھا سادہ چرواہا موسیقی کی تمام لطافتوں سے آشنا ہے۔

درختوں کے سائے ڈھل رہے تھے لیکن بدھو کے ترانے ختم ہونے میں نہ آتے تھے۔

سکھدیو نے اس کو ذرا تازہ دم ہو لینے کا موقع دینے کی نیت سے کہا "بدھو! تم بنسری بہت اچھی بجاتے ہو۔ یہ راگ تمہیں کس نے سکھائے ہیں؟"

"یونہی جنگل میں پھرتے پھرتے سیکھ گیا۔"

"یہاں سے کب واپس چلو گے؟"

بدھو نے درختوں کا سایہ دیکھ کر کہا "میرا خیال ہے ہمیں اب چلنا چاہیے۔"

شام قریب آرہی ہے آپ یہیں ٹھہریں میں بکریاں گھیر لاؤں۔"

---

(۴)

شام کے وقت جب بستیوں میں کتوں کی چیخ پکار چرواہوں اور ماہی گیروں کے اپنے اپنے گھر لوٹنے کا پتہ دے رہی تھی، سکھدیو اور کنول، بدھو کے ساتھ ایک ٹیلے پر سے گزر رہے تھے۔ یہاں سے انہیں وہ جھیل دکھائی دی جس کے اردگرد چرواہوں کی بستیاں آباد تھیں۔ ان بستیوں سے کچھ دور انہیں دریا کا چمکتا ہوا پانی بھی نظر آرہا تھا۔ ٹیلے سے نیچے اتر کر وہ جھیل کے کنارے کنارے چلتے ہوئے ایک بستی میں داخل ہوئے۔

بستی کے چھوٹے چھوٹے لڑکے حسبِ معمول ہنستے، اچھلتے اور کودتے ہوئے بدھو کے استقبال کو نکلے لیکن اس دفعہ، بھیا بدھو کے ساتھ دو غیر مانوس صورتیں دیکھ کر انہوں نے بے تکلف ہونے کی جرأت نہ کی۔ انہوں نے ایک دوسرے سے دبی زبان میں کچھ کہتے ہوئے اپنے اپنے گھر کی راہ لی اور آن کی آن میں تمام بستی میں یہ منادی کرادی کہ بھیا بدھو، جن، پریوں اور بھوتوں کی کہانیاں سنایا کرتا تھا ان میں سے دو کو اپنے ساتھ لے آیا ہے۔

بدھو نے اپنے گھر پہنچ کر جھونپڑی میں سے دو چارپائیاں نکال کر باہر ڈال دیں اور سکھدیو اور کنول کو بٹھا دیا۔ تھوڑی دیر میں گاؤں کی عورتیں اور مرد بدھو کے گھر میں جمع ہو گئے اور وہاں تل دھرنے کو جگہ نہ رہی۔ بدھو سے بیسیوں سوالات کرنے کے بعد لوگ صرف اتنا جان سکے کہ یہ لڑکی ایک بہت بڑے سردار کی بیٹی ہے ان کے ملک میں ایک بہت بڑا راجہ تھا۔ اس نے اس لڑکی کے باپ کو قتل

کر کے اس لڑکی کو قید کر لیا۔ اس نوجوان کے پاس بہت سی فوجیں تھیں۔ اس نے راجہ کے ساتھ جنگ کی لیکن راجہ نے اسے بھی قید کر لیا۔ اس کے بعد ایک رات یہ دونوں قید خانے کے دروازے توڑ کر باہر نکلے اور راجہ کی فوجوں کو فنا کرتے ہوئے بھاگ آئے۔ اب یہ بدھو کے پاس رہیں گے۔

بدھو کی یہ کہانی کئی زبانوں کے مرچ مسالے کے ساتھ ان لوگوں کے بڑے سردار موتی تک بھی جا پہنچی تھوڑی دیر میں وہ بھی لاٹھی ٹیکتا، کھانستا ہانپتا آموجود ہوا۔ موتی کو دیکھ کر لوگ پاسِ ادب سے ادھر ادھر ہٹ گئے۔ بدھو بھاگتا ہوا پڑوس کی جھونپڑی سے ایک اور چارپائی لے آیا اور موتی کو اس پر بیٹھنے کے لیے کہا۔

بوڑھا سردار بدھو کے عجیب و غریب بیان اور اس پر لوگوں کی مبالغہ آرائی سے پہلے ہی مرعوب ہو چکا تھا۔ اب سکھدیو کے چہرے کا رعب و جلال دیکھ کر اور بھی سہم گیا اور اس نے بیٹھنے کی بجائے آگے جھک کر سکھدیو کے پاؤں چھونے کی کوشش کی لیکن سکھدیو نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اٹھ کر کہنے لگا۔ "مجھے شرمندہ نہ کریں آپ بزرگ ہیں۔"

"نہیں مہاراج! میں آپ کا خادم ہوں۔ میں نے سنا ہے کہ آپ کی فوج نے راجہ کا مقابلہ کیا ہے۔ آپ گھوڑوں اور ہاتھیوں پر سواری کرتے ہیں اور آپ کی بیوی کسی بہت بڑے سردار کی لڑکی ہے جسے راجہ نے کسی دشمنی کی وجہ سے قید میں ڈال دیا تھا اور آپ راجہ کے ہزاروں سپاہیوں کو قتل کر کے اپنی بیوی کو اس کی قید سے نکال لائے ہیں۔ آپ اپنا ملک چھوڑ کر ہمارے پاس آئے ہیں۔ آپ کی سیوا ہمارا فرض ہے لیکن مجھے ڈر ہے کہ کہیں آپ کے دشمن آپ کا پیچھا کرتے کرتے اس جگہ نہ پہنچ جائیں اور ہماری شامت نہ آجائے۔"

سکھدیو نے جواب دیا: "یہ علاقہ ہماری ریاست کی حدود سے بہت دور ہے اس لیے مجھے یقین ہے کہ کوئی اس طرف نہیں آئے گا اس کے علاوہ راجہ کے ساتھ میری کوئی خاص دشمنی نہیں وہ میرا دوست تھا لیکن اس تمام مصیبت کی وجہ میرے ساتھ راجہ کی فوج کے ایک افسر کی ذاتی دشمنی تھی اس نے میری بیوی کے باپ کو قتل کیا تھا لیکن اب وہ مارا جا چکا ہے اور مجھے کسی قسم کا خطرہ نہیں اب آپ اگر چاہیں تو ہمیں پناہ دیں ورنہ ہم کوئی اور جگہ تلاش کرلیں گے۔"

موتی نادم سا ہو کر چارپائی پر بیٹھ گیا اور کہنے لگا: "ہمارے جھونپڑے آپ کے لیے کھلے ہیں یہاں آپ کو کسی قسم کی تکلیف نہیں ہوگی۔ میں آپ سے یہ سارا قصہ سننا چاہتا ہوں۔ مجھے بہادروں کے کارنامے سن کر بہت خوشی ہوتی ہے۔"

یہ کہہ کر سردار نے لوگوں کی طرف دیکھا اور کہا: "تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ جاؤ اپنے اپنے گھر۔" سردار کا یہ حکم سن کر تمام مرد اور عورتیں بدھو کے گھر سے نکل گئے۔ سردار نے سکھدیو کی طرف دیکھا اور کہا:

"ہاں کہیے!"

سکھدیو نے اپنا قصہ ذرا تفصیل کے ساتھ شروع کیا۔ بستی کے چند سرکردہ آدمی جو سردار کا حکم سن کر ذرا پیچھے ہٹ گئے تھے۔ سردار کے انہماک سے فائدہ اٹھا کر جھجکتے ہوئے سکھدیو کے قریب آکر زمین پر بیٹھ گئے۔

موتی کے لیے اس داستان کا کوئی حصہ دلچسپی سے خالی نہ تھا۔ سکھدیو کی داستان کے اختتام پر وہ بولا:

"معاف کیجئے جو سب سے ضروری بات تھی۔ اس کا ابھی تک ذکر نہیں آیا۔ آپ کو دو دن میں صرف دودھ ملا ہے۔ آپ بہت بھوکے ہوں گے لیکن یہ بدھو کا قصور ہے۔ ارے بدھو! جاؤ جلدی کرو۔ ہمارے گھر سے کھانا لے آؤ۔"

بدھو نے کہا: "مہاراج! کھانا تو ادھر بہت جمع ہو گیا ہے۔ میں تو یہ دیکھ رہا تھا کہ آپ لوگ جائیں اور میں ان کے آگے کھانا رکھوں۔"

سردار کو بدھو کی سادہ دلی سے اُنس تھا اور وہ اس کی ہر الٹی سیدھی بات پر مسکرانے کا عادی تھا اس نے کہا: "ہم جانتے ہیں بھائی! لیکن کھانا تمہارے پاس کہاں سے آیا؟"

"مہاراج! آپ کا نوکر کالو روٹیاں لے آیا ہے۔ دولو مچھلیاں دے گیا ہے۔ مائی سنتی مکھن کا ایک کٹورا بھر کر دے گئی ہے۔ باگو بھنے ہوئے گوشت کی دو رانیں دے گیا ہے اور لوگ بہت کچھ لے کر آئے تھے لیکن میں نے واپس کر دیا۔"

موتی نے کہا: "اچھا تم انہیں کھانا کھلا کر میرے گھر لے آؤ۔ سردی میں ان کا باہر سونا ٹھیک نہیں اور تمہاری جھونپڑی بہت تنگ ہے۔"

بدھو نے کہا: "نہیں مہاراج! میں خود باہر سو جاؤں گا اور جھونپڑی میں دو چارپائیاں آسانی سے آ سکتی ہیں۔ کم از کم آج انہیں میرے پاس ضرور رہنے دیں۔"

سکھدیو نے بدھو کی سفارش کی۔ موتی رضامند ہو کر اپنے گھر چلا گیا لیکن بدھو کی بے سروسامانی کا احساس کرتے ہوئے اس نے اپنے گھر سے اُون کی دو چادریں اور دو بچھونے بھیج دیئے۔

اگلے روز سکھدیو موتی کا مہمان تھا اور ایک ہفتے کے بعد آس پاس کی بستیوں کے لوگ جمع ہو کر بدھو کے گھر کے پاس ایک کھلی جگہ میں ایک مکان تعمیر کر رہے تھے۔ موتی کے علاوہ دوسری بستیوں کے چھوٹے چھوٹے سردار بھی اس کام میں بڑی دلچسپی لے رہے تھے۔

(۵)

چند دنوں کے بعد سکھدیو نے کنول کے ساتھ اپنے نئے گھر میں قدم رکھتے ہوئے کہا "کنول! ہمارے گردش کے دن ختم ہوئے۔ آج سے ہماری نئی زندگی شروع ہوتی ہے۔" کنول نے اندر جا کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ بستی کے لوگوں نے ان کے لیے صرف مکان ہی تعمیر نہیں کیا بلکہ اس میں کھانے پینے کی اشیاء کا بھی اتنا ذخیرہ جمع کر دیا ہے جو کئی مہینوں کے لیے کافی تھا۔

گاؤں کی عورتوں میں اس بات کا بہت چرچا تھا کہ کنول ایک بڑے سردار کی لڑکی ہے اور اس کا شوہر ایک بہت بڑے راجہ کی فوجوں کا افسر تھا وہ کنول کے پاس بیٹھنے، اس سے باتیں کرنے اور اس کی خدمت کرنے میں ایک مسرت محسوس کرتی تھیں۔ انہیں جب موقع ملتا۔ کنول کے گھر بھاگ آتیں۔ کوئی اس کے لیے آگ جلاتی، کوئی جھاڑو دیتی وہ انہیں منع کرتی۔ لیکن وہ اصرار کر کے اسے آرام سے بیٹھ جانے پر مجبور کر دیتیں۔

قریباً یہی سلوک گاؤں کے مرد سکھدیو کے ساتھ کرتے تھے ماہی گیر اسے اپنے شکار اور چرواہے اسے اپنے دودھ اور مکھن کا سب سے پہلا حقدار سمجھتے تھے۔ وہ باہر جاتا تو چرواہوں اور ماہی گیروں کے کام میں ہاتھ بٹانا چاہتا لیکن وہ ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو جاتے اور کہتے۔ مہاراج! یہ نہیں ہو سکتا کہ ہمارے ہوتے ہوئے آپ کوئی کام کریں۔ آپ کی سیوا ہمارا فرض ہے۔"

سکھدیو بدھو کے پاس جاتا اور اصرار کرتا کہ "بھائی! آج تم آرام کرو میں بکریاں لے جاتا ہوں ورنہ میں تم سے دودھ نہیں لوں گا۔"

وہ مغموم ہو کر کہتا: بھائی! دیکھو یوں نہ کرو۔ تم یہ چاہتے ہو کہ میں بہن کنول

کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہوں۔ دنیا میں میرا کوئی نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ مجھے بہن بھائی مل گئے ہیں اور تم ہو کہ بار بار بیگانوں والی باتیں کرتے ہو۔"

موتی لاٹھی ٹیکتا ہوا دن میں ایک دو دفعہ سکھدیو کے گھر آتا اور ہمیشہ یہ پوچھتا "بیٹی کنول! اچھی ہو کوئی تکلیف تو نہیں؟" وہ جواب دیتی "اچھی ہوں پتا جی!" وہ پیار سے کنول کے سر پر ہاتھ رکھتا۔ اور کہتا "جیتی رہو بٹیا! تم مجھے پتا جی کہتی ہو تو میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ مجھے بڑھاپے میں ایک سہارا مل گیا ہے۔"

سکھدیو کا خیال تھا کہ اس کے حال پر ان لوگوں کی توجہ آہستہ آہستہ کم ہو جائے گی اور اسے چند ہفتوں تک ان کی سخاوت کے ٹکڑوں پر زندگی بسر کرنے کے بجائے اپنی محنت اور مشقت سے روٹی کمانے کا موقع مل جائیگا اور وہ بدھو کے ساتھ شامل ہو کر ایک جفاکش چرواہے کی زندگی بسر کر سکے گا لیکن لوگوں کی توجہ کم ہونے کی بجائے بڑھتی گئی۔ اس بستی کے لوگوں کے علاوہ دوسری بستیوں کے باشندے اور ان کے سردار جب اپنے بڑے سردار سے ملنے کے لیے آتے۔ سکھدیو کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور لے آتے۔ اگر کبھی سکھدیو یہ چیزیں لینے سے انکار کر دیتا تو وہ بہن کنول کی منت سماجت کر کے منا لیتے۔ بعض اوقات ان کے گھر میں مکھن، مچھلی، شہد اور دیگر اشیاء اس قدر جمع ہو جاتیں کہ کنول کو پڑوسیوں میں تقسیم کرنا پڑتیں۔

سکھدیو کی خودداری نے اسے دیر تک خاموش رہنے کی اجازت نہ دی وہ ایک صبح بستر سے اٹھتے ہی سیدھا سردار کے پاس پہنچا۔ سردار بستر پر بیٹھا کھانس رہا تھا۔ سکھدیو کو دیکھتے ہی بولا۔ "آؤ بیٹا آؤ! کل کالو کی بستی کے چند کسان کچھ مکی اور چاول لے کر آئے تھے۔ مکی میں نے چند عورتوں کو پیسنے کے لیے دے دی ہے کل تک تمہارے گھر آٹا پہنچ جائے گا۔ چاول ابھی بھیج دیتا ہوں۔"

سکھدیو نے کہا۔ "اگر آپ اسی طرح کرتے رہیں گے تو مجھے کوئی اور جگہ تلاش کرنی پڑے گی۔ میں یہاں نہیں رہوں گا۔"

سردار نے چونک کر سکھدیو کی طرف دیکھا اور کہا۔ "نا بیٹا! یوں نہ کہو۔ اگر مجھے تمہارا سہارا بھی نہ رہا تو بڑھاپے کے دن گزارنے مشکل ہو جائیں گے تمہیں دیکھتا ہوں تو مردہ رگوں میں جان آجاتی ہے بلاوجہ ناراض ہونا تو ٹھیک نہیں!"

سکھدیو نے ذرا نادم ہو کر کہا "میں آپ سے ناراض نہیں ہوں لیکن مجھے ان لوگوں کے گاڑھے پسینے کی کمائی سے اپنا پیٹ بھرتے ہوئے شرم محسوس ہوتی ہے۔ میں نے آپ سے کئی بار عرض کیا ہے کہ میں اپنا بوجھ خود اٹھانا چاہتا ہوں۔ میرے ہاتھ کافی مضبوط ہیں اور میں سخت سے سخت کام کر سکتا ہوں۔"

"کیا کام کرنا چاہتے ہو بیٹا؟"

سکھدیو نے کہا۔ "آپ کی بکریاں جو دوسرے چرواہے چراتے ہیں۔ ان میں سے کچھ میں چرا لایا کروں گا۔ جو حصہ آپ انہیں دیتے ہیں وہ مجھے دے دیا کریں۔"

"بیٹا! یہ کام تمہاری شان کے شایاں نہیں۔"

"یہ بھی میری شان کے شایاں نہیں کہ میں دوسروں سے لے کر کھاؤں!"

"اچھا تو میری ایک بات مانو گے؟"

"بتائیے!"

"سنو! تم میرے بیٹے ہو اور کنول میری بہو ہے۔ جو کچھ میرے پاس ہے وہ میری زندگی میں بھی تمہارا ہے اور میرے بعد بھی تمہارا ہوگا۔ اگر تم آرام سے نہیں بیٹھ سکتے تو جتنی بکریاں سنبھال سکو لے لینا۔ تمہیں ایک نوکر بھی مل جائے گا۔"

سکھدیو نے کہا "مجھے نوکر کی ضرورت نہیں میں بدھو کے ساتھ جایا کروں گا اور ہم دونوں بڑے سے بڑا گلہ سنبھال سکتے ہیں۔"

"اچھا بیٹا! آج تو آرام کرو۔ شام کو چرواہے آئیں تو بدھو کو ساتھ لے کر آجانا۔"

اگلے دن ایک کھلی چراگاہ میں بدھو کی بکریوں کے ساتھ سکھدیو کی پچاس بکریاں اور چالیس بھیڑیں بھی چر رہی تھیں۔ سکھدیو ایک درخت کے نیچے لیٹا بدھو کی بنسری کی دلکش تانیں سن رہا تھا۔

راجہ اور پروہت

سکھدیو کے قید سے فرار ہونے اور گنگارام کی موت کے بعد حالات نے راجہ کو باغیوں کے متعلق اپنے طرزِ عمل میں تبدیلی کی ضرورت کا احساس دلایا۔

گنگارام راجہ کو اپنی پہلی شاندار فتح کی خوش خبری سنانے اور آگے بڑھنے کے لیے مزید فوجوں کا مطالبہ کرنے اور سب سے زیادہ سکھدیو کا انجام اپنی آنکھوں سے دیکھنے کی نیت سے فوج کی قیادت اپنے بھائی جے رام کو سونپنے کے بعد واپس لوٹا تھا۔ رخصت ہوتے وقت اس نے جے رام کو ایک محدود علاقہ میں اپنی سرگرمیاں جاری رکھنے کی ہدایت کی تھی۔

جے رام اپنے بھائی کی غیر حاضری میں بیس پچیس میل کے رقبے میں شکست خوردہ اور نہتے انسانوں کے سینوں پر اپنی تلوار کی تیزی آزماتا رہا۔ وہ لوگ جن کی ٹانگیں ان کا بوجھ اٹھا سکتی تھیں اپنے سردار کی بستی پر طاقتور دشمن کے حملے کی خبر سنتے ہی بھاگ کر پہاڑوں میں پناہ لے چکے تھے۔ تاہم حملہ آوروں نے اپنے تیز رفتار گھوڑوں کی مدد سے بوڑھوں اور بچوں کی ایک اچھی خاصی تعداد کے لیے فرار کی تمام راہیں بند کر دیں اور جے رام نے انہیں موت کے گھاٹ اتارنے میں مقدس دیوتاؤں کی خواہشات کا پورا پورا لحاظ رکھا۔

قدرت نے گنگارام کو اپنے پرانے حریف سکھدیو پر آخری فتح حاصل کرنے کے بعد لوٹ کر ان پہاڑیوں کی آخری چوٹیوں پر اونچی ذات والوں کی فتوحات

کے جھنڈے لہرانے کی اجازت نہ دی اور وہ سکھدیو کے تیروں کا نشانہ ہو کر چل بسا۔

گنگارام کی موت کے بعد راجہ، رام داس کو سپہ سالار کے منصب پر فائز کرنا چاہتا تھا لیکن پروہت نے جو گنگارام کی طرح سکھدیو کے ہر دوست کا مخالف تھا۔ جے رام کی سفارش کی۔ راجہ کی نگاہ میں جے رام بہادر تھا نہ ہوشیار۔ لیکن اس کی تازہ کامیابیوں کے متعلق جو خبریں موصول ہو رہی تھیں ان کی بدولت برہمنوں کے علاوہ بعض کشتری سردار بھی جے رام کے طرف دار ہو گئے تھے۔

راجہ نے مجبوراً اسے سپہ سالار کا عہدہ دے کر دو ہزار سپاہیوں کی کمک بھیج دی اور پیش قدمی جاری رکھنے کا حکم دیا۔

جے رام نے حریف کی سراسیمگی اور انتشار سے فائدہ اٹھایا اور چند دنوں میں اس کی فوج کسی قابلِ ذکر مزاحمت کا سامنا کیے بغیر ایک وسیع علاقے پر قابض ہو گئی لیکن اونچے پہاڑوں کے دشوار گزار راستوں پر اس کی پیش قدمی کی رفتار نسبتاً سست تھی اور پہاڑی قبائل کو اپنی بستیاں خالی کر کے محفوظ مقامات پر پہنچنے کا موقع مل گیا۔

حملہ آوروں کی دہشت نے ان لوگوں کے قویٰ مفلوج کر دیے تھے وہ کچھ عرصے تک انفرادی طور پر صرف اپنی جانیں بچانے کے لیے جدوجہد کرتے رہے اور ان کے دل میں انتقام کی دبی ہوئی آگ بے بسی کے آنسوؤں میں تبدیل ہوتی رہی۔

قریباً دو ماہ کے بعد ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے اس قوم کے نوجوانوں میں جن کا خون خوف اور دہشت سے منجمد ہو چکا تھا ایک نئی حرارت پیدا کر دی۔ جے رام کی فوج کے ایک سالار نے ایک وادی میں ایک گاؤں پر حملہ کیا

گاؤں کے لوگ حملہ آوروں کی آمد سے پہلے ہی فرار ہو چکے تھے۔ سپاہیوں نے تمام جھونپڑوں کو آگ لگا دی۔ گاؤں کے باشندے اونچی پہاڑی پر کھڑے اپنے جلتے ہوئے گھروں کو دیکھ رہے تھے اور ان میں سے بعض اس پہاڑ کو دشمن کے گھوڑوں کی رسائی سے محفوظ پا کر سپاہیوں کو بُرا بھلا بھی کہہ رہے تھے۔ راجہ کے سپاہیوں کے لیے دشمن کی یہ جرأت ایک نئی بات تھی۔ ان کے سالار نے انہیں گھوڑوں سے اتر کر ان لوگوں کے تعاقب کا حکم دیا۔

جب پیدل سپاہی پہاڑی پر چڑھنے لگے تو یہ لوگ سراسیمہ ہو کر بھاگ نکلے لیکن ایک نوجوان کو غیرت آئی اور وہ اپنی جگہ پر کھڑا رہا۔ جب سپاہی ایک خطرناک ڈھلوان پر پہنچ گئے تو اس نے پتھروں کی بارش شروع کر دی۔ آن کی آن میں بیس سپاہی چت ہو کر نیچے لڑھک گئے اور ان کے دوسرے سالار نے بلندی کا رُخ کرنے کی بجائے نیچے اترنا بہتر خیال کیا۔

دوسرے لوگوں نے دُور سے یہ منظر دیکھا تو بجلی کی تیزی کے ساتھ آس پاس کی تمام پہاڑیوں پر چھا گئے اور اس تنگ وادی کی ہر ڈھلوان سے پتھر لڑھکنے لگے۔

سپاہی دشمن کے اس غیر متوقع حملے سے بدحواس ہو کر اپنی اپنی جان بچانے کے لیے اِدھر اُدھر بھاگے لیکن باغی اس تنگ وادی سے نکلنے کے تمام راستوں پر قابض ہو چکے تھے۔

رات کے وقت جب جے رام اپنی فوج کے تمام افسروں کی کارروائی سُن رہا تھا تو اسے ان سو بہادروں میں سے صرف چار کے زخمی ہو کر واپس ہونے کی اطلاع ملی۔

---

(۲)

تلواروں کے مقابلے میں پتھروں کی پہلی شاندار فتح نے ان لوگوں پر ایک جادو کا سا اثر کیا اور وہ یکے بعد دیگرے اس نوجوان کے گرد جمع ہونے لگے انہوں نے نشیب کے قابلِ گزر علاقوں کی باقی تمام بستیاں بھی خالی کر دیں اور دشوار گزار پہاڑوں کے درمیان ایک وادی کو اپنا مرکز بنا لیا۔ چند نوجوان اس وادی سے نکل کر دُور دُور تک چکر لگاتے اور اگر اپنی قوم کا کوئی گروہ نظر آتا تو اسے اس وادی میں لے آتے۔

جے رام طاقت کے نشے میں چُور تھا اس نے چند سپاہیوں کے نقصان کو کوئی اہمیت نہ دی اور بلا تامل اپنے پورے لشکر کے ساتھ پیش قدمی شروع کر دی۔ کئی اُجڑی ہوئی بستیوں کو جلانے کے بعد ایک دن جے رام کی فوج ایک تنگ گھاٹی سے گزر رہی تھی کہ اوپر سے اچانک پتھر برسنے لگے۔ جے رام نے بدحواسی کی حالت میں پہاڑی کی چوٹی پر حملہ کرنے کا حکم دے دیا۔ لیکن وہ مقام جسے وہ ناواقفیت کی بنا پر پہاڑی کی چوٹی سمجھتا تھا ایک اونچے پہاڑ کی ڈھلوان تھی۔ وہ ایک تہائی فوج کی قربانی کے بعد اس مقام تک پہنچا تو معلوم ہوا کہ پہاڑ کی چوٹی پر جہاں سے پتھر آ رہے ہیں قبضہ کرنے کے لیے اسے دوگنا اور اوپر جانا پڑے گا۔

پتھروں کی بارش اچانک تھم گئی اور جے رام نے سمجھا کہ دشمن کو اس کی ہمت نے مرعوب کر دیا ہے چنانچہ اس نے فوج کو آگے بڑھنے کا حکم دے دیا لیکن اس کے سپاہی مشکل سے کوئی سو گز اوپر چڑھے تھے کہ دشمن زیادہ جوش و خروش سے پتھر پھینکنے لگے۔ بلند پہاڑ کی چوٹی سے لڑھکتا ہوا ایک پتھر کئی چھوٹے چھوٹے پتھر اپنے ساتھ لے آتا اور ایک سپاہی گرتے وقت اپنے ایک دو اور ساتھیوں

کو بھی نیچے لے جاتا۔

فوج کی افراتفری نے جے رام کے حواس مختل کر دیے اور اس نے سپاہیوں کو نیچے اترنے کا حکم دے دیا اس وقت تک جے رام کی قریباً آدھی فوج تباہ ہو چکی تھی۔ ایک پتھر جے رام کے سر پر لگا اور وہ تین اور سپاہیوں کو اپنے ساتھ لیے لڑھکتا ہوا ایک کھڈ میں جا گرا۔

سیناپتی کی موت سے سپاہیوں کے رہے سہے اوسان خطا ہو گئے کسی کو پتھر لگا، کسی کا پاؤں پھسلا اور کسی کو اپنے ساتھی کا دھکا لگا۔ غرض سیناپتی کے علاوہ ڈیڑھ ہزار سپاہی موت کی نیند سو گئے۔

چار یوم کے بعد دھرم پور کے ہر گھر سے رونے اور پیٹنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

---

(۲۲)

راجہ گزشتہ چند مہینوں میں جے رام کی کامیابیوں کے متعلق نہایت حوصلہ افزا خبریں سن چکا تھا اور پروہت کئی بار اسے جتا چکا تھا کہ جے رام کو سیناپتی بنانے میں دیوتاؤں کی مرضی شامل تھی۔ وہ ہر نئی خوش خبری کے بعد راجہ کے سامنے اپنے یہ الفاظ دہراتا۔ "مہاراج! اگر آپ رام داس کو اس مہم پر بھیجتے تو اتنی شاندار کامیابیاں حاصل نہ ہوتیں۔"

راجہ نے تازہ شکست اور تباہی کا حال سن کر اپنے تمام درباریوں کی طرف جو اپنے کسی نہ کسی عزیز کی موت پر آنسو بہا رہے تھے، دیکھا اور اس شکست کی تمام ذمہ داری بدنصیب پروہت کے سر تھوپ دی۔ اس نے غضب ناک ہو کر کہا۔ "کہیے پروہت جی! اب دیوتاؤں کی کیا مرضی ہے؟ جس راجہ کے سر پر آپ

جیسا پروہت ہو اسے تخت و تاج چھوڑ کر کسی جنگل میں چلے جانا چاہیے۔ آپ نے ہمیشہ ایسی جگہ اپنی ٹانگ اڑائی جہاں دخل دینے کا آپ کو کوئی حق نہ تھا کہیے اب ان لوگوں کو کیا جواب دوں؟"

پروہت نے نادم سا ہو کر جواب دیا "مہاراج! بھگوان کی یہی مرضی تھی۔"

راجہ نے برہم ہو کر کہا۔ "خوب! بھگوان کی یہی مرضی تھی کہ اس کے دھرم کی رکھشا کے لیے لڑنے والے سپاہیوں کی قیادت ایک گدھے کے سپرد کر دی جائے۔ کیا بھگوان کی مرضی یہی تھی۔ کہ ہماری رعایا سے ہزاروں عورتیں بیوہ اور ہزاروں بچے یتیم ہو جائیں۔ نہیں، یہ بھگوان کی مرضی نہ تھی۔ ان سب کا پاپ تمہارے سر ہے۔"

پروہت نے ملتجی نگاہوں سے سرداروں کی طرف دیکھا۔ ایک سردار نے کہا۔ "مہاراج! اب آپس میں جھگڑنے کا وقت نہیں۔ دشمن سے انتقام لینے کا وقت ہے۔"

راجہ نے جھنجھلا کر جواب دیا۔ "کیسا انتقام؟ آج تم اپنے عزیزوں اور دوستوں کی تباہی کا حال سنتے ہو تو تمہارے سینوں میں انتقام کی آگ بھڑک اٹھتی ہے۔ لیکن میں تم سے پوچھتا ہوں کہ وہ لوگ جنہوں نے اپنی آنکھوں سے اپنی قوم کے بچوں، بوڑھوں اور عورتوں کو قتل ہوتے دیکھا تھا کب تک خاموش رہ سکتے تھے؟ کاش! تم سکھدیو کے مشورہ پر عمل کرتے اور ان لوگوں کو خواہ مخواہ دشمن بنانے کی بجائے ان کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاتے لیکن تم لوگ دشمن کے خون سے اپنی پیاس بجھانا چاہتے تھے اور دنیا میں کوئی انسان ایسا نہیں جو موقع آنے پر اینٹ کا جواب پتھر سے نہیں دیتا۔ جب موقع تمہارے ہاتھ آیا تو تم نے ان پر ہر طرح ظلم روا رکھا اور جب انہیں موقع ملا وہ تم پر رحم کیوں کرتے؟ وہ ایک مرتبہ رحم کر کے دیکھ چکے تھے۔ انہوں نے سکھدیو کو ڈوبنے سے بچایا، تم نے اس کا کیا صلہ دیا۔ سکھدیو کی رگوں میں ایک کھشتری کا خون تھا وہ دشمن کے احسان کا بدلہ ظلم سے کیسے دے

سکتا تھا۔ لیکن تم نے اور تمہارے پروہت نے اس کی ایک نہ سنی۔ اس پر طرح طرح
کے الزام تراشے گئے۔ اس کے لیے موت کی سزا تجویز کی گئی۔ یہ بھی دیوتاؤں
کی کرپا تھی کہ وہ جان بچا کر بھاگ گیا۔ لیکن تم میں سے کون ہے جو اس کی جگہ لے
سکتا ہے کیا وہ احمق جس نے پہاڑ کی چوٹی تک پہنچنے کے شوق میں ڈیڑھ ہزار
نوجوان ہلاک کروا دیئے اس قابل تھا کہ اسے سیناپتی بنایا جاتا؟"

سردار کو راجہ کی گرجتی ہوئی آواز نے خاموش کر دیا۔ لیکن پروہت کے لیے
یہ باتیں ناقابلِ برداشت تھیں۔ اس نے کہا:

"مہاراج! میں جانتا ہوں کہ اس خبر سے آپ کو بہت صدمہ پہنچا ہے۔
لیکن آپ نہیں جانتے کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ میں سکھدیو کا دشمن نہ تھا لیکن
دھرم کی حفاظت میرا فرض تھا۔ دھرم کسی کو نیچ ذات دشمن کے ساتھ اس قدر
گھل مل جانے کی اجازت نہیں دیتا۔ دھرم ایک کھشتری کو نیچ ذات لڑکی کے
ساتھ پریم کی اجازت نہیں دیتا۔ سکھدیو نے دھرم کی توہین کی اور دھرم کا
محافظ ہونے کی حیثیت سے میرا فرض تھا کہ اس کی سزا تجویز کروں۔ اگر وہ میرا
بیٹا بھی ہوتا تو بھی میں اس کے لیے بھگوان کو ناراض نہ کرتا۔"

راجہ نے کہا: "اگر اس کی سزا سے بھگوان خوش ہوتا تو وہ یقیناً جان بچا
کر نہ بھاگ جاتا۔"

پروہت نے کہا: "مہاراج ہو سکتا ہے کہ بھگوان نے اسے کسی زیادہ بڑی سزا
کے لیے زندہ رکھا ہو۔"

راجہ نے جھنجھلا کر کہا: "تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ بھگوان بھی کوئی تمہارے
جیسا ہے جو نہ بھولتا ہے اور نہ معاف کرتا ہے۔"

پروہت اس بات کا جواب سوچ رہا تھا کہ رام داس دربار میں داخل ہوا

اور اس کی پریشان صورت نے تمام حاضرینِ دربار کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔

رام داس نے کہا: "مہاراج! محل کے باہر بہت لوگ جمع ہو رہے ہیں آپ
تھوڑی دیر کے لیے باہر نکل کر انہیں تسلی دیں۔"

راجہ نے جواب دیا: "پروہت جی کو لے جاؤ۔ میں اپنی پرجا کو منہ نہیں دکھا
سکتا۔"

ایک بوڑھے سردار نے کہا: "مہاراج! جو ہوا سو ہوا آپ کو ایسی باتیں زیب
نہیں دیتیں۔ آپ ہمت کیجئے۔ دشمن سے بدلہ لینے کے لیے ہماری تلواریں حاضر
ہیں۔ بہادر بدنامی کے داغ آنسوؤں سے نہیں۔ خون سے دھوتے ہیں۔"

راجہ نے تلخ ہو کر کہا: "پھر وہی بات۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم بدلہ کیسے
لے سکتے ہو؟"

سردار نے کہا: "مہاراج! ہمارے پاس اب بھی دو ہزار سپاہی موجود ہیں۔
اور اگر ہم کوشش کریں تو اتنے اور جمع کر سکتے ہیں۔ ہماری شکست کی وجہ صرف
یہ تھی کہ دشمن نے دشوار گزار پہاڑیوں سے فائدہ اٹھایا ورنہ میدان میں ہمارا ایک
سپاہی ان سب کو بھیڑوں کی طرح ہانک سکتا ہے۔"

راجہ نے جواب دیا: "بہت اچھا۔ تم پروہت جی کو ساتھ لے جاؤ اور دشمن
سے التجا کرو کہ وہ پہاڑوں کو چھوڑ کر میدان میں آ جائے کیونکہ ہم اس سے بدلہ
لینا چاہتے ہیں اگر وہ تمہاری بات مان لے تو میری باقی فوج حاضر ہے ورنہ ان
پہاڑوں سے کہو کہ تمہارے راستے سے ہٹ جائیں۔"

سردار نے کچھ دیر سر جھکا کر سوچنے کے بعد کہا: "مہاراج! اگر آپ یہ سمجھتے
ہیں کہ یہ سب کچھ پروہت کی وجہ سے ہوا تو ہم آپ کو یقین دلاتے ہیں۔ کہ وہ
آئندہ ایسے معاملات میں دخل نہ دیں گے۔"

راجہ نے ذرا نرم ہو کر جواب دیا: "نہیں یہ کہنے سے پہلے پروہت جی سے مشورہ کر لینا چاہیئے تھا۔ مجھے ڈر ہے کہ یہ اپنی عادت تبدیل نہیں کریں گے۔"

بدنصیب پروہت کو اپنی جان چھڑانے کی تدبیر نظر آئی۔ اس نے کہا:

"مہاراج! میں وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ آپ کی کسی بات میں دخل نہ دوں گا۔"

راجہ کے لیے یہ ایک بہت بڑی فتح تھی۔ تخت نشینی سے لے کر اب تک اسے یہ تلخ احساس کھائے جا رہا تھا کہ حکومت کا صحیح اقتدار اس بڑی مونچھوں والے برہمن کے ہاتھ میں ہے اور اس کی حیثیت پروہت کے ہاتھوں میں ناچنے والی ایک کٹھ پتلی سے زیادہ نہیں اور اس کی ہر خواہش اور ہر ارادہ پروہت کی رضامندی کا محتاج ہے۔ پروہت کے اعترافِ شکست سے اس کے غصے کی آگ ٹھنڈی ہو گئی۔ اس نے اپنی مسرت کو چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا:

"شاید تم سمجھتے ہو کہ شکست نے مجھے بزدل بنا دیا ہے۔ نہیں میں دشمن پر فتح حاصل کروں گا۔ لیکن یہ فتح ایسی نہ ہو گی کہ دشمن چار ماہ کے بعد پھر سر اٹھانے کے قابل ہو سکے۔ میں ایک ایسی فتح حاصل کرنا چاہتا ہوں کہ دشمن صدیوں تک سر نہ اٹھا سکے۔ یاد رکھو! ہم تلواروں اور نیزوں کے بل بوتے پر دشمن کو ایک عرصہ کے لیے مغلوب رکھ سکتے ہیں لیکن اس پر دائمی غلبہ حاصل نہیں کر سکتے۔ ہماری ریاست میں ہزاروں اچھوت آباد ہیں۔ یہ لوگ بھی کسی زمانے میں ہمارے دشمنوں کی طرح آزاد تھے۔ اگر ہمارے باپ دادا بھی ایسے پروہتوں کی مرضی پر چل کر ان پر خواہ مخواہ ظلم کرتے تو یہ لوگ آج ہمارے پُرامن غلام نہ ہوتے۔ اگر ان کی جھونپڑیاں جلائی جاتیں یا ان کی عورتوں اور بچوں کو قتل کیا جاتا تو یہ بھی کہیں پناہ لے کر ہم سے انتقام لینے کی کوشش کرتے لیکن ہمارے بزرگوں نے ان لوگوں پر فتح حاصل کرنے کے

بعد ان پر ظلم کرنے کی بجائے انہیں اپنی پناہ میں رکھا۔ ان کو اپنے شہروں کے پاس بستیاں تعمیر کرنے کی اجازت دی اور یہ ان کے اسی سلوک کا نتیجہ ہے کہ آج یہ لوگ ہمیں اپنا دشمن سمجھنے کی بجائے ہماری غلامی میں فخر محسوس کرتے ہیں اور ہمیں اب یہ حق دیتے ہیں کہ ہم ان کے ساتھ جو سلوک چاہیں کریں۔ ہم انہیں کتوں کی طرح ذلیل سمجھتے ہیں لیکن انہیں اس بات کا احساس تک نہیں رہا۔ بار بار نشتر چبھو کر شاید انہیں ہم اپنے جیتے جاگتے دشمن بنا لیتے لیکن ہمارے بزرگوں کی تھپکیوں نے انہیں موت کی نیند سلا دیا ہے۔ میں اپنے نئے دشمن پر بھی اسی قسم کی فتح حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ اگر پروہت جی کچھ عرصہ خاموش بیٹھے رہے تو مجھے یقین ہے کہ اپنے اس مقصد میں کامیابی ہو گی۔"

راجہ کی مؤثر تقریر نے سب کو مسحور کر دیا اور تمام سردار یک زبان ہو کر اس کے تدبر کی تعریف کرنے لگے۔

بوڑھے سردار نے کہا: "مہاراج! اگر آپ کا یہ ارادہ ہے تو آپ جو جی میں آئے کیجیے ہم آپ کی باتوں میں کسی کا دخل برداشت نہیں کریں گے۔"

پروہت دربار سے اپنے اقتدار کا جنازہ نکلتا دیکھ رہا تھا لیکن اس میں لب ہلانے کی جرأت نہ تھی۔

راجہ نے سرداروں کی طرف سے مطمئن ہو کر پروہت کی طرف دیکھا اور کہا: "پروہت جی! مجھے یقین ہے کہ آپ کو بھی میرے خیالات سے اتفاق ہو گا۔"

پروہت نے جواب دیا: "بھگوان آپ کے ارادوں میں برکت دے۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ دھرم کی سیوا کریں اور میں آپ سے اختلاف رکھوں!"

راجہ نے رام داس کی طرف دیکھ کر کہا: "بہت اچھا رام داس! آج سے

تم میری فوج کے سیناپتی ہو تمہیں آج ہی دریا عبور کرنا ہوگا۔ شہر میں جس قدر فوج ہے لے جاؤ دشمن پہاڑوں سے نیچے اتر کر مقابلہ نہیں کرے گا۔ تم بھی فی الحال آگے بڑھنے کی کوشش نہ کرنا۔ دور کے اونچے پہاڑوں پر برف باری شروع ہو گئی تو دشمن خود بخود مجبور ہو کر نیچے اترے گا۔ لیکن تمہارا کام اسے نشتر چبھو کر بیدار کرنا نہیں۔ تھپکیاں دے کر سلانا ہے۔ میں تمہیں بہت بڑی ذمہ داری سونپ رہا ہوں۔"

رام داس نے راجہ کی طرف معنی خیز نگاہوں سے دیکھا اور کہا "مہاراج! مجھے معلوم ہے۔"

تھوڑی دیر بعد جب دربار برخاست ہوا تو راجہ نے رام داس کو وہاں ٹھہرا لیا اور کہا:

"ایک بات کا خاص خیال رکھنا اور وہ یہ ہے کہ کسی پروہت کو اپنے سر پر نہ چڑھا لینا۔ برہمنوں نے وہاں ابھی سے کالی دیوی کے مندر کی تعمیر شروع کر دی ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ دشمن کے کسی آدمی کا بلیدان ساری قوم کو پھر ایک بار ہمارے خلاف مشتعل کر دے۔ میں سیناپتی کے عہدہ کے علاوہ اس علاقے کی سرداری بھی تمہیں سونپتا ہوں۔"

نیا سردار

وقت گزرتا گیا۔ سکھدیو کو ان لوگوں کے درمیان ہر طرح کا آرام میسر تھا۔ دنیا کی ہر وہ نعمت جس کی اس سادہ اور معصوم ماحول میں تمنا کی جا سکتی تھی قدرت نے اسے عطا کر رکھی تھی۔ سماج کے خلاف نفرت اور حقارت کا جو طوفان وہ اپنے دل میں لے کر آیا تھا آہستہ آہستہ ٹھنڈا پڑ گیا اور اس کے دل میں وہ امنگیں، وہ ارادے اور وہ ولولے جو ایک زبردست اور انصاف پسند طاقت کے تخیل نے پیدا کیے تھے زندگی کی بڑھتی ہوئی دلچسپیوں میں دب کر رہ گئے۔

سکھدیو کے دماغ سے مساواتِ انسانی کے اصول پر ایک نئی دنیا بسانے کا خیال مٹ چکا تھا اور اس کی تمام آرزوئیں اور تمنائیں ایک کمسن لڑکے اور ایک ننھی لڑکی تک محدود ہو کر رہ گئی تھیں۔ سکھدیو نے لڑکے کا نام مادھو اور لڑکی کا نام شانتا تجویز کیا تھا۔

کنول مادھو کو اٹھا کر بار بار سینے سے لگاتی اور سکھدیو سے کہتی "دیکھیے! اس کی شکل بالکل آپ سے ملتی ہے۔"

سکھدیو، شانتا کو گود میں لے کر بیٹھ جاتا اور اس کی طرف محبت بھری نگاہوں سے دیکھ کر کہتا "دیکھو کنول! اس کی ناک، اس کی آنکھیں، اس کی پیشانی اور اس کے ہونٹ بالکل تمہاری طرح ہیں۔"

بدھو گھر آتا تو مادھو بھاگ کر اس کی ٹانگوں سے لپٹ جاتا۔ شانتا جو

اس سے دو سال چھوٹی تھی اور ابھی چل پھر بھی نہ سکتی تھی۔ زمین پر بیٹھے بیٹھے "چا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ چا" کہہ کر ہاتھ پھیلا دیتی۔ وہ ان دونوں کو اٹھا کر چارپائی پر بیٹھ جاتا انہیں خوش کرنے کے لیے بنسری بجاتا اور ہنسانے کے لیے بکری، گیدڑ اور بھیڑیوں کی بولیاں بولتا۔ اور وہ جواب میں اس کے کان پکڑ کر کھینچتے اور بال نوچتے کنول ہر بار کہتی۔ "بھیا بدھو! تم انہیں شریر بنا دو گے۔" اور وہ ہر بار ہنس کر یہ جواب دیتا۔ "بہن کنول! بچے شریر ہی اچھے ہوتے ہیں۔ میں خود بھی اس عمر میں بڑا شریر تھا۔"

موتی آتا اور مادھو کو اپنے گھر لے جاتا اور جب مادھو اس کے گھر میں کھیل کود سے اکتا جاتا تو خود ہی آ کر چھوڑ جاتا۔

آٹھ سال کی عمر میں مادھو ایک گدھے پر سوار ہو کر سکھدیو اور بدھو کے ساتھ باہر چلا جاتا اور شام تک ان کے ساتھ چراگاہوں میں گھومتا پھرتا۔

بدھو اسے جھیل میں تیرنے، درختوں پر چڑھنے اور بانسری بجانے کی تعلیم دیا کرتا تھا اور سکھدیو اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی کمان دے کر اسے تیر اندازی سکھایا کرتا۔ شانتا اپنی ہم عمر لڑکیوں کے ساتھ جھیل کے کنارے جھولا جھولا کرتی تھی۔

---

(۲)

موتی بہت بوڑھا ہو چکا تھا اور اکثر بیمار رہتا۔ بیماری کی حالت میں جہاں تک اس سے ہو سکا سرداری کے فرائض پورے کرتا رہا اور جب طاقت جواب دینے لگی تو بہت سے معاملات میں سکھدیو سے مدد لینے لگا۔

تمام بستیوں کے چرواہوں نے اپنی اپنی حدود مقرر کر رکھی تھیں، اور ماہی گیروں نے بھی شکار کے لیے جھیل کو آپس میں تقسیم کر رکھا تھا۔ کھیتی باڑی کرنے والے ان لوگوں میں بہت کم تھے اور ان کے آپس میں جھگڑے بھی کم ہوتے تھے لیکن چرواہوں اور ماہی گیروں کے درمیان کبھی نہ کبھی چراگاہوں اور شکارگاہوں کی تقسیم پر جھگڑا ہو جاتا اور تمام سردار اپنی اپنی بستی کے لوگوں کی حمایت کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے۔ اس قسم کے تمام مقدمات میں موتی کا فیصلہ آخری فیصلہ سمجھا جاتا۔ جب کام کرنے کی ہمت نہ ہوتی تو وہ ایسے معاملات سکھدیو کے سپرد کر دیتا۔

سکھدیو کی انصاف پسندی اور معاملہ فہمی عوام کو اس کا گرویدہ بنا چکی تھی لیکن دوسری بستیوں کے بعض سردار جو موتی کے بعد بڑا سردار بننے کا خواب دیکھ رہے تھے۔ سکھدیو کے خلاف اپنے دلوں میں حسد اور بغض کے جذبات پرورش پا رہے تھے۔ ان سرداروں میں سے رامو اثر و رسوخ کے لحاظ سے موتی سے دوسرے درجے پر تھا اور وہ اپنی زندگی کے ایک بلند مقصد کے حصول کے لیے ان لوگوں کا سردار بننے کے لیے بے قرار تھا اور نہایت بے تابی سے موتی کی موت کا انتظار کر رہا تھا۔ اسے یہ بھی یقین تھا کہ دوسرے سردار اس کے مقابلے میں سر نہیں اٹھائیں گے لیکن سکھدیو کی طرف سے اسے اطمینان نہ تھا۔

سکھدیو کے دل میں موتی کا جانشین بننے کا خیال تک نہ تھا وہ محض موتی کی مجبوری کا لحاظ کرتے ہوئے اس کا ہاتھ بٹا رہا تھا۔

زندگی کے آخری ہفتوں میں موتی کی بے چارگی کا یہ عالم تھا کہ اس کے لیے کسی سہارے کے بغیر بستر سے اٹھ کر بیٹھنا بھی محال تھا۔ لوگ جوق در جوق اس کی عیادت کے لیے آتے۔ کنول اور سکھدیو کو ہر وقت اس کے قریب د

کران میں سے اکثر ان کی عملی ہمدردی کے قائل ہوتے لیکن چند لوگ، جو رامو کے ہم خیال تھے اسے صرف ظاہرداری سمجھتے۔

سکھدیو، رامو کے متعلق یہ سن چکا تھا کہ اس کا باپ موتی سے پہلے ان لوگوں کا بڑا سردار تھا۔ باپ کی موت کے بعد لوگوں نے رامو کو اپنا سردار بنانے کا فیصلہ کیا تھا لیکن جس روز یہ فیصلہ ہُوا اس سے اگلی رات رامو نے ایک چرواہے کی بیوی کی عصمت پر حملہ کرنے کی کوشش کی اور اس کی چیخ پکار سے بستی کے لوگ جمع ہو گئے۔ اگلے روز سرداروں کی پنچایت نے اسے دس سال کے لیے جلاوطن کر دیا اور موتی کو اپنا سردار منتخب کر لیا۔ رامو نے جلاوطنی کے دس سال کہاں گزارے، یہ کسی کو علم نہ تھا لیکن دس سال کے بعد وہ جب واپس لوٹا۔ یہ لوگ پرانی رنجش بھول گئے۔ موتی نے بھی اس کا قصور معاف کر دیا اور ایک چھوٹی سی بستی کے سردار کی موت کے بعد اسے سردار بنا دیا۔

رامو جب کبھی سکھدیو سے ملتا۔ دیویوں اور دیوتاؤں کے قصے لے بیٹھتا سکھدیو اس کی باتوں سے یہ محسوس کرتا تھا کہ وہ اپنی جلاوطنی کے زمانے کا کچھ حصہ اونچی ذات والوں کے کسی شہر کے قریب گزار چکا ہے۔ رامو سماج کے بڑے بڑے دیوتاؤں کے نام جانتا تھا اور ان کا احترام بھی کرتا تھا۔ ان لوگوں میں رامو ہی ایک ایسا شخص تھا جس نے سکھدیو کی داستان نہایت انہماک کے ساتھ سنی اور اختتام پر سکھدیو کے خیالات کی عظمت کا اعتراف کرنے کی بجائے اس کی بدنصیبی پر افسوس ظاہر کیا اور کہا "سکھدیو! افسوس تم آسمان کی بلندی سے زمین کی پستی پر آ گرے ہو۔ . . تم بدنصیب ہو۔"

آس پاس کی بستیوں میں رامو کی بہت شہرت تھی۔ وہ عجیب و غریب کہانیاں سنا کر سادہ دل چرواہوں کو اپنا گرویدہ بنا چکا تھا۔ یہ لوگ ہر عجیب شے

کی طرف متوجہ ہونے کے عادی تھے لیکن سکھدیو کی آمد کے بعد رامو یہ محسوس کرنے لگا، کہ اس کے ساتھ لوگوں کی دلچسپی کم ہو رہی ہے۔ شام کے وقت عورتوں اور مردوں کی مجلس میں اپنی کہانیوں کی بجائے سکھدیو اور کنول کے متعلق نئے نئے افسانے سُن کر اس کے دل میں حسد اور انتقام کی آگ بھڑک اٹھتی۔ موتی اگرچہ بیماری اور بڑھاپے سے لاغر ہو چکا تھا تاہم اس کے ساتھ لوگوں کی عقیدت میں فرق نہیں آیا تھا اس لیے سردار کو ہر بات میں سکھدیو کی حمایت کرتے دیکھ کر رامو کو سکھدیو کے ساتھ کھُلی دشمنی کی جرأت نہ ہوتی تاہم اسے اطمینان تھا کہ سردار کی موت کے بعد اسے اپنے راستے سے یہ پتھر ہٹانے میں دقت پیش نہیں آئے گی۔

کئی ہفتے زندگی اور موت کی کش مکش میں مبتلا رہنے کے بعد بوڑھا سردار ایک شام چل بسا۔

---

(۲۲)

صبح ہوتے ہی تمام بستیوں کے لوگ اپنے اپنے سرداروں سمیت موتی کی موت پر اظہارِ افسوس اور نئے سردار کے انتخاب کے لیے پیپل کے درختوں کے درمیان ایک چبوترے پر بیٹھ گئے۔ کچھ دیر مرنے والے کی خوبیاں بیان ہوئیں اور اس کے بعد نئے سردار کے انتخاب کے متعلق بحث چھڑ گئی۔ چند سرداروں نے یک زبان ہو کر رامو اور چند نے سکھدیو کا نام پیش کیا۔ رامو کے طرف دار یہ کہتے تھے کہ وہ ہماری قوم کا آدمی ہے۔ اس کے باپ دادا سردار تھے۔ اس لیے اس کا حق کسی غیر کو نہیں دیا جا سکتا۔ سکھدیو کے طرف دار یہ کہتے تھے کہ جو خوبیاں اس میں ہیں وہ رامو میں نہیں۔ وہ بڑے راجہ کی فوجوں کا سردار رہ چکا ہے۔ وہ

حکومت کرنا جانتا ہے اس کو سردار بنا کر ہم بہت سکھ پائیں گے۔"

آہستہ آہستہ یہ بحث سرداروں کی مجلس سے نکل کر عوام تک پہنچ گئی۔ سرداروں میں سب سے زیادہ رامو اور عوام میں سب سے زیادہ بدھو کی آواز بلند تھی۔ بدھو صرف اتنا جانتا تھا کہ سکھدیو کے سوا اور کوئی شخص سردار ہو ہی نہیں سکتا۔ سرداروں کا جرگہ اس کے لیے بے معنی تھا۔ ادھر سرداروں میں سے کسی نے سکھدیو کا نام لیا اور اس کے منہ سے بے اختیار نکل گیا: "ہمارا سردار سکھدیو ہے۔ سکھدیو! سکھدیو!!"

سکھدیو کے طرف دار اس کے ساتھ شامل ہو گئے اور چاروں طرف سے سکھدیو کے حق میں نعرے بلند ہونے لگے۔

رامو کے حامیوں نے بھی زبان کی تلواریں بے نیام کیں۔ لیکن وہ تعداد میں کم تھے اور ان کی آواز بدھو کا ساتھ دینے والوں کے نعروں میں دب کر رہ گئی۔ رامو نے اٹھ کر ان سے سرداروں کے فیصلے تک خاموش رہنے کی درخواست کی لیکن ان پر کوئی اثر نہ ہوا۔ رامو نے دونوں ہاتھ بلند کیے اور اونچی آواز میں کہا:

"بھائیو! ہم جانتے ہیں کہ تم سکھدیو کو اپنا سردار بنانا چاہتے ہو لیکن میری بات سنو۔ میرے خیال میں سکھدیو ایک اچھا آدمی ہے لیکن وہ ہماری قوم کا نہیں ہم اس بات کا فیصلہ کر رہے ہیں کہ ایک غیر قوم کا آدمی ہمارا سردار ہو سکتا ہے یا نہیں جب تک یہ فیصلہ نہیں ہوتا تم صبر کرو۔ تم یہ اطمینان رکھو کہ ہم سب سکھدیو کی عزت کرتے ہیں لیکن اگر سرداروں نے یہ فیصلہ کر دیا کہ دوسری قوم کا آدمی ہمارا سردار نہیں ہو سکتا تو تمہیں اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں۔"

لوگ بیٹھ گئے اور سرداروں کی بحث شروع ہو گئی۔ عوام کی طرح سرداروں کی اکثریت بھی سکھدیو کے حق میں تھی جب رامو کے ساتھی چاروں طرف سے مایوس

ہو کر گالی گلوچ پر اتر آئے تو سکھدیو کے حامیوں نے اس کے جواب میں لاٹھیاں اٹھا لیں۔ یہ حالت دیکھ کر سکھدیو جو ابھی تک ایک طرف کھڑا تھا لوگوں کو ادھر ادھر ہٹاتا ہوا آگے بڑھا اور چبوترے پر چڑھ کر کھڑا ہو گیا۔

"بھائیو! اس نے بلند آواز میں کہا۔ "مجھے ڈر ہے کہ تم اس شخص کے لیے لڑ رہے ہو جسے تمہارا سردار بننے کا خیال تک نہیں۔ میں تمہارے پاس ایک بے یار و مددگار مسافر کی حیثیت میں آیا تھا تم نے مجھے رہنے کو گھر دیا۔ کھانے پینے کی تمام چیزیں دیں تم نے ہمیشہ مجھے اپنا بھائی سمجھا لیکن میں یہ نہیں بھولا کہ میں اس بستی میں ایک غریب مسافر ہوں۔ میرے بھائی رامو اور کئی اور دوستوں کا یہ خیال ہے کہ مجھے تم لوگوں کا سردار بننے کی ہوس ہے لیکن یہ ان کی بھول ہے میں پہلے بھی تمہارا خادم تھا اور اب بھی۔ مجھ میں کوئی فرق نہیں آیا۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ تم میرے لیے آپس میں لڑو۔ تمہاری بہتری اسی میں ہے کہ تم اپنی قوم میں سے کسی کو سردار بنا لو۔ میں ایک مسافر ہوں اور ضروری نہیں کہ تمام عمر اسی جگہ گزاروں۔"

سکھدیو کی تقریر کا آخری فقرہ سن کر بعض لوگوں کی آنکھیں پرنم ہو گئیں۔

ایک بوڑھے سردار نے اٹھ کر کہا "ہم آپ کو کبھی نہیں جانے دیں گے اگر آپ ہمارا سردار بننے سے انکار کرتے ہیں تو اپنی مرضی سے کسی اور کو سردار بنا دیں۔ ہم سب اس کا حکم مانیں گے۔"

اکثر سرداروں نے اس بات کی تائید کی۔ سکھدیو نے یکے بعد دیگرے تمام سرداروں کی طرف دیکھا اور اس کی نگاہ رامو پر رک گئی۔ رامو کے دل کی بے چینی بڑھنے لگی۔ سکھدیو مسکرایا اور کہنے لگا:

"بھائیو! اگر تمہیں میرا فیصلہ منظور ہو تو رامو کو اپنا سردار بنا لو۔"

تمام سرداروں نے سکھدیو کے فیصلے کے سامنے سر جھکا دیا۔ رامو

کے سر پر سرداری کی پگڑی باندھی گئی لیکن وہ اپنے دل میں یہ محسوس کر رہا تھا کہ کامیابی کا سہرا سکھدیو کے سر ہے۔ وہ لوگوں کے جسم پر حکومت کر سکے گا لیکن ان کے دلوں پر بدستور سکھدیو کا قبضہ رہے گا۔ سکھدیو کی طرف سے ایثار اور مروت کے چھینٹے اس کے دل سے حسد کی آگ نہ بجھا سکے۔

رامو کی سرگزشت

رامو نے ایک سال کے اندر اندر یہ ثابت کر دیا کہ ان لوگوں کو اس سے بہتر سردار نہیں مل سکتا تھا۔ اس کی سرداری کا زمانہ ان لوگوں کے لیے ایک نئے دور کی ابتدا تھی وہ ماہی گیری اور گلہ بانی کی نسبت کاشت کاری کو زیادہ پسند کرتا تھا چنانچہ اس کی اَن تھک کوششوں سے جھیل کے کنارے سے لے کر دریا کے ساحل تک کے ایک وسیع علاقے میں جنگلی درختوں کی بجائے لہلہاتی کھیتیاں نظر آنے لگیں اور ان لوگوں میں بھیڑ بکریوں کی جگہ گائیں پالنے کا شوق بڑھنے لگا رامو کو گھاس پھونس کی جھونپڑیوں سے نفرت تھی اس لیے اس نے اپنی قوم کو مٹی کے گھر بنانے کی ترغیب دی۔ چنانچہ تھوڑے ہی عرصے میں بعض لوگ جھونپڑیوں سے نکل کر مٹی کے کشادہ مکانوں میں آباد ہونے لگے۔ لیکن اکثر نے اس معاملے میں رجعت پسندی کا ثبوت دیا۔

سکھدیو یہ سب کچھ ایک پُرامن تماشائی کی حیثیت سے دیکھتا اور کسی بات میں مداخلت نہ کرتا۔ موتی کی موت کے بعد ان لوگوں کے سیاسی معاملات میں اس کی تمام دلچسپیاں ختم ہو چکی تھیں۔ لوگ بدستور اس کے پاس آتے اور رامو کی نئی نئی اصلاحات کے متعلق اس کی رائے دریافت کرتے وہ انہیں صرف اتنا کہہ کر ٹال دیتا کہ تمہارا سردار جو کچھ کر رہا ہے اچھا کر رہا ہے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آہستہ آہستہ سکھدیو کے ساتھ ان کی دلچسپی کم

ہونے لگی اور وہ راموکی نئی نئی اصلاحات کی طرف توجہ دینے لگے۔ رامونے مہذب سماج کی ترقی کے افسانے سنا سنا کر ان لوگوں میں نئی امنگیں اور ولولے بیدار کر دیے اور لوگ اپنی موجودہ زندگی کو قابلِ رحم محسوس کرتے ہوئے اس کے اشاروں پر چلنے لگے۔

سکھدیو دیر تک یہی خیال کرتا رہا کہ راموا اپنی جلاوطنی کے زمانے میں کسی شہر میں اونچی ذات والوں کو عیش و آرام سے زندگی بسر کرتے دیکھ کر بہت زیادہ متاثر ہو چکا ہے اور وہ ان لوگوں کی حالت بہتر بنانے کی فکر میں ہے لیکن ایک دن رامونے اس پر اپنے تمام ارادے ظاہر کر دیے اور سکھدیو کو اپنی زندگی کے پُرسکون سمندر میں کسی نئے طوفان کے آثار نظر آنے لگے۔

---

(۲)

دوپہر کے وقت سکھدیو اور بدھو جھیل کے کنارے ایک درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے تھے مادھو جھیل میں نہا رہا تھا۔ آس پاس بکریاں اور بھیڑیں چر رہی تھیں۔ بدھو نے دُور سے گدھے پر ایک سوار کو اپنی طرف آتا دیکھ کر کہا: "بھیا! وہ دیکھو۔ شاید راموآ رہا ہے۔"

سکھدیو نے بدھو کے اشارے پر اس طرف نظر دوڑائی اور دور سے رامو کو پہچان کر بولا۔

"شاید آج اسے کوئی نئی بات سوجھی ہے۔"

راموقریب پہنچ کر گدھے سے اترا اور سکھدیو کے قریب بیٹھتے ہوئے بولا "بھائی! میں صبح سے تمہیں تلاش کر رہا ہوں۔"

سکھدیو نے پوچھا "کوئی خاص کام تھا؟"

میں تم سے ایک مشورہ کرنا چاہتا تھا۔

"کس کے متعلق؟"

رامو نے بدھو کی طرف دیکھا اور کہا "بدھو! میں سکھدیو سے ایک خاص بات کرنا چاہتا ہوں۔ تم ذرا دوسرے درخت کے نیچے چلے جاؤ۔"

راموا اور سکھدیو کچھ دیر خاموش بیٹھے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے

بالآخر رامو نے کہا:

"بھائی! تم جانتے ہو کہ میں اپنے لوگوں کی موجودہ حالت سے خوش نہیں ہوں اور مدت سے ان لوگوں کی حالت بہتر بنانے کے طریقے سوچ رہا ہوں۔ مجھے یہ دیکھ کر بہت دُکھ ہوتا ہے کہ ہماری قوم کے ہزاروں انسان پہاڑوں، جنگلوں اور ویرانوں میں مارے مارے پھرتے ہوں اور اس ملک کے زرخیز اور شاداب میدانوں پر اونچی ذات والوں کا قبضہ ہو۔"

سکھدیو نے جواب دیا "اس بات کا مجھے بھی دکھ ہے۔

"میں جانتا ہوں کہ آپ کو ہماری قوم سے بہت ہمدردی ہے لیکن آج تک آپ نے ان لوگوں کی حالت بہتر بنانے کی کوئی تدبیر نہیں نکالی۔"

سکھدیو نے کہا "اس کا علاج صرف یہ ہے کہ آپ کی قوم کے وہ تمام گروہ جو دُور دُور تک پھیلے ہوئے ہیں ایک جگہ جمع ہو جائیں اور اونچی ذات والوں سے جنگ کر کے اپنے کھوئے ہوئے حقوق واپس لیں لیکن ان بکھرے ہوئے دانوں کو ایک لڑی میں پرونا میرے یا آپ جیسے کسی انسان کا کام نہیں اس قوم کے بہت تھوڑے لوگ ایسے ہیں جنہیں اپنی بدحالی کا احساس ہے لیکن لاکھوں ایسے ہیں جو ہندو سماج کے سائے میں ایک ذلیل زندگی بسر کرنے

کے باوجود خوش ہیں اور وہ اپنے کھوئے ہوئے حقوق کے لیے جنگ کرنے کا خیال
بھی پاپ سمجھتے ہیں۔"

رامو نے جواب دیا "میں یہ نہیں چاہتا کہ سماج والوں سے جنگ کی جائے
مجھے یقین ہے کہ ہم تمام مل کر بھی ان پر فتح حاصل نہیں کر سکتے کیونکہ وہ لوگ دیوتاؤں
کی پوجا کرتے ہیں اور یہ طاقتور دیوتا اپنے پجاریوں پر کسی کو غالب نہیں آنے دیں گے۔
آپ اگر ان دیوتاؤں پر یقین نہیں رکھتے تو اور بات ہے لیکن آج میں آپ کے
سامنے اپنی زندگی کا وہ واقعہ بیان کرتا ہوں جو آج تک میں نے کسی اور کو نہیں سنایا۔

آپ یہ سن چکے ہیں کہ ان لوگوں نے مجھے جلاوطن کر دیا تھا۔ میں نے چند
مہینے اپنی قوم کے چرواہوں کی مختلف بستیوں میں چکر لگانے کے بعد دریائے
راوی عبور کیا اور کئی دن سفر کر کے ایک بستی میں پہنچا۔ اس بستی کے قریب اونچی
ذات والوں کا ایک بڑا شہر آباد تھا۔ بستی کے لوگ ہماری قوم سے تعلق رکھتے
تھے لیکن وہ اونچی ذات والوں کے غلام تھے اور شودر کہلاتے تھے۔ ان کی
زندگی ہمارے کتوں کی زندگی سے زیادہ ذلیل تھی۔ ان کے کتے اونچی ذات والوں کے
شہر میں جا سکتے تھے لیکن انہیں یہ اجازت نہ تھی۔ دور سے شہر والوں کے خوبصورت
محل اور اونچے اونچے مندر دیکھ کر میرے دل میں ان لوگوں کے حالات معلوم کرنے
کا شوق پیدا ہوا اور میں نے اس بستی میں ڈیرا ڈال دیا۔ کچھ عرصہ اس جگہ رہ کر مجھے معلوم
ہوا کہ پڑوس کا شہر آباد ہونے سے کئی برس پہلے اس جگہ ان لوگوں کی بہت سی بستیاں
آباد تھیں۔ چراگاہیں بہت اچھی تھیں۔ یہ لوگ آرام کی زندگی بسر کرتے تھے لیکن
ایک دفعہ اونچی ذات والوں کا ایک قافلہ آیا اور اس زمین کی زرخیزی اور شادابی
دیکھ کر اسی جگہ آباد ہو گیا۔ چند برسوں میں انہوں نے تمام قابلِ کاشت زمین ان لوگوں
سے چھین لی اور ان کے لیے جنگل کا کچھ علاقہ چھوڑ دیا۔ ان میں سے اکثر اونچی

ذات والوں کے مظالم سے تنگ آ کر کہیں دور جا آباد ہوئے لیکن بعض اپنے آباؤ اجداد
کی جنم بھومی سے چمٹے رہے۔

اونچی ذات والوں کا گاؤں بڑھتے بڑھتے ایک شہر بن گیا اور ان لوگوں
کی تمام بستیاں اجڑتے اجڑتے ایک بستی رہ گئی۔ یہ بستی بھی اجڑ جاتی لیکن شہر
والوں کو برسات کے پانی کا سیلاب روکنے کے لیے کبھی کبھی ان لوگوں کی خدمات
کی ضرورت پڑتی تھی اس لیے شہر کے راجہ نے یہ حکم دے دیا کہ کوئی شودر اس
بستی سے بھاگنے کی کوشش نہ کرے اگر کوئی جانا چاہے تو اسے اپنے ساتھ مویشی
لے جانے کا حق نہیں۔ یہ حکم سن کر چند آدمیوں نے رات کے وقت فرار ہونے کی
کوشش کی لیکن راجہ کے سپاہیوں کو خبر ہو گئی اور انہیں تعاقب کر کے گرفتار کر
لیا گیا۔ دو تین نوجوان جنہوں نے لڑ بھڑ کر نکل جانے کی کوشش کی انہیں کالی دیوی
کے مندر میں لے جا کر قتل کیا گیا۔ جو باقی تھے ان کا قصور اس شرط پر معاف کر دیا گیا
کہ وہ آئندہ ایسی حرکت نہیں کریں گے۔

اونچی ذات والوں کی نظر میں یہ لوگ ان جانوروں کا درجہ رکھتے تھے جنہیں
ہم ضرورت کے وقت شکار کر لیتے ہیں لیکن ان کی نسل کو ختم کر دینا پسند نہیں کرتے
سال میں ایک دو مرتبہ ان لوگوں میں سے کوئی نہ کوئی کسی اونچی ذات والے کی پوتر زبان
سے کوئی بھجن سن لینے یا سورج نکلنے سے پہلے اسے منہ دکھانے کے جرم میں گرفتار
کر لیا جاتا اور کالی دیوی کو خوش کرنے کے لیے اس کا بلیدان کر دیا جاتا۔

میں نے ان لوگوں کو اونچی ذات والوں کے خلاف بغاوت کے لیے اکسانے
کی کوشش کی لیکن مجھے یہ معلوم ہوا کہ یہ لوگ ان سے نہیں بلکہ ان کے دیوتاؤں
سے ڈرتے ہیں ان لوگوں کی زبانی دیوتاؤں کی طاقت کے متعلق عجیب و غریب
کہانیاں سن کر میرے دل پر دیوتاؤں کا رعب بیٹھنے لگا مجھے اس بات کا یقین

ہونے لگا کہ یہ لوگ چونکہ دیوتاؤں کی پوجا کرتے ہیں اور ان کے سامنے قربانیاں پیش
کرتے ہیں اس لیے وہ ان کی مدد کرتے ہیں۔ اگر ہم ایسا کرتے تو وہ یقیناً ہمارا ساتھ
بھی دیتے مجھے یہ خیال بھی آیا کہ شاید ہماری قوم بھی کسی زمانے میں ان دیوتاؤں کی
پوجا کرتی ہو اور اب انہیں بھلا دینے کی سزا بھگت رہی ہو کئی دن سوچنے کے بعد
میرے دل میں سماج کے زبردست دیوتاؤں کو دیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی اور میں
ایک رات خواب میں دیوتاؤں کی عجیب و غریب صورتیں دیکھنے کے بعد آنکھ کھلتے
ہی دیوتاؤں کے قدموں تک پہنچنے کے راستے میں تمام خطرات اور رکاوٹوں کی
پروا نہ کرتے ہوئے شہر کے مندر کی طرف چل دیا۔

---

(۳)

ہر قدم پر میں یہ محسوس کر رہا تھا کہ میری بھٹکی ہوئی قوم میرے پیچھے آ رہی
ہے اور بڑے بڑے دیوتا میری التجائیں سننے اور میری قوم کے پچھلے گناہ معاف
کرنے کے لیے تیار کھڑے ہیں۔ پچھلے پہر کا چاند نمودار ہو رہا تھا۔ راستے میں مجھے
کئی بار خیال آیا کہ واپس لوٹ جاؤں لیکن میری ہمت نے میرے عزم کا ساتھ دیا
اور میں ٹھہر ٹھہر کر سوچتا اور رک رک کر چلتا ہوا مندر کے قریب جا پہنچا۔

مندر سے باہر ایک کھلے میدان میں چند آدمی جو شاید مندر کے رکھوالے
تھے گہری نیند میں خراٹے لے رہے تھے۔ میں نے دبے پاؤں مندر کے دروازے
کے قریب پہنچ کر اندر جھانکا۔ ٹمٹماتے ہوئے چراغ کی دھیمی روشنی میں مجھے عجیب و
غریب صورتیں نظر آئیں۔ میں گھبرا کر پیچھے ہٹا اور چاہتا تھا کہ بھاگ جاؤں لیکن
کوئی زبردست طاقت مجھے آگے دھکیل رہی تھی اور میں ڈرتے ڈرتے مندر کے

وسیع کمرے میں داخل ہو گیا۔

کچھ دیر بدحواس ہو کر دیوتاؤں کی عجیب و غریب مورتیوں کی طرف دیکھتا
رہا۔ میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ ان دیوتاؤں میں سے کسی کے پاؤں پر سر رکھوں کہ
اچانک میری نظر مندر کی بائیں دیوار کی طرف جا پڑی اور میں ٹھٹک کر رہ گیا۔ سیاہ
پتھر کے ایک چبوترے پر چند معمولی پتھر کی مورتیوں کے درمیان سنگِ مرمر کی
ایک خوبصورت مورتی نصب تھی اس کے گلے میں مرجھائے ہوئے پھولوں
کے ہار تھے اور پاؤں پر بھی پھولوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ میں فوراً سمجھ گیا کہ یہی
سماج والوں کا بھگوان اور یہی ان کی ترقی کا راز ہے۔ یہی وہ زبردست طاقت
ہے جو اپنی پوجا کرنے والوں کو رہنے کے لیے خوب صورت محل اور کھیتی باڑی
کے لیے زرخیز زمین دیتی ہے یہی وہ دیوتا ہے جس سے دور رہ کر ہم دنیا کی
تمام نعمتوں سے محروم ہیں۔

میں اس دیوتا کے پاؤں پر سر رکھ کر اپنی بھٹکی ہوئی قوم کے لیے رحم کی
درخواست کرنا چاہتا تھا لیکن میرے دل میں ایک نیا خیال آیا اور یہ خیال
اچانک ایک خوفناک ارادے میں تبدیل ہو گیا۔ میں نے سوچا کہ اس دیوتا کے سامنے
میری دعا میری قوم کے گناہ معاف نہیں کرا سکتی۔ سب کی بھلائی کے لیے سب
کی دعاؤں کی ضرورت ہے لیکن میری طرح سب اس مندر میں نہیں آ سکتے مگر میں
اس دیوتا کی مورتی کو آسانی سے اٹھا کر لے جا سکتا ہوں۔ میری قوم کو اس کی
ضرورت ہے وہ سماج کے شہر سے دور اس کے لیے ایک نیا مندر بنا سکتی ہے۔
دریا کے کنارے پھولوں کی کمی نہیں۔ ہم مرجھائے ہوئے پھولوں کی بجائے
ہر وقت تازہ پھول اس دیوتا پر نچھاور کرتے رہیں گے اور دن رات اس کی
پوجا کریں گے۔

سماج کے مندروں میں دیوتاؤں کی کمی نہیں وہ ایسی مورتیاں بنانا جانتے ہیں اور بنالیں گے ۔ صبح ہونے والی تھی اور زیادہ سوچنے کا موقع نہ تھا میں نے آگے بڑھ کر دیوتا کے سامنے ہاتھ باندھ کر نہایت عاجزی سے کہا۔

"بھگوان! میں چوری کر رہا ہوں لیکن تو جانتا ہے میری نیت بُری نہیں میں تجھے ہمیشہ خوش رکھوں گا میری قوم کو تیری ضرورت ہے۔"

یہ کہہ کر میں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے مورتی کو ٹٹولنا شروع کیا۔ اسے ہلا کر دیکھا وزن زیادہ نہ تھا میں نے دل مضبوط کیا اور مُورتی کو اٹھا کر کندھے پر رکھ لیا۔ ٹمٹماتا ہُوا چراغ بجھنے کو تھا میں نے جلدی جلدی چند قدم اٹھائے لیکن جونہی میں نے مورتی اٹھائی اس کا سر چھت سے لٹکنے والی گھنٹیوں کے ساتھ جن کا میں نے بدحواسی کی وجہ سے خیال نہیں کیا تھا ٹکرایا اور کمرے میں ٹن ٹن کی مہیب آواز گونج اٹھی میرا دل دہل گیا اور میں بدحواس ہو کر بھاگا لیکن میرا پاؤں دہلیز کے ساتھ ٹکرایا اور میں دیوتا سمیت منہ کے بل آگرا اس کے بعد مجھے معلوم نہیں کہ کیا ہُوا۔ جب ہوش آیا تو میں نے دیکھا کہ میں اونچی ذات کے سینکڑوں مردوں اور عورتوں کے درمیان ایک کھلے میدان میں پڑا ہوں۔ میرے تمام کپڑے خون سے لہولہان ہیں اور میرے پاؤں مضبوط رسیوں سے جکڑے ہوئے ہیں۔ میں سماج والوں کی قید میں تھا۔ وہ غضب ناک نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ میں نے گھبرا کر آنکھیں بند کرلیں۔ لیکن میرے کان ہزاروں زبانوں سے مندر۔ مورتی۔ اچھوت۔ پاپی اور مہاپاپی کے الفاظ سُن رہے تھے۔

میں دیر تک آنکھیں بند کیے پڑا رہا۔ پیاس سے میرا گلا خشک ہو رہا تھا۔ میں نے آنکھیں کھول کر پانی مانگنا چاہا لیکن کسی نے زور سے کہا "اچھوت! کتّا ابھی زندہ ہے" اور مجھے پانی مانگنے کی جرأت نہ ہوئی۔

شام تک میں وہیں پڑا رہا۔ پیاس مجھے نڈھال کر رہی تھی۔ ان کی غضب ناک نگاہوں سے مجھے رحم کی توقع نہ تھی ان کی شکلیں دیکھ کر مجھے محسوس ہوتا تھا کہ وہ میرے لیے کوئی عبرت ناک سزا تجویز کر چکے ہیں۔

سورج غروب ہوتے ہی ایک بڑی بڑی مونچھوں والا آیا۔ یہ لوگ ادب سے اس کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ اس نے آتے ہی ان لوگوں سے کچھ کہا اور یہ تمام کالی دیوی، کالی دیوی، بلیدان، بلیدان کے نعرے لگاتے ہوئے چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں اپنے اپنے گھروں کی طرف چلے گئے اور تھوڑی دیر میں میدان خالی ہو گیا صرف چھ نیزوں اور تلواروں سے مسلح سپاہی میرے قریب کھڑے رہے۔

رات کے وقت چند آدمی مشعلیں لیے ہوئے آئے۔ ایک شخص نے آگے بڑھ کر اپنی تلوار سے میرے پاؤں کی رسیاں کاٹ ڈالیں۔ ایک شخص پانی کا برتن اٹھا لایا اور میرے قریب پہنچ کر میرے سر پر الٹ دیا۔ میں نے پانی کی دھار کے سامنے اپنا منہ کھول دیا۔ پانی کے چند گھونٹ پیتے ہی میں نے یہ محسوس کیا کہ میں ایک بار پھر زندہ ہو گیا ہوں۔ برتن کا پانی پاؤں کو تر کرتا ہُوا زمین پر بہہ گیا میری پیاس ابھی کم نہ ہوئی تھی۔ میرے سامنے ایک چھوٹے سے گڑھے میں کچھ پانی جمع ہو گیا تھا۔ میں نے منہ کے بل لیٹ کر اسے بھی ختم کر ڈالا۔

ایک سپاہی نے میری کمر میں نیزے کی نوک چبھو کر مجھے اٹھنے کا حکم دیا۔ میرے لیے ان لوگوں کا حکم ماننے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ میں اٹھا اور سپاہیوں کے اشارے پر ان کے ساتھ چل دیا۔ دو آدمی مشعلیں اٹھائے میرے آگے آگے چل رہے تھے۔ تھوڑی دُور چلنے کے بعد میں نے دیکھا کہ میرے پیچھے سپاہیوں کے علاوہ عورتوں، مردوں اور بچّوں کی ایک خاصی تعداد آ رہی ہے

مجھے معلوم تھا کہ میں کہاں جا رہا ہوں۔ چلتے چلتے میں نے اپنی جان بچانے کی ہزاروں تدبیریں سوچیں لیکن مجھے ان لوگوں سے بچ نکلنے کی کوئی صورت نظر نہ آئی۔ تاہم میرا دل مجھے تسلیاں دے رہا تھا کہ تو مرے گا نہیں۔ کبھی میں یہ سوچتا کہ شاید زلزلہ آ جائے اور یہ لوگ بدحواسی کی حالت میں مجھے چھوڑ کر بھاگ جائیں کبھی میں یہ دعا کرتا کہ ہوا کا کوئی تیز جھونکا آئے اور مجھے اڑا کر لے جائے۔ کبھی چاروں طرف سے مایوس ہو کر میں سماج کے دیوتاؤں کو مدد کے لیے پکارتا۔

مندر کے قریب پہنچ کر یہ لوگ کسی کے انتظار میں کھڑے ہو گئے۔ ناقوس اور گھنٹوں کی صدائیں سن کر میرا دل دھڑک رہا تھا تاہم مندر کے قریب زیادہ دیر کھڑے نہ رہے۔ وہی بڑی بڑی مونچھوں والا شخص جسے میں نے شام کے وقت دیکھا تھا۔ آیا۔ سپاہیوں نے مجھے چلنے کے لیے اشارہ کیا۔ میں نے محسوس کیا کہ میں موت کے منہ کے بہت قریب پہنچ چکا ہوں اور کوئی طاقت مجھے اب بچا نہیں سکتی۔ میں نے اچانک یہ ارادہ کیا کہ میں بزدلوں کی طرح جان نہیں دوں گا اور مرنے سے پہلے آخری بار اپنی جان بچانے کی کوشش ضرور کروں گا۔ زخمی ہونے کے باوجود میں یہ محسوس کرتا تھا کہ میں ان موٹے اور بدوضع لوگوں کے مقابلے میں بہت طاقتور ہوں لیکن میرے ہاتھ خالی تھے اور صرف ٹانگیں تھیں جو میرا آخری سہارا بن سکتی تھیں۔

مندر میں پاؤں رکھتے ہی بے شمار چراغوں کی تیز روشنی میں مجھے کالی دیوی کی مورتی نظر آئی اور میرے منہ سے بے اختیار ایک چیخ نکل گئی۔ اس کا اندھیری رات سے زیادہ تاریک چہرہ اس کی چمکتی ہوئی مہیب آنکھیں۔ اس کی دو ہاتھ لمبی زبان ـــ میں نے خوف زدہ ہو کر آنکھیں بند کر لیں۔ میرا جسم پسینے سے تر ہو گیا۔ آج بھی اس کی شکل میری آنکھوں کے سامنے پھر رہی ہے۔

مجھے اس کے سامنے بٹھا دیا گیا۔ بڑی بڑی مونچھوں والا آدمی کسی عجیب غریب زبان میں کچھ گانے لگا۔ گاتے گاتے اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ ایک موٹا اور بدوضع شخص ایک بہت بڑا کلہاڑا اٹھا کر میرے قریب آ کھڑا ہوا۔ اس نے پھر ایک نیا راگ شروع کیا اور گاتے گاتے دوسری بار کلہاڑا اٹھانے والے شخص کو ہاتھ کا اشارہ کیا اس نے کلہاڑا بلند کیا۔

دنیا میں موت سے زیادہ خوف ناک شے کوئی نہیں۔ موت کے خوف کے سامنے کالی دیوی کا خوف جاتا رہا۔ میرا دل پھٹنے لگا۔ ایک آگ تھی جو میری رگوں میں دوڑ رہی تھی۔ میں بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اٹھا اور اپنے راستے میں نیزوں اور تلواروں کے بلند ہونے سے پہلے ہی کسی کو دھکیلتا، کسی کو گراتا اور کسی کے اوپر سے پھاندتا ہوا مندر سے باہر نکل گیا۔

ایک سپاہی کا نیزہ میری ران پر معمولی سی خراش پیدا کرتا ہوا گزر گیا دوسرے کی تلوار سے میری کھوپڑی ٹکڑے ٹکڑے ہوتے ہوتے بچ گئی۔ مندر سے باہر تاریکی میں مجھے ایک لمحے کے لیے کچھ نظر نہ آیا۔ جو لوگ وہاں کھڑے تھے۔ بدحواس ہو کر میرے راستے سے ہٹ گئے اور جب وہ اپنے ہوش و حواس پر قابو پا کر میرے تعاقب میں دوڑے میں مندر سے کافی دور آ چکا تھا۔ ایک سپاہی نے جو اپنے ساتھیوں سے تیز رفتار تھا مجھے اپنی آنکھوں سے اوجھل نہ ہونے دیا وہ میرے پیچھے بھاگتا ہوا اپنے دوسرے ساتھیوں کو آوازیں دے رہا تھا۔ میں نے کئی بار اپنا رخ بدلا لیکن جلد ہی اس نتیجہ پر پہنچا کہ اس سے بچ نکلنا آسان نہیں۔ میرے ذہن میں فوراً ایک تدبیر آئی۔ میں نے ادھر ادھر مڑنے کی بجائے سیدھا بھاگنا شروع کیا اور اپنی رفتار ذرا کم کر دی۔ جب میرے اور اس کے درمیان پانچ سات قدم کا فاصلہ رہ گیا اور اس نے حملہ کرنے کی نیت سے

تلوار اٹھائی تو میں اچانک رکا اور زمین پہ ہاتھ ٹیک کر اس کے راستے میں بیٹھ گیا وہ عین وقت پر اپنی رفتار کم نہ کر سکا۔ اس کی ٹانگیں میرے جسم کے ساتھ ٹکرائیں اور وہ قلابازی کھاتا ہوا سر کے بل زمین پر آ گرا۔ میں نے اٹھ کر بھاگنا شروع کیا اور دیر تک پیچھے مڑ کر نہ دیکھا۔ تعاقب کرنے والوں کی آوازیں مجھے بدستور سنائی دے رہی تھیں۔

باغوں اور کھیتوں کو عبور کرنے کے بعد میں نے ایک چھوٹے سے ٹیلے پر چڑھ کر ادھر ادھر دیکھا۔ لوگ مندر کے آس پاس ابھی تک مشعلیں لیے پھر رہے تھے۔ ٹیلے سے نیچے اترنے کے بعد دوڑنے کی ہمت نہ تھی اور میں معمولی رفتار سے رات بھر چلتا رہا۔

پچھلے پہر جب چاند نمودار ہوا میں دریا کے کنارے پہنچ چکا تھا وہاں مجھے اپنی قوم کا ایک چرواہا ملا۔ اس نے مجھے دودھ پلایا۔ میں تھکاوٹ سے چور تھا اور چاہتا تھا کہ وہیں سو جاؤں لیکن مجھے اطمینان نہ تھا اور میں یہ محسوس کر رہا تھا کہ کالی دیوی ابھی تک میرا تعاقب کر رہی ہے اور اگر میں سو گیا تو میرا گلا گھونٹ ڈالے گی۔ میں نے ذرا تازہ دم ہو کر دریا میں چھلانگ لگا دی۔ تیرنے میں مجھے کافی مہارت تھی تاہم اب بھی مجھے بار بار یہی خیال آتا تھا کہ کہیں کالی دیوی مگرمچھ بن کر نہ آ جائے دریا عبور کرنے کے بعد میں چھ دن ادھر ادھر بھٹکتا رہا۔ ساتویں روز اس جگہ پہنچ گیا"

رامو یہاں تک پہنچ کر رک گیا اور سکھدیو کی طرف دیکھنے لگا۔ سکھدیو کسی گہرے خیال میں ڈوبا ہوا تھا۔ رامو کی خاموشی پر اس نے آہستہ سے آنکھیں اوپر اٹھائیں اور کہا "ان باتوں کے باوجود تم سماج کے دیوتاؤں پر یقین رکھتے ہو"

رامو نے جواب دیا۔ "میں نے ابھی بات پوری نہیں کی۔ پہلے جو کچھ میں کہنا چاہتا ہوں وہ سن لو۔"

اب میں اُن تمام واقعات کے بعد صرف ایک بات پر یقین رکھتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ سماج والوں کی طاقت کا راز سنگِ مرمر کے خوب صورت دیوتاؤں میں نہیں بلکہ کالی دیوی کی مہیب مورتی میں ہے ممکن ہے کہ اچھے دیوتا بھی کسی طاقت کے مالک ہوں لیکن ہمارے خلاف جو کچھ ہو رہا ہے وہ کالی دیوی کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ کالی دیوی انہیں اچھوتوں کو مغلوب رکھنے کا سبق دیتی ہے انہیں ہمارے ساتھ نفرت سے پیش آنا اور ہم پر ظلم کرنا سکھاتی ہے ہم اس وقت تک ان لوگوں کی برابری نہیں کر سکتے۔ جب تک ہمارے پاس کالی دیوی جیسی طاقت نہ ہو جو ہمیں یہ سکھائے کہ اونچی ذات والے تمہارے دشمن ہیں۔ ان کے شہر لوٹ لو۔ ان کی زمینیں چھین لو انہیں رسیوں میں جکڑ کر میرے سامنے قربان کرو۔

میں یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ اگر ہم پتھر کے ٹکڑے کو تراش کر کسی ڈراؤنی شکل میں تبدیل کر لیں تو اس میں زبردست طاقت بھی پیدا ہو جائے گی لیکن یہ دعویٰ ضرور کرتا ہوں کہ ہم اپنے یقین کے ساتھ اس میں ایک زبردست قوت پیدا کر سکتے ہیں اگر ہم بھی اپنی مورتیوں کے سامنے اپنے دشمن کو قتل کریں تو کوئی وجہ نہیں کہ جس طرح ہم ان کے دیوتاؤں سے ڈرتے ہیں وہ بھی ہمارے دیوتاؤں سے نہ ڈریں۔"

یہاں تک کہ رامو جوش میں آ گیا اور اپنا مکا بلند کرتے ہوئے اونچی آواز میں کہنے لگا "سکھدیو! سکھدیو!! غور سے سنو۔ ہمیں صرف پتھر کے ایک تراشے ہوئے ٹکڑے کی ضرورت ہے خواہ اس میں کوئی طاقت ہو یا نہ ہو اس کے بعد تم دیکھو گے کہ جس طرح ہم اونچی ذات کے لوگوں سے ڈرتے ہیں اسی طرح وہ ہم سے ڈریں گے۔ جس طرح وہ ہماری بستیوں کو لوٹتے ہیں ہم ان کے شہروں کو لوٹیں گے جس طرح وہ ہمیں اچھوت سمجھتے ہیں ہم انہیں اچھوت سمجھیں گے جس طرح انہوں نے زرخیز اور سرسبز میدانوں سے نکال کر ان پر قبضہ کر لیا ہے۔ اسی طرح ہم

ان کے ہرے بھرے باغ اور لہلہاتی کھیتیاں چھین کر انہیں جنگلوں اور بیابانوں کی طرف دھکیل دیں گے۔ سکھدیو! تم نے کہا تھا کہ ان بکھرے ہوئے دانوں کو ایک لڑی میں پرونا آسان بات نہیں لیکن میں یہ دعویٰ کرتا ہوں کہ اپنے دیوتا کی محبت اور اونچی ذات کی دشمنی ان بکھرے ہوئے دانوں کو چند دنوں کے اندر ایک لڑی میں پرو دے گی۔ دنیا میں کوئی انسان ایسا نہیں جسے کسی کام میں اپنی بہتری نظر آئے اور وہ اسے نہ کرے۔ جھونپڑیوں میں رہنے والوں کو صرف محلات کے خواب دکھانے کی ضرورت ہے۔

میں نے یہی باتیں موتی سے کہی تھیں لیکن اس کا سر چھوٹا اور دل کمزور تھا اب میں اس ارادے کو پورا کرنے کا فیصلہ کر چکا ہوں لیکن اپنی قوم کے ایک گروہ کا سردار ہوتے ہوئے بھی میں تمہاری مدد کی ضرورت محسوس کرتا ہوں۔ میں کنول کے باپ کی کہانی سن چکا ہوں اور تم سے یہ توقع رکھتا ہوں کہ تم اپنے لیے نہیں تو کم از کم کنول کے باپ کا انتقام لینے کے لیے ہی میرا ساتھ دو گے۔ کیوں سکھدیو تمہارا کیا خیال ہے؟"

سکھدیو دیر تک سوچنے کے باوجود اس سوال کا کوئی جواب نہ دے سکا۔ اسے پہلی بار معلوم ہوا کہ راموکی اصلیت آج تک اس کی آنکھوں سے چھپی رہی ہے۔ سکھدیو کو خاموش دیکھ کر رامو نے کہا "میں جانتا تھا کہ اپنی قوم کی محبت تمہیں میرا ساتھ دینے کی اجازت نہ دے گی۔ تمہارا خون ضرور جوش مارے گا لیکن میں تم سے صرف یہ درخواست کروں گا کہ میرے راستے میں کانٹا نہ بننا۔ میں تمہارا دوست ہوں لیکن کانٹوں کو اپنے راستہ سے دور کرنا انسان کی فطرت ہے:

"رامو!" سکھدیو نے مغموم لہجے میں کہا "مجھے ان لوگوں سے محبت نہیں اگر تمہاری قوم سماج سے اپنے کھوئے ہوئے حقوق واپس لے لے تو مجھ سے زیادہ

خوشی شاید تمہیں بھی نہ ہو لیکن میں یہ نہیں چاہتا کہ پتھر کی وہ مورتیں جنہوں نے سماج والوں کے دل پتھر بنا دیئے ہیں تمہاری قوم کے سادہ اور رحم دل لوگوں کو بھی خونخوار درندوں میں تبدیل کر دیں۔ میں ایک زبردست اور انصاف پسند طاقت کا قائل ہوں اور مجھے یقین ہے کہ جب اس کی مرضی ہوگی وہ کسی ایسے طاقتور انسان کو بھیجے گی جو دیوتاؤں کی مدد کے بغیر چھوت اور اچھوت کو ایک ہی صف میں کھڑا کر دے گا جو اونچی ذات کے دل سے صدیوں کی سیاہی دھو ڈالے گا۔ جو مدتوں کے بچھڑے ہوئے دلوں کو ملا دے گا۔ میں کسی ایسے دیوتا کی تلاش میں ہوں جس کی پوجا ایک انسان کو دوسرے انسان سے نفرت نہیں بلکہ محبت کرنا سکھائے:

رامو نے کہا "سکھدیو! تم تمام عمر خواب دیکھتے رہو گے لیکن میں اپنی عمر کا باقی حصہ تمہاری طرح ضائع نہیں کرنا چاہتا۔ میں اس زبردست اور انصاف پسند طاقت کی راہ نہیں دیکھوں گا جو برسوں سے کہیں سو رہی ہے۔ اونچی ذات والے کسی زبردست اور انصاف پسند طاقت کی مرضی کے بغیر ہم پر حکمران ہیں اور تم دیکھو گے کہ وہ طاقت ہمارے راستے میں بھی روڑے نہیں اٹکائے گی۔ میں صرف تم سے یہ وعدہ لینا چاہتا ہوں کہ تم میری مخالفت نہیں کرو گے۔"

سکھدیو نے جواب دیا "میں تمہاری مخالفت نہیں کروں گا لیکن تمہارا ساتھ بھی نہیں دوں گا۔"

رامو نے اٹھتے ہوئے کہا:

"یہ مجھے پہلے ہی معلوم تھا۔ اچھا اب جاتا ہوں۔ تم چند دن میں دیکھو گے کہ ایک نئے دیوتا کی آواز ہماری قوم کو کہاں کہاں سے لا کر ایک جگہ اکٹھا کرتی ہے۔"

سکھدیو خاموش رہا۔ رامو اپنے گدھے پر سوار ہو کر چل دیا۔ اس کے رخصت

ہوتے ہی بدھو بھاگا ہوا سکھدیو کے پاس آیا اور پوچھنے لگا:

"وہ مکا اٹھا اٹھا کر آپ سے کیا کہہ رہا تھا؟ بھیا سچ کہتا ہوں، میں کلہاڑی اٹھائے تیار بیٹھا تھا۔ اگر کوئی ایسی ویسی بات ہوتی تو وہ آج بچ کر نہ جاتا۔

آخر کیا بک رہا تھا وہ؟"

"کچھ نہیں بدھو!"

کوئی خاص بات نہیں تھی!"

نیا دیوتا

ساون کا مہینہ ان لوگوں کے لیے ایک نئی زندگی کا پیغام لایا۔ رامو کئی مہینے پہلے آس پاس کی تمام بستیوں کے لوگوں کو ایک نئے دیوتا کی آمد آمد کی خبر دے چکا تھا۔ اس کی تقریروں کی بدولت کسی کے دل میں آنے والے دیوتا کی زبردست طاقت کا رعب اور کسی کے دل میں اس کی محبت پیدا ہو رہی تھی۔ رامو اس دیوتا کے لیے جھیل کے کنارے ایک بلند ٹیلے پر پیپل کے ایک درخت کے سائے میں مٹی کا چبوترا بنوا چکا تھا۔ آنے والے دیوتا کے لیے پھولوں کی ضرورت کا احساس کر کے اس نے لوگوں کو جھیل سے کنول کے پھول توڑنے کی ممانعت کر دی تھی۔

ان لوگوں میں سکھدیو کے سوا کوئی ایسا نہ تھا جسے دیوتا کا انتظار صبح و شام ٹیلے پر نہ لے جاتا۔ کوئی علی الصباح یہ خبر لے کر آتا کہ میں نے رات کے وقت دیوتا کو اپنی آنکھوں سے چبوترے پر دیکھا ہے اور وہ مجھے دیکھ کر غائب ہو گیا تھا کوئی شام کے وقت یہ خبر مشہور کرتا کہ دیوتا آج پو پھٹنے سے پہلے جھیل میں نہا رہا تھا لیکن مجھے دیکھتے ہی اس نے پانی میں غوطہ لگا دیا اور پھر باہر نہ نکلا۔ کوئی یہ افواہ اڑا دیتا کہ اس نے دیوتا کو آدھی رات کے وقت چبوترے پر ناچتے دیکھا ہے۔ غرض یہ سادہ دل لوگ آہستہ آہستہ رامو کی تقریروں سے متاثر ہو کر اس کے کانوں سے سننے اور اس کی آنکھوں سے دیکھنے کے عادی ہو رہے تھے۔

سکھدیو ان باتوں سے الگ تھلگ رہنے کی ہر ممکن کوشش کرتا۔ لوگ بڑی تسلی کے لیے آنے والے دیوتا کے متعلق اس کی رائے معلوم کرنے کی کوشش کرتے لیکن وہ اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے انہیں ٹال دیتا۔ بدھو، راموکی ہر بات سے نفرت کرنے کا عادی تھا لیکن نئے دیوتا کے متعلق ہر روز ایک نئی کہانی سننے کے بعد اسے بھی آہستہ آہستہ ان باتوں کے ساتھ دلچسپی ہو رہی تھی۔ کسی سے جب وہ یہ سنتا کہ نیا دیوتا ان کے جھونپڑوں کو محلات میں تبدیل کر دے گا۔ اور ان کی غیر آباد زمین پر پھل پھول اور اناج کی بارش کرے گا۔ تو وہ خوش ہونے کی بجائے اس بات پر افسوس کرتا کہ دیوتا کے ساتھ ساتھ راموکے نام کی شہرت بڑھے گی اور لوگ سکھدیو سے زیادہ اس کی عزت کریں گے۔ وہ محسوس کرتا تھا کہ سکھدیو کے ساتھ لوگوں کی دلچسپی کم ہو رہی ہے۔ جو لوگ راموسے نفرت کرتے تھے اب اس کے گرویدہ ہو رہے ہیں اور جب نیا دیوتا آئے گا تو سکھدیو کو یہ لوگ بالکل بھول جائیں گے۔

اس سے زیادہ اسے اس بات کا افسوس تھا کہ بستی کی عورتیں جو کنول کے پاس ہر وقت جمع رہتی تھیں اور اس کے پاؤں پر سر رکھتی تھیں اب ان کی توجہ رام کے گھر کی طرف ہو رہی تھی لیکن ان تمام باتوں کے باوجود وہ نہایت بیتابی سے نئے دیوتا کا انتظار کر رہا تھا۔

---

(۲)

ایک صبح آسمان پر سیاہ بادلوں کے قافلے مشرق سے مغرب کی طرف جا رہے تھے۔ ساون کی بھیگی ہوئی ہوا کے خوشگوار جھونکے آ رہے تھے۔ سکھدیو مکان

کے صحن میں چارپائی پر بیٹھا ہوا ہوا میں اڑنے والے سفید بگلوں کی طرف دیکھ رہا تھا کنول بکریوں کا دودھ دوہ رہی تھی۔ مادھو اور شانتا صحن کے ایک کونے میں بارش سے بھیگی ہوئی مٹی کھود کر ایک چھوٹا سا کنواں بنا رہے تھے۔ کنول دودھ دوہ کر اٹھی اور مٹی کا ایک کٹورا بھر کر سکھدیو کے قریب آ کھڑی ہوئی۔ سکھدیو کسی گہرے خیال سے بیدار ہوا اور اس کے منہ سے بے اختیار یہ الفاظ نکل گئے "طوفان! ایک اور طوفان!!"

کنول نے پریشان ہو کر کہا "کیسا طوفان! آپ صبح سے کیا سوچ رہے ہیں۔ لیجئے دودھ۔ بدھو مچھلی دے گیا ہے میں ابھی پکاتی ہوں۔"

سکھدیو نے کنول کے ہاتھ سے دودھ کا پیالہ لیتے ہوئے کہا "کنول! شاید یہ میری زندگی کا آخری طوفان ہو۔"

"آپ کبھی کبھی ایسی باتیں کرتے ہیں جو میری سمجھ میں نہیں آتیں۔"

سکھدیو نے دودھ پی کر کنول کو پیالہ واپس دے دیا۔

بدھو باہر سے ہانپتا ہوا آیا اور صحن میں پاؤں رکھتے ہی چلانے لگا۔ بھیا۔ وہ آ گیا! وہ آ گیا! میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔"

سکھدیو نے پوچھا "کون آ گیا تم اتنے بدحواس کیوں ہو گئے ہو؟"

"دیوتا! راموکا دیوتا!! جھیل کے کنارے چبوترے پر بیٹھا ہوا ہے میں اسے دیکھ آیا ہوں۔ اُف! کتنی لمبی زبان ہے اس کی۔ مجھے ڈر لگتا تھا۔ لوگوں نے اس کے سامنے پھولوں کے ڈھیر لگا دیے ہیں۔ میں بھی بہت سے پھول پھینک آیا ہوں۔ چلیے بھیا! تم بھی دیکھو۔"

بدھو کی توقع کے خلاف سکھدیو نے یہ خبر نہایت سکون کے ساتھ سنی اور نہایت بے پروائی سے جواب دیا "تم جاؤ! میں آج تمہاری بکریاں لے جاؤں گا۔"

"بھیا! میں مذاق نہیں کرتا میں سچ مچ اسے دیکھ آیا ہوں۔"

"میں کب کہتا ہوں کہ تم مذاق کرتے ہو لیکن مجھے تمہارے دیوتا سے کوئی دلچسپی نہیں۔"

"بھیا! اگر تم مجھ سے خفا ہو تو میں کبھی وہاں نہیں جاؤں گا۔ دیوتا خواہ کیسا بھی ہو میرے لیے تم سے اچھا نہیں ہو سکتا۔ اگر تم وہاں جانا پسند نہیں کرتے تو میں بھی وہاں کبھی نہیں جاؤں گا لیکن میں تم سے صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ وہ ہے کیا؟ وہ نہ بولتا ہے، نہ ہلتا ہے، نہ آنکھیں جھپکتا ہے۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ سانس بھی نہیں لیتا۔"

"بدھو! تمہیں اس کے متعلق رامو نے کچھ نہیں بتایا؟"

"بھیا! رامو تو اس کے متعلق بڑی عجیب باتیں سناتا ہے۔ کبھی کہتا ہے کہ وہ ہمارے لیے بڑے بڑے محل بنائے گا کبھی یہ کہتا ہے کہ وہ بڑے بڑے راجوں، مہاراجوں سے جنگ کر کے انہیں ملک سے نکال دے گا اور ان کے باغ، ان کی کھیتیاں اور ان کی چراگاہیں چھین کر ہمیں دے دے گا لیکن میں اس بات سے حیران ہوں کہ وہ ٹیلے پر چپ چاپ بیٹھ کر یہ تمام کام کس طرح کرلے گا!"

سکھدیو نے بے پروائی سے جواب دیا "یہ بھی تمہیں رامو سے ہی پوچھنا چاہیے۔"

بدھو نے سکھدیو کے قریب چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا "بھیا! دنیا میں وہ کون سی چیز ہے جس کے متعلق رامو کو علم ہو اور آپ کو اس کے متعلق کچھ علم نہ ہو۔ اس دیوتا کے متعلق کوئی بات ایسی ضرور ہے جسے آپ مجھ سے چھپانا چاہتے ہیں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ جس دن سے اس دیوتا کی باتیں شروع ہوئی ہیں آپ مغموم رہتے ہیں۔ اس دیوتا کے متعلق لوگ آپ سے بہت کچھ پوچھا کرتے تھے لیکن

آپ اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے انہیں ٹالنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ مجھے دوسروں سے واسطہ نہیں لیکن آپ کا سُکھ میرا سُکھ اور آپ کا دُکھ میرا دُکھ ہے بھیا! مجھے صرف اتنا بتا دو کہ یہ ہے کیا؟ اور آپ کو کون سی بات پریشان کر رہی ہے۔ آپ نے مجھ سے کبھی اپنے دل کی بات نہیں چھپائی۔ آخر اب مجھ سے کون سا قصور ہو گیا ہے؟"

بدھو کے سوالات کے جوابات میں سکھدیو کچھ دیر ٹکٹکی باندھ کر اس کی طرف دیکھتا رہا۔ بالآخر وہ بولا "بدھو! میں تمہیں اس دیوتا کے متعلق بہت کچھ بتا سکتا تھا لیکن مجھے ڈر ہے کہ تم کوئی بات دل میں نہیں رکھ سکو گے۔"

بدھو نے جواب دیا "بھیا! دل میں بات وہ رکھتا ہے جو کسی سے ڈرتا ہو لیکن مجھے کسی کا ڈر نہیں۔"

"لیکن میں رامو سے وعدہ کر چکا ہوں۔"

"کیسا وعدہ؟"

"یہی کہ میں دیوتا کے بارے میں اس کی مخالفت نہیں کروں گا۔"

"تو میں کب کہتا ہوں کہ آپ اس کی مخالفت کریں۔ میں آپ سے صرف یہ پوچھتا ہوں کہ یہ دیوتا ہے کیا؟ آخر وہ کون سی بات ہے جو آپ مجھ سے چھپانا چاہتے ہیں؟"

سکھدیو نے جواب دیا "بدھو! تم وعدہ کرو کہ تم یہ الفاظ دوسروں کے کانوں تک نہیں پہنچاؤ گے؟"

"میں وعدہ کرتا ہوں۔"

"اچھا سنو۔ یہ دیوتا آسمان سے نہیں اُترا۔ یہ پہلے بھی ایک پتھر تھا اور اب بھی ایک پتھر ہے۔"

"پتھر؟" بدھو نے حیرانی سے پوچھا۔

"ہاں پتھر، تم پہاڑوں میں لاکھوں پتھر ایسے دیکھتے ہو۔ ان میں اور اس پتھر میں صرف اتنا فرق ہے کہ اسے تراش کر ایک عجیب و غریب انسانی صورت میں تبدیل کیا گیا ہے۔"

اگر بدھو نے رامو کے ہاتھوں کی بنائی ہوئی مورتی کو چبوترے پر بے حس و حرکت دیکھنے کی بجائے اسے چلتے پھرتے اور باتیں کرتے بھی دیکھا ہوتا تو بھی اسے سکھدیو کی باتوں پر شک نہ گزرتا۔ تاہم اس نے اپنے رہے سہے شکوک رفع کرنے کی نیت سے سوال کیا "لیکن بھیا کئی لوگ پہلے اس دیوتا کو نہانے، ناچنے اور کودتے دیکھ چکے ہیں۔ کیا وہ سب . . . . ؟"

سکھدیو نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا "رامو ایک طاقت ور اور ہوشیار آدمی ہے دوسروں کی زبان سے جو جی چاہے کہلوا سکتا ہے اگر وہ یہ کہہ دے کہ میں نے رات کے وقت ایک بھیڑ کو آسمان کی طرف اڑتے ہوئے دیکھا ہے تو ہزاروں بے وقوف یہ کہنے کے لیے تیار ہو جائیں گے کہ ہم نے بھی بھیڑ کو اُڑتے ہوئے دیکھا ہے۔ اب ذرا سوچو اگر میں یہ کہہ دوں کہ میں نے رات کے وقت اس دیوتا کو ہاتھی پر سواری کرتے دیکھا ہے تو ان لوگوں میں کتنے ہیں جو میری ہاں میں ہاں نہیں ملائیں گے۔ ایسا قصہ اگر مشہور کر دیا جائے تو پھر تم دیکھو گے کہ بعض لوگ رات کے وقت دُور سے ایک درخت دیکھ کر بھی یہی کہیں گے کہ دیوتا ہاتھی پر سوار ہے اور جنگل میں کسی چرواہے کو بنسری بجاتے دیکھ کر انہیں شک گزرے گا کہ دیوتا بنسری بجا رہا ہے۔ تم نے عمر بھر اپنی آنکھوں سے بھوت نہیں دیکھا ہوگا لیکن تم میں سے کوئی ایسا نہیں جو بھوتوں سے نہ ڈرتا ہو اور اس ڈر کی وجہ یہ ہے کہ تم روز بھوتوں کی کہانیاں سنتے رہتے ہیں اور اندھیری رات میں ہمیں چھوٹی چھوٹی

جھاڑیاں بھی بھوت بن کر ڈراتی ہیں۔ اس دیوتا کے متعلق رامو مدت سے طرح طرح کی باتیں مشہور کر رہا تھا۔ لوگوں نے دیوتا کو اپنی آنکھوں سے ناچتے کودتے نہیں دیکھا بلکہ رامو کی آنکھوں سے دیکھا ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ٹیلے پر اپنے ہاتھوں سے تراشا ہوا پتھر رکھنے سے پہلے رامو خود ہی دیوتا بن کر ناچتا کودتا رہا ہو۔"

سکھدیو کا ہر لفظ بدھو کی آنکھوں کی چمک میں اضافہ کر رہا تھا۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ سکھدیو نے دنیا بھر کے عقل و حکمت کے خزانے اس کے دماغ میں ٹھونس دیئے ہیں۔ بارہا اس کے دل میں خیال آیا کہ وہ بھاگ کر ٹیلے پر پہنچ جائے دیوتا کے قریب چبوترے پر کھڑا ہو کر ایک پرزور قہقہہ لگائے۔ لوگ اس کی طرف حیران ہو کر دیکھیں لیکن اس کی ہنسی کسی طرح بند نہ ہو۔ لوگ اسے ڈرا دھمکا کر چبوترے سے نیچے اتارنے کی کوشش کریں لیکن وہ بلند آواز سے یہ کہتا جائے کہ یہ پتھر ہے یہ پتھر ہے!! اسے رامو نے تراشا ہے وہ تمہیں بے وقوف بنا رہا ہے ان خیالات کے تحت بدھو کا دل خوشی سے اچھل رہا تھا۔ وہ بولا:

"بھیا! یہ بہت بڑی شرارت ہے۔ رامو تم سب کو بے وقوف بنا رہا ہے ہمیں یہ باتیں آج ہی تمام لوگوں کو بتا دینی چاہئیں۔"

سکھدیو نے جواب دیا "رامو! یہ سب کچھ تمہاری بھلائی کے لیے کر رہا ہے اس کی نیت بُری نہیں۔ میں اس سے وعدہ کر چکا ہوں کہ میں اس کی مخالفت نہیں کروں گا اس لیے میری بات کسی اور کے کانوں تک پہنچ گئی تو اچھا نہ ہوگا۔"

بدھو کے چہرے پر پھر اداسی چھا گئی۔ اس کی حالت اس بچے کی سی تھی جس کی ماں نے اسے کوئی عجیب و غریب کھلونا دے کر ساتھ ہی یہ حکم بھی سنا دیا ہو کہ اسے باہر لے جا کر کسی کو مت دکھائیو۔ اس نے ملتجی ہو کر کہا "بھیا! رامو سے مجھے کسی بہتری کی امید نہیں۔ یہ اسے نیچا دکھانے کا وقت ہے۔"

سکھدیو نے جواب دیا "یہ باتیں میں تم سے زیادہ سمجھتا ہوں۔ تم خاموشی سے دیکھتے جاؤ۔

"بہت اچھا بھیا! میں کسی کو نہیں بتاؤں گا لیکن وہاں جاکر دیکھیں تو سہی کہ لوگ کیا کرتے ہیں۔"

"میں تمہیں وہاں جانے سے منع نہیں کرتا لیکن وہاں جاکر کوئی بے وقوفی نہ کر بیٹھنا!"

"آپ اطمینان رکھیئے" یہ کہہ کر بدھو اٹھا اور ٹیلے کی طرف چل دیا۔ بدھو کو گئے ہوئے زیادہ دیر نہ ہوئی تھی کہ سکھدیو کے دل میں کوئی خیال آیا اور وہ بھی اُٹھ کر ٹیلے کی طرف چل دیا۔

(۳)

آس پاس کی بستیوں کے لوگ جوق در جوق ٹیلے پر جمع ہو رہے تھے۔ نئے دیوتا کے چبوترے پر پھولوں اور آموں کے انبار لگے ہوتے تھے۔ رامو نے چبوترے سے نیچے ایک پتھر پر کھڑے ہو کر لوگوں کو بیٹھ جانے کے لیے کہا۔ لوگ رامو کی تقریریں سننے کے عادی ہو چکے تھے۔ وہ اس کا اشارہ پاتے ہی خاموش ہو گئے رامو نے دیوتا کے فضائل بیان کرنے کے بعد اپنی قوم کے اس شاندار مستقبل کا نقشہ کھینچنے لگا جس کا راز اس مقدس مورتی کی خوشنودی حاصل کرنے میں تھا۔ پوجا اور قربانی کی اہمیت ظاہر کرنے کے بعد وہ اپنی قوم کو یقین دلا رہا تھا کہ اب وہ ادھر ادھر بھٹکنے والے چرواہے نہیں کہلائیں گے بلکہ عنقریب ان پُررونق شہروں اور خوبصورت مکانوں پر قبضہ کرنے والے ہیں جن کے نیچے ان

کے آباؤ اجداد کے جھونپڑے دبے ہوئے ہیں اور وہ دن دور نہیں جب ان کے راجہ اور رانیاں گھوڑوں اور ہاتھیوں پر سوار ہو کر ان کے دشمنوں کے ساتھ جنگ کریں گے اور اس دیوتا کی مدد سے ان کی فتح ہوگی۔

اپنے راجوں اور رانیوں کا تصور ان لوگوں کے لیے اس دیوتا کی مدد سے حاصل ہونے والی باقی تمام نعمتوں سے زیادہ دلفریب اور صبر آزما تھا۔ ہر شخص کا دل مسرت سے اُچھل رہا تھا۔ سب کی آنکھوں میں امید کی مشعلیں روشن ہو رہی تھیں ہر ایک کی گردن دیوتا کے الطاف و اکرام کے زبردست بوجھ تلے جھکی جا رہی تھی۔ غرض نیا دیوتا ان لوگوں کو رامو کی زبان سے نئی زندگی، نئی روشنی اور نئی مسرتوں کا پیام دے رہا تھا۔

سکھدیو ٹیلے پر نمودار ہوا نئے دیوتا کی آمد کے بعد یہ دیوتا لوگوں کی نظروں میں اگرچہ پرانا ہو چکا تھا۔ تاہم ایک لمحہ کے لیے اس نے سب کی نگاہیں اپنی طرف کھینچ لیں۔ وہ اس کے چہرے سے نئے دیوتا کے متعلق اس کے تاثرات معلوم کرنا چاہتے تھے لیکن اس کی مغموم آنکھیں اور مرجھایا ہُوا چہرہ نئی خوشی اور نئی روشنی سے ناآشنا معلوم ہوتا تھا۔

بدھو اسے دیکھتے ہی قریب آ کر کان میں کہنے لگا "آپ انہیں بتاویں کہ یہ سب بے وقوف ہیں گدھے ہیں۔"

سکھدیو نے ماتھے پر شکن ڈالتے ہوئے آہستہ سے "چپ" کہا اور بدھو کے لبوں پر مُہرِ سکوت ثبت ہوگئی۔

رامو نے بدھو اور سکھدیو کی طرف دیکھا اور سوچ میں پڑ گیا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے کہا "بھائیو! اب تم ہی بتاؤ کہ دیوتا کو خوش رکھنے میں تمہارا فائدہ ہے یا نقصان"

"فائدہ! فائدہ!! چاروں طرف سے آوازیں آنے لگیں۔

رامو نے کہا "ہم اس دیوتا کو خوش رکھ کر زمین اور آسمان کی تمام نعمتیں حاصل کر سکتے ہیں۔ یاد رکھو! اگر یہ دیوتا ناراض ہو گیا تو ہم سب مصیبت میں پھنس جائیں گے۔ اس دیوتا کو ناراض کرنے والا ہمارا بدترین دشمن ہو گا۔ اگر کسی نے اس کی پوجا کرنے سے انکار کیا تو ہم اس سرزمین سے اسے نکال دیں گے۔ جو ہمارے پرتر دیوتا کی شان میں گستاخی کرے گا۔ ہم اسے بدترین سزا دیں گے۔"

لوگوں نے "بے شک! بے شک!!" کہہ کر رامو کی تائید کی۔

رامو کی تقریر کے بعد دیوتا کے قدموں میں ایک بکرے کا سر کاٹا گیا اس کے بعد بادل گرجا اور بارش کی ہلکی ہلکی بوندیں دیوتا کے پاؤں سے خون کے چھینٹے دھونے لگیں۔ لوگوں کے خیال میں یہ بارش ساون کی معمولی بارش نہ تھی بلکہ دیوتا کی نوازش کا نتیجہ تھا۔

رامو نے لوگوں کو ہر صبح سورج نکلنے سے پہلے دیوتا کی پوجا کے لیے ٹیلے پر آنے کا حکم دینے کے بعد یہ جلسہ برخاست کیا۔ سکھدیو لوگوں کی توجہ سے بچنا چاہتا تھا لیکن اس کے بعض عقیدت مندوں نے اسے گھیر لیا اور اس دیوتا کے متعلق اس کی زبان سے کچھ سننے کی خواہش ظاہر کی۔

سکھدیو نے مغموم آواز میں کہا "میں خوش ہوں کہ تمہیں ایک زبردست دیوتا مل گیا ہے۔ لیکن ...!" سکھدیو آگے کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن لوگوں کی مسرور اور مطمئن نگاہوں نے اس کی زبان بند کر دی۔ اس نے انہیں اس خیالی جنت سے نکالنا پسند نہ کیا۔

"لیکن کیا؟" ایک آدمی نے پوچھا۔

"ٹھہرو!" سکھدیو نے ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "بدھو کہاں گیا؟"

ایک شخص نے جواب دیا "وہ ابھی چبوترے کے پاس کھڑا تھا۔"

سکھدیو یہ سنتے ہی لوگوں کو اِدھر اُدھر ہٹا کر اپنا راستہ بناتا ہوا چبوترے کی طرف بڑھا۔ چبوترے کے قریب پہنچ کر اس نے دیکھا کہ چند نوجوان بدھو کو دھکے دے رہے ہیں اور اس کے منہ اور ناک سے خون بہہ رہا ہے اور بدھو بلند آواز میں انہیں گالیاں دے رہا ہے۔ سکھدیو بھاگ کر بدھو اور اس پر حملہ کرنے والوں کے درمیان جا کھڑا ہوا۔

"ٹھہرو!" اس نے ایک نوجوان کو پیچھے دھکیلتے ہوئے کہا۔

نوجوان بدھو سے ہاتھ ہٹا کر سکھدیو کی طرف دیکھنے لگا۔

"کیا ہوا؟" سکھدیو نے سوال کیا۔

اس کے جواب میں رامو چند قدم آگے بڑھا۔ کچھ دیر تک دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔ یہ رامو کی فتح کا دن تھا وہ اگر چاہتا تو سکھدیو پر بھی ایک کاری ضرب لگا سکتا تھا۔ لیکن وہ ایک دانا دشمن تھا۔ وہ جانتا تھا کہ سکھدیو اپنی عمر کا ایک حصہ سپاہ گری میں گزار چکا ہے۔ اس پر اوچھا وار کرنا عقلمندی نہیں۔ اس کے علاوہ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اس کے ساتھ لوگوں کی دلچسپی کم ہو گئی ہے لیکن ختم نہیں ہوئی۔ نئے دیوتا کے احترام کے باوجود کئی ایسے ہیں جو سکھدیو کے ساتھ کسی قسم کی بدسلوکی گوارا نہ کریں گے۔

سکھدیو نے پوچھا "بدھو نے کیا جرم کیا ہے؟"

رامو نے جواب دیا "اسی سے پوچھو!"

سکھدیو نے بدھو کی طرف دیکھا اور کہا "بدھو کیا کیا تم نے؟ میں نے تمہیں بار بار تاکید کی تھی کہ کوئی بے وقوفی نہ کر بیٹھنا۔"

بدھو نے جواب دیا "میں نے کچھ نہیں کیا۔ میں تو صرف یہ دیکھنے گیا تھا کہ دیوتا مٹی کا بنا ہوا ہے یا پتھر کا۔"

بدھو کے ان الفاظ کے ساتھ سکھدیو کی ایک معنی خیز نگاہ نے رامو کو پریشان کر دیا اور اسے بنا بنایا کھیل بگڑ جانے کا خدشہ پیدا ہونے لگا لیکن سکھدیو اس دفعہ بھی اس کی توقع سے زیادہ شریف ثابت ہوا۔ اس نے کہا۔ "بھائی! اسے معاف کر دو۔ اس نے کبھی دیوتا دیکھا ہی نہیں۔"

رامو نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔ "میں جانتا ہوں۔ یہ بے وقوف ہے لیکن آپ اسے سمجھا سکتے ہیں۔"

"آپ مطمئن رہیں۔ چلو۔ بدھو گھر چلیں!"

بارش کی بڑھتی ہوئی تیزی کے ساتھ ٹیلے پر سے لوگوں کی تعداد میں تدریجاً کمی ہونے لگی۔

لوگوں نے رامو کو چلنے کے لیے کہا لیکن اس نے جواب دیا "تم جاؤ! مجھے دیوتا سے کچھ باتیں کرنا ہیں۔"

---

(۴)

بدھو، سکھدیو کو گھر پہنچا کر اپنے گھر کی طرف لوٹ رہا تھا کہ پاس سے بستی کے چند آدمی گزرے۔ وہ دیوتا کے متعلق باتیں کر رہے تھے۔

ایک نے دوسرے سے پوچھا۔ "لیکن رامو اب وہاں کیا کرتا ہے؟"

دوسرے نے جواب دیا "ارے سنا نہیں تم نے۔ کوئی کہہ رہا تھا وہ دیوتا کے ساتھ علیحدگی میں باتیں کرے گا۔"

"دیوتا کے ساتھ باتیں۔" باقی سب نے یک زبان ہو کر پوچھا۔

"بھئی! یہ کون سی بڑی بات ہے۔"

پہلے شخص نے کہا۔ "بھئی سچ پوچھو تو اب کوئی بات بھی عجیب معلوم نہیں ہوتی اب پتہ نہیں کیا کچھ ہو گا!"

یہ لوگ باتیں کرتے ہوئے گزر گئے۔ بدھو دیر تک بارش میں کھڑا رہا۔ بالآخر وہ اپنے دل میں "یہ جھوٹ ہے۔ یہ جھوٹ ہے" کہتا ہوا بھاگ کر گھر پہنچا۔ اور وہاں سے کلہاڑی اٹھا کر پھر ٹیلے کی طرف چل دیا۔

بدھو پیپل کے درخت کی طرف سے ٹیلے پر چڑھا اور درخت کی آڑ میں کھڑا ہو کر چبوترے کی طرف دیکھنے لگا۔

رامو بارش سے بے پروا چبوترے پر بیٹھا آم کھا کھا کر دیوتا کے سامنے گٹھلیوں اور چھلکوں کا ڈھیر لگا رہا تھا۔

اس نے پیٹ بھرنے کے بعد مورتی کی طرف دیکھا اور کہا

"اچھے دیوتا! اب میرے پیٹ میں جگہ نہیں۔ تم بہت کھا چکے ہو یہ گٹھلیاں اور چھلکے تمہاری اشتہا کا ثبوت دینے کے لیے کافی ہیں میں کھاؤں گا۔ تمہاری شہرت ہو گی لیکن میں نے تمہیں صرف آم کھانے کے لیے نہیں بنایا۔ خون پینے کے لیے بنایا ہے۔ اپنے دشمنوں کا خون۔ اپنی قوم کے دشمنوں کا خون۔ بدھو جیسے بے وقوفوں اور سکھدیو جیسے عقل مندوں کا خون۔ راجوں اور مہاراجوں کا خون۔ اچھے دیوتا ۔۔۔ میں تیرے سامنے خون کی ندیاں بہا دوں گا۔ تیری خوشی کے لیے نہیں، اپنی خوشی کے لیے۔ میں جانتا ہوں تیرے لیے خوشی اور غم کوئی شے نہیں۔ تو پتھر ہے لیکن ایک انسان تجھ سے فائدہ اٹھانا جانتا ہے۔ اب شام ہو رہی ہے میں جاتا ہوں۔"

یہ کہہ کر رامو چبوترے سے نیچے اترا۔ لیکن چند قدم چل کر پھر رک گیا اور مورتی کی طرف دیکھ کر بولا: "تیری حفاظت، تیری حفاظت میں کروں گا جس نے

تجھے بنایا ہے وہ تجھے توڑ ڈالیں گے ؟" نہیں اُن میں یہ جرأت نہیں لیکن اگر توڑ بھی ڈالیں تو مجھے اس کی پرواہ نہیں۔ میں اور بنا لوں گا۔ جب تک پہاڑوں میں پتھر موجود ہیں۔ اس ٹیلے پر تجھ سے ملتی جُلتی کوئی نہ کوئی صورت موجود رہیگی۔"

یہ کہہ کر رامو واپس مڑا اور تیزی سے قدم اٹھاتا ہُوا ٹیلے سے نیچے اُتر گیا۔

شام کی ہلکی ہلکی سیاہی شب کی تاریکی میں تبدیل ہو رہی تھی۔ بارش کی تیزی کا وہی عالم تھا۔ بدھو دبے پاؤں درخت کی آڑ سے نمودار ہوا اور چبوترے پر بیٹھ کر نیچے کھچے آم کھانے لگا۔ ایک آم ذرا ترش نکلا۔ بدھو نے اسے غصے سے مورتی کے منہ پر دے مارا اور کہا: "رامو بدمعاش میٹھے میٹھے سب کھا گیا ہے۔"

وہ دیوتا کے ساتھ رامو کی باتیں سن چکا تھا اور اس کے الفاظ دہرا دہرا کر آموں کے رس کے ساتھ زہر کے گھونٹ پی رہا تھا —— "بدھو جیسے بیوقوفوں اور سکھدیو جیسے عقلمندوں کا خون !"

وہ زیادہ دیر بارش میں آموں کا لُطف نہ اٹھا سکا۔ بجلی چمکی اور وہ دیوتا کی مہیب صُورت دیکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ دوسری دفعہ بجلی چمکی اور اس نے کلہاڑی اٹھائی اور آگے بڑھ کر کھڑا ہو گیا۔ فطرۃً نڈر ہونے کے باوجود اس کا دل دھڑک رہا تھا۔

بجلی پھر چمکی اور اس کے ساتھ ہی بدھو کی کلہاڑی مورتی کی گردن پر پڑی کسی بھاری شے کے چبوترے پر گرنے کی آواز آئی۔ بدھو نے بھاگنے کا ارادہ کیا لیکن کسی خیال نے اسے روک لیا۔ بجلی کی چمک میں اس نے دیکھا۔ دیوتا کا سر اس کے پاؤں میں تھا۔ یہ سوچ کر کہ ٹکڑے جوڑے جا سکتے ہیں۔ اس نے کلہاڑی نیچے رکھ کر مورتی کا سر اٹھا لیا اور ٹیلے کے اس سرے پر پہنچ کر جو کہ جھیل کی طرف تھا نیچے پھینک دیا۔ دیوتا کا سر دس گز کی بلندی سے پانی میں گرا اور اس کے ساتھ

ہی بجلی چمکی اور بادل کی ایک خوفناک گرج سنائی دی۔ بارش اور زیادہ تیز ہو گئی بادل کی دوسری گرج اس قدر خوفناک تھی کہ وہ حواس باختہ ہو کر زمین پر بیٹھ گیا۔ بجلی کی چمک سے اس کی آنکھیں چندھیا گئیں اور وہ یہ محسوس کرنے لگا کہ زمین کانپ رہی ہے۔

بدھو کے سامنے رامو کے یہ الفاظ کہ اگر دیوتا ناراض ہو گیا تو ہم مصیبت میں پھنس جائیں گے توہمات کے بھُوت بن کر ناچنے لگے۔ بھُوتوں اور چڑیلوں کے قصے جن پر وہ یقین کرنے کا عادی ہو چکا تھا۔ ایک نڈر چرواہے کی زندگی کا کمزور پہلو تھے۔

وہ کسی خطرناک شے کو مقابلے پر دیکھ کر اپنی تمام جسمانی صلاحیتوں کو بروئے کار لا سکتا تھا۔ چنانچہ ایک دفعہ اندھیری رات میں اس نے اپنی ہی ایک بکری کو بھوت سمجھ کر مار ڈالا تھا لیکن وہ ان چیزوں سے بہت ڈرتا تھا جو سامنے نہیں آتیں۔ بلکہ دل میں چھپ کر دماغ پر حملہ کرتی ہیں۔ پتھر کی مُورتی کو اس نے دن کے وقت اچھی طرح ٹٹول کر دیکھ لیا تھا اور شام کے وقت رامو کی باتیں سن کر اس کا اطمینان اور بھی زیادہ ہو گیا تھا۔ لیکن اگر وہ رامو کو اس کے سامنے بیٹھ کر آم کھاتے نہ دیکھتا تو اسے اس خوفناک صورت کے سامنے اطمینان سے بیٹھ کر آم کھانے کی جرأت نہ ہوتی۔ یہ کہنا غلط ہو گا کہ اگر رامو نے اپنی تقریر میں اس مُورتی کے ٹُوٹ جانے کا خدشہ ظاہر نہ کیا ہوتا تو بدھو کو اس پر حملہ کرنے کی جرأت نہ ہوتی سکھدیو کے متعلق رامو کی نیت سے باخبر ہونے کے بعد اگر بدھو کے سامنے یہ پتھر پہاڑ بن کر بھی کھڑا ہو جاتا تو بھی وہ حملہ کرنے سے باز نہ آتا۔ سکھدیو کی جان بچانے کے لیے وہ ہر خطرے کا مقابلہ کر سکتا تھا۔ جنوں، بھُوتوں، چڑیلوں اور دیوتاؤں سے لڑ سکتا تھا لیکن اب سکھدیو کا دشمن مارا جا چکا تھا۔ اس کا سر جھیل میں

پھینکا جا چکا تھا۔ حقیقی خطرہ دور ہو چکا تھا۔ لیکن توہمات باقی تھے۔ توہمات جو روشنی میں سامنے نہیں آتے۔ تاریکی میں دماغ پر چھا جاتے ہیں۔ بدھو کی نگاہوں کے سامنے سانپ گزر چکا تھا لیکن لکیر باقی تھی وہ سانپ سے لڑ سکتا تھا لیکن اس میں اس قدر خود اعتمادی نہ تھی کہ لکیر کو سانپ بننے سے روک سکتا۔

بدھو خوف سے مغلوب ہو کر گھر کی طرف بھاگا۔ توہمات کے بھُوت اس کا تعاقب کر رہے تھے۔ ٹیلے سے نیچے اترتے ہوئے اس کا پاؤں پھسلا اور بیٹھ کے بل چند گز پھسلنے سے کمر پر معمولی سی خراش آ گئی۔ بجلی کی چمک میں اس نے ادھر اُدھر دیکھا۔ اس پاس کچھ نہ تھا۔ اگر ہوتا تو وہ یقیناً مقابلے کے لیے کھڑا ہو جاتا۔ بجلی پھر چمکی۔ بدھو نے چلّا کر کہا۔ بدمعاش! اندھیرے میں پیچھا کرتے ہیں روشنی میں نہیں آتے۔

اس نے اٹھ کر پھر بھاگنے کا ارادہ کیا لیکن اسے یاد آیا۔ بھوت ڈر کر بھاگنے والے کا پیچھا نہیں چھوڑا کرتے۔ یہ سوچ کر وہ آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ تاہم ہر دو تین قدم کے بعد وہ پیچھے مڑ کر دیکھ لیتا — گاؤں میں پہنچ کر بدھو نے دیکھا کہ گاؤں کی کشادہ گلیاں، ندیوں اور نالوں میں تبدیل ہو چکی ہیں وہ اپنے گھر کا رُخ کرنے کی بجائے سیدھا سکھدیو کے گھر پہنچا۔

سیلاب

سکھدیو کی جھونپڑی کے ایک کونے میں مٹی کے چھوٹے سے چبوترے پر ایک دیا جل رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی دو چارپائیوں پر شانتا اور مادھو لیٹے ہوئے تھے۔ دوسرے کونے میں دو چارپائیوں میں سے ایک پر سکھدیو بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے چہرے سے کسی گہری سوچ اور ذہنی کشمکش کا پتہ چلتا تھا۔ دوسری چارپائی پر کنول پریشان ہو کر اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

کنول نے پوچھا "آج آپ کیا سوچ رہے ہیں۔ یہ دیوتا کیا بلا ہے؟"

سکھدیو نے کنول کی طرف دیکھا اور جواب دیا "میں اس وقت دیوتا کے متعلق نہیں سوچ رہا تھا۔ کنول تمہیں اپنا وطن یاد آتا ہے یا نہیں؟"

سکھدیو کے ان الفاظ نے کنول کی نگاہوں سے ماضی کے نقاب الٹ دیے اور چند لمحات کے لیے وہ ان پہاڑوں، جھیلوں اور وادیوں میں کھو گئی۔

سکھدیو پھر بولا "کنول! مجھے آج تمہارا وطن یاد آتا ہے۔ مَیں سوچ رہا ہوں کہ میں نے اس جگہ رہ کر اپنی عمر کا بہت سا حصہ ضائع کر دیا ہے۔ قید سے رہا ہونے کے بعد اگر میں اس طرف آنے کی بجائے دریائے بیاس عبور کر کے پھر ایک بار تمہاری برادری کے لوگوں میں پہنچ جاتا تو میں ایک بہت بڑا کام کر سکتا تھا۔ وہ لوگ بہت اچھے تھے انہیں صرف ایک فوجی رہنما کی ضرورت تھی۔ میں چند مہینوں میں انہیں سپاہی بنا دیتا اور انہیں متحد کر کے راجہ کی فوجوں کے سامنے

ایک لوہے کی دیوار کھڑی کر دیتا۔ کنول پھر تم اپنے ملک کی رانی ہوتیں اور میں تمہاری
فوجوں کا سیناپتی ہوتا۔ سماج کے بڑے بڑے راجے تمہارے مقابلے کے لیے آتے
اور میں انہیں شکست دیتا۔"

کنول نے بھولے پن سے جواب دیا "کنول کو رانی کہلانے میں وہ خوشی
نہ ہوتی جو آپ کی داسی کہلانے میں ہے اگر آپ وہاں جاتے تو بھی میں اپنی خوشی
سے آپ کو لڑائی میں نہ جانے دیتی۔ ہم پہاڑوں میں کہیں دور جا کر اپنی جھونپڑی بناتے
اگر اب بھی آپ کا ارادہ ہو تو ان پہاڑوں میں ایسے مقام ہوں گے جہاں راجہ
کی فوجیں نہیں پہنچی ہوں گی۔"

سکھدیو نے کہا "کنول! شاید حالات ایسے ہو جائیں کہ ہمیں جانا ہی پڑے
لیکن اب وہاں میرے لیے کیا دلچسپی ہوگی۔ تمہاری قوم اب سماج کی غلامی کی عادی
ہو چکی ہوگی۔ وہ اپنی آزادی چھیننے والوں کو دیوتا سمجھنے لگے ہوں گے۔ ان کی حالت
اب وہی ہوگی جو ہمارے راجہ کے شہر کے آس پاس رہنے والے شودروں کی تھی۔"

کنول نے کہا "میں نے سنا ہے کہ رامو سماج سے جنگ کرنے کا ارادہ رکھتا
ہے؟"

سکھدیو نے جواب دیا "وہ بے وقوف ہے۔ ان بستیوں میں چرواہوں
کی آبادی مرد عورتیں اور بچے ملا کر دس ہزار بھی نہیں اور وہ ان لوگوں کے بل بوتے
پر راجہ بننے کے خواب دیکھ رہا ہے۔"

"آج جب آپ باہر گئے تھے تو اس کی بیوی میرے پاس آئی تھی وہ کہتی
تھی میں رانی بنوں گی۔"

"چڑیل کہیں کی!!" شانتا دوسرے کونے سے یہ کہتی ہوئی اٹھ بیٹھی۔ کنول
اور سکھدیو ہنسنے لگے۔

سکھدیو نے پوچھا "بیٹی! ابھی تم جاگ رہی ہو؟"

"پتا جی! سو رہی تھی۔ سپنے میں دیوتا کو دیکھ کر ڈر گئی۔"

"سو جاؤ بیٹا! وہ کوئی خوفناک چیز نہیں۔"

"چچا! بدھو کہتا تھا اس کی زبان بہت لمبی ہے وہ بچوں کو کھا جاتا ہے۔"

"بدھو جھوٹ کہتا تھا تم سو جاؤ۔"

شانتا لیٹ گئی۔ لیکن کچھ سوچ کر پھر اٹھی۔ اور مادھو کے سرہانے جا
بیٹھی۔ اس نے مادھو کے قریب منہ لے جا کر آہستہ سے کہا "بھیا صبح دیوتا
کو دیکھنے چلیں گے۔"

مادھو نے چونک کر آنکھیں کھولیں "چلی جا چڑیل کہیں کی۔ پتا جی! یہ سونے
نہیں دیتی۔"

کنول نے برہم ہو کر کہا۔ "شانتا! اسے کیوں تنگ کرتی ہو۔ اگر اس نے ایک
چپت رسید کر دی تو پھر آدھی رات تک روتی رہو گی۔"

شانتا پھر اپنی چارپائی پر لیٹ گئی اور تھوڑی دیر چھت کی طرف دیکھنے کے
بعد بولی "ماتا! بارش کہاں سے آتی ہے؟"

کنول خاموش رہی لیکن مادھو نے لیٹے لیٹے جواب دیا۔

"بادلوں سے اور کہاں سے؟"

"بادل کہاں سے آتے ہیں؟"

"پہاڑوں سے۔"

"پہاڑ کہاں سے آتے ہیں؟"

مادھو خاموش ہو گیا۔ شانتا نے سکھدیو سے پوچھا۔ "پتا جی! پہاڑ کہاں
سے آتے ہیں؟"

"تمہارے سر سے" کنول نے برہم ہو کر کہا۔ "اب سو جاؤ نہیں تو مار کھاؤ گی"

شانتا نے آنکھیں بند کر لیں لیکن تھوڑی دیر بعد پھر بولی۔

"ماتا جی!"

"کیا ہے؟" کنول نے سختی سے کہا۔

"کچھ نہیں۔"

"کچھ نہیں تو مجھے کیوں بلایا تھا؟"

"ماتا جی! چچا بدھو آج نہیں آیا۔"

"نہیں آیا تو میں کیا کروں ایسی بارش میں وہ کیسے آ سکتا ہے؟"

باہر پانی اور کیچڑ میں کسی کے چلنے کی آواز سنائی دی۔ شانتا "چچا بدھو! چچا بدھو!!" کہتی ہوئی اٹھ بیٹھی۔ بدھو نے دروازے کے قریب آ کر آواز دی "بھیا!"

شانتا نے بھاگ کر دروازہ کھولا۔ بدھو اندر داخل ہوا۔ سکھدیو نے کہا "بدھو! تمہیں بارش میں بھی آرام نہیں آتا۔ سردی لگ جائے گی۔ کہاں سے آئے ہو؟"

"گھر سے۔"

"نہیں تمہارے تمام کپڑے بھیگے ہوئے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے تم دیر سے بارش میں پھر رہے ہو؟"

"بھیا! بڑے زور کی بارش ہو رہی ہے۔ ذرا باہر نکل کر تو دیکھو۔ کپڑے بھیگتے ہیں یا نہیں۔"

"لیکن تم کانپ بھی رہے ہو۔"

کنول نے کہا "بھیا! کرتہ اتار کر یہ چادر لپیٹ لو۔ میں اسے نچوڑ دیتی ہوں۔"

"نہیں یہ ابھی سوکھ جائے گا۔" یہ کہہ کر بدھو سکھدیو کی چارپائی کی پائنتی سے کپڑا ایک طرف ہٹا کر بیٹھ گیا اور کہنے لگا:

"بھیا! معلوم ہوتا ہے کہ رامو کا یہ دیوتا بہت منحوس ہے ایسی بارش کبھی نہیں ہوئی تھی اگر صبح تک یہی حالت رہی تو دریا کا پانی اس طرف چڑھ آئے گا اگر دریا کا پانی نہ بھی آیا تو بھی ہمیں بکریوں اور بھیڑوں کی خاطر کسی ٹیلے پر جانا پڑیگا میں ابھی جانوروں کا چھپر دیکھ کر آیا ہوں۔ اندر پانی کافی آگیا ہے۔ جھیل بھر گئی ہے اور پانی ہماری بستیوں کا رُخ کر رہا ہے۔"

جھیل کا نام سن کر سکھدیو چونک اٹھا "تم جھیل پر سے ہو کر آئے ہو؟"

"بھیا! وہاں جانے کی کیا ضرورت تھی۔ آپ باہر نکل کر دیکھ لیں۔ گاؤں کی گلیاں ندی نالے بنی ہوئی ہیں۔ میرا تو خیال ہے کہ رامو، نتھو اور ٹکھو کی بستیاں بہہ جائیں گی۔ رامو کا گاؤں سب سے نیچے ہے۔ اگر اس کی بستی بہہ گئی تو وہ یہی کہے گا کہ دیوتا نے کسی کے جرم کا بدلہ لیا ہے۔ وہ یہ نہیں کہے گا کہ مجھے جھوٹ بولنے کی سزا ملی ہے۔"

سکھدیو نے حیران ہو کر پوچھا "کیسا جرم؟"

بدھو پریشان ہو کر سکھدیو کی طرف دیکھنے لگا۔ سکھدیو کو سنجیدہ دیکھ کر اسے اعترافِ جرم کی جرأت نہ ہوئی اگر وہ سکھدیو کے ہونٹوں پر ایک ہلکا سا تبسم بھی دیکھ لیتا تو کسی ہچکچاہٹ کے بغیر یہ کہہ دیتا: "بھیا! میں اس مصیبت کو ختم کر آیا ہوں لیکن سکھدیو کی تیز نگاہیں اس کے لیے حوصلہ شکن ثابت ہوئیں اس نے گھبرا کر جواب دیا "وہ یہ کہے گا کہ تم نے دیوتا کو کھٹے آم کھلائے ہیں۔"

شانتا نے پوچھا۔ "چچا وہ آم کھاتا ہے؟"

بدھو نے جواب دیا "وہ نہیں کھائے گا۔ رامو کھا کر اس کے آگے گٹھلیاں

اد چھلکے پھینک دے گا۔"

کنول ہنس پڑی۔ سکھدیو نے مسکراتے ہوئے کہا "بدھو! تم اب بہت چالاک ہوتے جاتے ہو۔ مجھے ڈر ہے کہ ہم تمہاری وجہ سے کسی مصیبت میں پھنس جائیں۔"

سکھدیو نے ہنستے ہوئے یہ بات کہی تھی لیکن بدھو اسے برداشت نہ کرسکا۔ اس کا دل بیٹھ گیا۔ اس نے ڈبڈباتی ہوئی آنکھوں سے سکھدیو کی طرف دیکھا۔ "میری وجہ سے تم مصیبت میں پھنس جاؤ؟ بھیّا! تم یہ کیوں نہیں کہتے کہ بدھو کہیں ڈوب کر مر جائے۔"

"ارے! تم ناراض ہو گئے میں نے تو تمہاری تعریف کی تھی۔ اچھا اب بنسری سناؤ!"

بنسری بجانے کی درخواست پر بدھو سب کچھ بھول گیا۔ اس نے کہا۔ "میری بنسری تو گھر ہے۔"

"شانتا! مادھو کی بنسری دینا!"

مادھو ہمیشہ بنسری سرہانے رکھ کر سوتا تھا۔ شانتا نے اٹھ کر بنسری اٹھاتے ہوئے اس کی گردن پر چٹکی لی۔ مادھو بلبلاتا ہوا اٹھا اور آنکھیں ملتا ہوا بولا۔ "ماتا! یہ پھر چھیڑ رہی ہے۔ میں نے پیٹا تو پھر نہ کہنا۔"

کنول نے ڈانٹ کر کہا "شانتا بہت شریر ہو گئی تم!"

شانتا بدھو کو بنسری دے کر پھر اپنی جگہ جا بیٹھی۔ مادھو لیٹ گیا لیکن بنسری کی لے کانوں میں پڑتے ہی "چچا بدھو، چچا بدھو" کہتا ہوا پھر اٹھ بیٹھا۔

رات آدھی سے زیادہ گزر گئی۔ مادھو، شانتا اور کنول بنسری کی میٹھی تانوں میں کھو کر سو گئے۔ سکھدیو کی آنکھوں پر غنودگی طاری ہو رہی تھی لیکن اس

نے بدھو کی دل شکنی گوارا نہ کی۔ ٹمٹماتا ہوا چراغ بجھ گیا اور بدھو کی بنسری کی آخری تان بارش کے ترانے میں فنا ہو گئی۔

اس نے کہا "بھیّا! دیا بجھ گیا میں جاتا ہوں۔"

سکھدیو نے کہا "یہیں پڑے رہو۔ میں مادھو کے ساتھ سو جاتا ہوں۔"

"نہیں بھیّا! میں بکریوں کی خبر لیتا ہوں۔ بارش بند نہیں ہوئی صبح تک دریا کا پانی ضرور آ جائے گا۔"

یہ کہہ کر بدھو اٹھا لیکن دروازے کے قریب جا کر رک گیا۔ سکھدیو کا چہرہ جس کی سنجیدگی اور متانت نے اس وقت تک اس کے ہونٹوں پر مہر لگا رکھی تھی اب تاریکی میں تھا۔ بدھو کا دل دھڑکنے لگا۔ اس نے اپنی انتہائی جرأت سے کام لیتے ہوئے کہا "بھیّا!"

"کیا ہے بدھو؟" بدھو کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ الفاظ اس کے ہونٹوں پر آ کر رک گئے "بھیّا۔۔۔۔ میں۔۔۔ میں جاتا ہوں" بدھو نے یہ کہتے ہوئے دروازہ کھولا اور دل ہی دل میں اپنے آپ کو کوستا ہوا باہر نکل گیا

بدھو کے جانے کے بعد سکھدیو ٹانگیں دراز کر کے لیٹا ہی تھا کہ گاؤں کے مختلف اطراف سے عورتوں، مردوں اور بچوں کی چیخ پکار سنائی دی۔ اس نے اٹھ کر کنول کو جگایا اور کہا "کنول شاید پانی آ گیا۔ مادھو اور شانتا کو جگاؤ شاید ہمیں بھاگنا پڑے۔"

کنول نے بستر سے اٹھ کر پاؤں نیچے رکھتے ہی گھبرا کر کہا "پانی تو ہمارے مکان کے اندر بھی آ گیا ہے اون بھیگ گئی ہوگی۔"

"یہ اون کے متعلق سوچنے کا وقت نہیں۔ ہمارا مکان کافی اونچی جگہ ہے اگر اس جگہ پانی آ گیا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آس پاس کی جھونپڑیاں اس

ت سیلاب میں بہہ رہی ہوں گی۔

صحن میں مویشیوں کے چلنے کی آہٹ پا کر سکھدیو نے جلدی سے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ بدھو تین گدھے ہانکتا ہوا چلا آرہا تھا۔ اس نے چلا کر کہا "بھیا بھیا!! جلدی کرو۔ دریا چڑھ آیا ہے۔ لوگ ٹیلوں کی طرف بھاگ رہے ہیں آپ جلدی سے گدھوں پر سامان لادیں۔ اتنی دیر میں میں بکریوں کو کسی اونچی جگہ چھوڑ آتا ہوں۔" یہ کہہ کر بدھو، سکھدیو کے جواب کا انتظار کیے بغیر بھاگتا ہوا باہر نکل گیا۔

---

(۲)

علی الصباح بدھو، سکھدیو اور اس کے بال بچے بستی سے تقریباً ایک کوس اور نئے دیوتا کے ٹیلے سے تقریباً آدھ کوس کے فاصلے پر ایک چھوٹے سے ٹیلے پر کھڑے آس پاس کے ٹیلوں کی طرف بھاگ کر پناہ لینے والے لوگوں کی چیخ پکار سن رہے تھے۔ بارش تھم چکی تھی۔ فضا میں پورب اور پچھم کے افق پر چھائی ہوئی کالی گھٹاؤں کے درمیان سفید بادل کے ہلکے سے لعاب کے نیچے مختلف رنگوں اور شکلوں کے بادل مشرق سے مغرب کا رخ کر رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سمندروں کے بادشاہ نے جس لشکر کو ہمالیہ کی عظمت اور تقدیس پر اپنی دولت کے خزانے نچھاور کرنے کے لیے بھیجا تھا۔ وہ اپنی پونجی کا کچھ حصہ بچا کر پنجاب کے وسیع میدانوں کا رخ کر رہا ہے۔

دریائے راوی میلوں میں پھیل چکا تھا۔ پانی بدستور چڑھ رہا تھا۔ بستیوں میں بانس اور سرکنڈے کی جھونپڑیاں کہیں نظر نہ آتی تھیں کہیں کہیں مٹی کے مکانوں کے کچھ حصے پانی کی سطح سے اوپر نظر آرہے تھے لیکن وہ

بھی آہستہ آہستہ منہدم ہو کر پانی کی آغوش میں روپوش ہوتے چلے جا رہے تھے۔

آس پاس کے ٹیلوں پہ عورتوں کی گریہ وزاری سے معلوم ہوتا تھا کہ بستیوں کے تمام باشندے صحیح سلامت ٹیلوں پر نہیں پہنچ سکے۔ یہ ٹیلے اب ایک وسیع جھیل کے چھوٹے چھوٹے ٹاپو بن چکے تھے اور بڑھتے ہوئے سیلاب نے ان کے درمیان آمد و رفت کے راستے بند کر دیے تھے۔

سکھدیو ان لوگوں کے ساتھ اظہارِ ہمدردی کے ارادے سے کئی بار پانی میں تیر کر آس پاس کے ٹیلوں پر جانے کے لیے تیار ہوا لیکن کنول اور بدھو نے اسے ہر بار روک لیا۔ بدھو بار بار یہ کہتا: "بھیا! اتنی دور تیر کر جانا آسان نہیں اور یہ سب بے وقوف ہمارے دشمن ہیں ہمیں ان کے ساتھ کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہیے۔ ہم پانی اترتے ہی کہیں دور چلے جائیں گے۔"

بدھو کے تمام دلائل سکھدیو کو یہ تسلیم کرنے پر آمادہ نہ کر سکے کہ یہ لوگ اس کے دشمن ہو سکتے ہیں لیکن کنول کی التجاؤں اور بڑھتے ہوئے سیلاب نے اسے اپنے ارادوں کو عملی جامہ پہنانے سے باز رکھا۔

سکھدیو کا ارادہ بھی نہ تھا کہ وہ لوگوں سے الگ تھلگ ایک چھوٹے سے ٹیلے پر پناہ لے لیکن رات کے وقت جب بدھو مویشی لے کر بستی سے نکلا تو اس نے راستے میں کئی ٹیلے چھوڑ کر اپنے لیے وہ جگہ منتخب کی جہاں کسی اور کے آنے کا گمان نہ ہو سکتا تھا۔ رات کے وقت چرواہوں کی اکثریت نے نئے دیوتا کے اونچے اور کشادہ ٹیلے کا رخ کیا اور بعض نے بدھو کو بھی اپنے ساتھ کھینچنے کی کوشش کی تھی لیکن اس نے صاف کہہ دیا تھا۔ "نہ ہم تمہارے ساتھ چلتے ہیں اور نہ تم ہمارے ساتھ آؤ۔"

---

(۴۳)

شانتا اور مادھو، سکھدیو، کنول اور بدھو سے ذرا ہٹ کر ایک طرف بیٹھے مٹی کے گھروندے بنا رہے تھے۔ مادھو نے آسمان کی طرف دیکھا اور کہا "شانتا! دیکھو، بادل بھاگ رہے ہیں۔ یہ اب اپنے اپنے گھروں کو چلے جائیں گے اور تھوڑی دیر بعد سورج نکل آئے گا۔"

شانتا نے سر ہلاتے ہوئے جواب دیا "نہیں بھیّا! یہ اب بھیڑ بکریاں اور گائیں بھینسیں بن کر بڑی بڑی جھیلوں کی طرف جا رہے ہیں وہاں سے پانی پی کر آئیں گے اور پھر بارش ہوگی۔"

"اگر اور بارش ہوئی تو بستی کی طرح یہ ٹیلا بھی ڈوب جائے گا۔ پھر ہم کہاں جائیں گے!"

"اونچے اونچے درختوں پر چڑھ جائیں گے۔"

"اور ہماری بھیڑیں؟"

شانتا سوچ میں پڑ گئی۔ لیکن تھوڑی دیر کے بعد اس نے جواب دیا "ہم درختوں پر نہیں چڑھیں گے پہاڑوں کی طرف چلے جائیں گے۔ چچا بدھو کہتا تھا، پہاڑ درختوں سے بہت اونچے ہوتے ہیں۔ مادھو! تم نے پہاڑ دیکھے ہیں؟"

"نہیں؟"

"چچا بدھو کہتا تھا کہ میں نے پہاڑ دیکھے ہیں وہاں زمین میں سوراخ ہوتے ہیں جن سے ہر وقت ٹھنڈا میٹھا اور صاف پانی بہتا رہتا ہے۔ ان کی چوٹیاں بادلوں سے بہت قریب ہوتی ہیں۔ اگر ہم وہاں گئے تو بادلوں کے ساتھ کھیلا کریں گے۔ یہ بہت تیز بھاگتے ہیں۔ وہاں لوگ ان پر سواری کرتے ہوں گے!"

مادھو نے آسمان کی طرف دیکھا اور کہا "میں بھی وہاں جا کر بادل پر سواری کیا کروں گا۔"

"اور میں بھی۔"

"نہیں تم نہیں! لڑکیاں بادلوں پر سواری نہیں کرتیں۔"

یہ کہہ کر مادھو نے بدھو کی طرف دیکھا "چچا بدھو! چچا بدھو! میں پہاڑ پر جاؤں گا۔ بادلوں پر سواری کیا کروں گا۔ تم بھی چلو گے نا؟"

"ہاں بیٹا! ہم یہاں نہیں رہیں گے۔"

مادھو نے سکھدیو اور کنول کی طرف دیکھا "ماتا! پتا جی!! ابھی اور بھی بارش ہوگی۔ یہ ٹیلا ڈوب جائے گا۔ چلو پہاڑ کی طرف چلیں۔ ہم یہاں نہیں رہیں گے۔ ماتا! تم نے پہاڑ دیکھے ہیں؟"

کنول نے جواب دینے کی بجائے سکھدیو کی طرف دیکھا اور اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

مادھو پھر بولا "ماتا! تم نے پہاڑ نہیں دیکھے؟"

"بیٹا! میں پہاڑوں کے قریب پیدا ہوئی تھی۔"

"وہاں زمین سے پانی نکلتا ہے۔"

"ہاں۔"

"تو میں وہاں ضرور جاؤں گا۔" کنول پھر سکھدیو کی طرف دیکھنے لگی۔

سکھدیو نے کہا "کنول ہم وہاں جائیں گے۔"

مادھو، سکھدیو کی ٹانگوں سے لپٹ گیا "پتا جی کب جائیں گے؟"

"جب پانی اُتر جائے گا۔"

کنول بولی "لیکن وہاں آپ کے دشمن ہوئے تو؟"

"اب ہمیں کون پہچانے گا تمہاری قوم کو یہ خیال تک نہیں آئے گا کہ تم ان کے سردار کی لڑکی ہو۔ اب اگر راجہ کے سپاہی بھی وہاں موجود ہوں تو انہیں شک بھی نہیں ہو گا کہ میں کبھی ان کا سیناپتی تھا۔ کنول ہم وہاں ضرور جائیں گے۔"

بدھو ان باتوں میں بہت دل چسپی لیتا تھا لیکن اس کی ساری توجہ نئے دیوتا کے ٹیلے کی طرف تھی۔ وہ اس بلند ٹیلے پر ہجوم کی صرف معمولی سی جھلک دیکھ سکتا تھا۔ اتنی دُور سے کسی کی آواز اس کے کانوں میں نہیں آسکتی تھی۔ تاہم وہ یہ محسوس کرتا تھا کہ وہ تمام اس کی طرف دیکھ رہے ہیں اور اس کے متعلق باتیں کر رہے ہیں۔ اس کا وہم غلط بھی نہ تھا۔ نئے دیوتا کے پجاریوں کو مورتی کا سر گم ہو جانے کی وجہ معلوم ہو چکی تھی۔

بدھو کی بستی کے کئی چرواہے اس کی کلہاڑی جو وہ رات کے وقت بدھواسی کے چبوترے پر چھوڑ آیا تھا پہچان چکے تھے وہ اپنی تباہی اور بربادی کی تمام تر ذمہ داری بدھو کے سر تھوپنا چاہتے تھے اور کوئی ایسا نہ تھا جو اس مورتی کو توڑنے والے کی بوٹیاں نوچنے کے لیے تیار نہ تھا لیکن راموا اپنی پُرجوش اور مدلل تقریروں سے یہ ثابت کر چکا تھا کہ تمہارا اصلی دشمن بدھو نہیں سکھدیو ہے۔ بدھو ایک بے وقوف انسان ہے وہ اپنے ارادے سے ایسی حرکت نہیں کر سکتا۔ بدھو کو ایسی حرکت پر یقیناً سکھدیو نے اکسایا ہو گا۔ سکھدیو سماج کا بیٹا ہے اور ہمارے احسانات اسے ہمارا بھائی نہیں بنا سکے وہ نہیں چاہتا کہ کوئی ایسا دیوتا ہماری مدد پر ہو جس کی بدولت ہم ترقی کریں۔ ہم اپنے کھوئے ہوئے حقوق واپس لیں اور سماج والوں کی برابری کریں۔ وہ دشمن کا جاسوس ہے۔ سماج والوں کو اس بات کا خوف ہو گا کہ ہم کسی وقت ایک طاقت ور دیوتا کی مدد سے ان کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں گے۔ اس لیے انہوں نے کئی سال پہلے ہی ہمارے پاس اپنا

جاسوس بھیج دیا۔ ہم نے اُن کی ہر طرح خدمت کی لیکن اس خدمت کا اس نے آج یہ پھل دیا ہے کہ ہمیں آس پاس سر چھپانے کے لیے کوئی جگہ نظر نہیں آتی۔ ہم سب پر یہ مصیبت فقط دیوتا کے ساتھ بدسلوکی کی وجہ سے آئی ہے۔ جو بچے عورتیں اور مرد ڈوب مرے ہیں ان کا خون سکھدیو کے سر ہے۔ تم سب بیوقوف ہو۔ مجھے یقین ہے کہ تم اس سے بدلہ نہیں لو گے لیکن دیوتا اپنا بدلہ لے گا اور ضرور لے گا۔ دیوتا مرا نہیں کرتے روپ بدلا کرتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ہمارا دیوتا کسی نہ کسی دن نئے روپ میں یہاں آ جائے گا۔ سکھدیو اس کے غضب سے بچ کر کہیں نہیں جا سکتا۔ اس نے پاپ کیا ہے اسے سزا ضرور ملے گی۔"

---

(۴)

شام کے وقت مطلع صاف ہو چکا تھا۔ سورج کی چمک آگ کے دہکتے ہوئے انگاروں کی سرخی میں تبدیل ہو رہی تھی۔ شفق کی سرخی پانی کی تہہ میں آگ کے ایک کانپتے ہوئے ستون کی طرح نظر آتی تھی پھر ڈوبتے ہوئے سورج کی پیشانی پانی کی سطح کو چھونے لگی اور آگ کا مینار پانی کی سطح کے نیچے پھیل کر خون کا دریا بن گیا۔

بالآخر بزمِ کائنات کی شمع پردوں میں چھپ گئی اور رُوئے زمین پر اداسی کے تاریک بادل چھا گئے لیکن آسمان نے سورج کی ایک مشعل سے محروم ہو جانے پر ستاروں کے ہزاروں چراغ جلا لیے۔

ایک پہر رات گزر جانے پر مشرق کی ایک پہاڑی کے عقب سے دھیمی سی روشنی کی کرنیں نمودار ہو کر آسمان پر نصف دائرے میں پھیل گئیں اور تھوڑی دیر میں پہاڑی کی چوٹی پر چاند کا نقرئی تاج نظر آنے لگا۔

بدھو نے دن کے وقت ٹیلے کے آس پاس پانی میں ڈوبے ہوئے کیکر کے درختوں کی ٹہنیاں کاٹ کر کافی ایندھن جمع کر لیا تھا لیکن سوکھی لکڑیاں نہ ہونے کی وجہ سے وہ مچھلی پکانے کے لیے آگ نہ جلا سکا۔ دن بھر ٹیلے پر اُگی ہوئی گھاس کے تنکے نوچنے کے باوجود بکریاں اور بھیڑیں سیر نہ ہوئی تھیں۔ تاہم اِن کا تھوڑا بہت دودھ اُن کے لیے کافی تھا۔ شانتا اور مادھو کو خالی دودھ پی کر تسلی نہ ہوئی۔ رات کے وقت جب وہ بدھو کے قریب لیٹے اس سے کہانی سُن رہے تھے۔ شانتا نے مادھو کے کان میں آہستہ سے کچھ کہا اور وہ پانی پینے کے بہانے اٹھ کر ایک طرف چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ آ کر شانتا کے قریب بیٹھ گیا۔ مادھو کی مٹھیاں بند دیکھ کر شانتا اس کی مسکراہٹ کا مطلب سمجھ گئی اور اٹھ کر دونوں ہاتھ مادھو کی طرف پھیلا دیئے۔ مادھو نے بدھو کی طرف دیکھا اور ہاں چچا کہہ کر شانتا کے ہاتھوں میں کچے چاولوں کی مٹھی کھول دی۔ تھوڑی دیر بعد بدھو بات سناتے سناتے اچانک رک گیا اور بولا "تم کیا کھا رہے ہو؟" دونوں مُنہ بند کر کے بدھو کی طرف دیکھنے لگے۔

شانتا نے جھک کر بدھو کے کان میں کہا "چچا منہ کھولو!"

بدھو نے منہ کھولا اور شانتا نے جلدی سے چاول کے چند دانے اس کے منہ میں گرا دیئے۔ بدھو "اوں ہوں، پگلی کہیں کی" کہہ کر خاموش ہو گیا اس کے بعد تینوں بے تکلف چاول چبا رہے تھے۔

اپنا اپنا حصہ ختم کرنے کے بعد تینوں ایک دوسرے کی طرف تکنے لگے۔

"چچا میں اور لاتا ہوں" یہ کہہ کر مادھو پھر اٹھا دبے پاؤں مٹکے کے قریب جا کر بیٹھ گیا چاول کی چند مٹھیاں نکال کر جھولی میں ڈالیں اور واپس آ کر بدھو کے قریب بیٹھ گیا "ارے یہ بہت زیادہ ہیں" بدھو نے یہ کہہ کر اس کے سامنے دونوں ہاتھ پھیلا دیئے۔

رامو کا اِنتقام

رات کے تیسرے پہر کنول کی دردناک چیخ نے بدھو کو گہری نیند سے بیدار کر دیا۔ وہ آنکھیں مَلتا ہوا اُٹھا اور گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ چند قدم کے فاصلے پر کنول سکھدیو کے سینے پر سر رکھے منہ کے بل پڑی ہوئی تھی۔ وہ اس چیخ کو محض اپنا وہم سمجھتے ہوئے دوبارہ لیٹ جانے کا ارادہ کر رہا تھا کہ اسے سکھدیو کے کراہنے کی آواز آئی۔

بدھو سہمی ہوئی آواز میں پکارا "بھیا!"

سکھدیو نے جواب دینے کی بجائے آہستہ آہستہ اپنا ہاتھ بلند کیا۔ ایک لمحہ کے لیے اس کا بازو ہوا میں کھڑا رہا اور پھر گوشت کے ایک بے جان لوتھڑے کی طرح نیچے آ گیا۔ بدھو دہشت زدہ ہو کر "بھیا! بھیا!" کہتا ہوا سکھدیو کی طرف بھاگا۔ قریب پہنچ کر اس نے ایک ہیبت ناک منظر دیکھا اور اس کے جسم میں خون کا ہر قطرہ منجمد ہو کر رہ گیا۔ سکھدیو کے سر سے خون کا فوارہ پھوٹ رہا تھا کنول کا ایک بازو جو سکھدیو کے سر کے نیچے تھا خون سے تر ہو چکا تھا۔ وہ سکھدیو کے سینے پر پیشانی رکھے گہری نیند میں مدہوش دکھائی دیتی تھی۔ بدھو چند لمحے مبہوت کھڑا رہا۔

یہ وہم ہے میں ایک خواب دیکھ رہا ہوں۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ نہیں نہیں! بدھو نے چند بار آنکھیں بند کر کے اپنے دل کو جھوٹی تسلیاں دینے کی کوشش

کی لیکن صبح کی تر و تازہ ہوا کے چند جھونکوں نے اس کی تمام جسمانی صلاحیتوں کو بیدار کر دیا۔ وہ ایک دردناک آواز میں "بھیا! بھیا!" کہتا ہوا سکھدیو کے قریب بیٹھ گیا۔ جب وہ سکھدیو کا ہاتھ ہلانے اور زور زور سے آوازیں دینے کے بعد مایوس ہو گیا تو وہ "بہن بہن" کہتا ہوا کنول کے کندھوں کو مضبوط ہاتھوں میں پکڑ کر جھنجھوڑنے لگا۔ شانتا اور مادھو اپنے بستر سے اٹھ کر پریشانی کی حالت میں چیختے چلاتے اس کے قریب آ کھڑے ہوئے۔

کنول نے چند بار گہرے سانس لینے کے بعد آنکھیں کھول لیں۔ بدھو نے انتہائی بے قراری کی حالت میں پوچھا "بہن کیا ہوا۔ کیا ہوا بہن! بتاؤ میرے بھائی، میرے دوست کو کیا ہوا؟" کنول کچھ دیر سکتے کے عالم میں بدھو کی طرف دیکھتی رہی لیکن اچانک اس کی رگوں میں ایک غیر معمولی ارتعاش پیدا ہوا اور وہ برق کی سی تیزی سے اٹھی۔ بھاگ کر ٹیلے سے نیچے اتری اور پانی کے کنارے جا کھڑی ہوئی۔ بدھو بھی بھاگ کر اس کے قریب پہنچا۔ کنول نے پانی کی طرف اشارہ کیا اور کہا "وہ جا رہا ہے۔ بدھو میں ان کا بدلہ ضرور لوں گی۔" وہ بھاگ کر پھر ٹیلے پر چڑھ گئی۔ بدھو غور سے پانی کی طرف دیکھنے لگا۔ کنارے سے کچھ دور اسے پانی میں کوئی متحرک شے نظر آ رہی تھی۔ "یہ رامو ہے۔ یہ رامو ہے۔" اس کے دل نے گواہی دی۔

تھوڑی دیر بعد کنول واپس آئی اس کے ہاتھ میں سکھدیو کی تلوار تھی وہی تلوار جو آج سے کئی برس پہلے اسے رام داس نے دی تھی۔ کنول کنارے پر پہنچ کر پانی میں کودنے کو تھی کہ بدھو نے آگے بڑھ کر اس کا بازو پکڑ لیا۔ "کنول ۔۔۔! سکھدیو کا بھائی ابھی زندہ ہے تم بچوں کی خبر لو۔" یہ کہتے ہوئے اس نے خالی ہاتھ پانی میں چھلانگ لگا دی۔

وہ بے پناہ قوت جو انتقام کے جذبے نے ایک لمحہ کے لیے کنول کے دل میں بیدار کر دی تھی اچانک رخصت ہو گئی۔ واپس ٹیلے پر چڑھتے ہوئے شانتا اور مادھو کی چیخ پکار سن کر اس کا دل دھڑکنے لگا اور وہ اپنی ٹانگوں پر ایک غیر معمولی بوجھ محسوس کرنے لگی۔ وہ اپنے شوہر کا انتقام لینے کے لیے زندگی اور موت سے بے پروا ہو کر طوفان کی موجوں میں کود سکتی تھی لیکن اپنی زندگی کے چراغ کو اپنی آنکھوں سے اوجھل ہوتا دیکھ کر خاموش رہنا اس کے لیے بہت بڑا امتحان تھا۔ وہ ایک انتہائی المناک حقیقت کا سامنا کرنے سے پہلے اپنے دل کو جھوٹی تسلیاں دینے کے لیے چند بار چلتے چلتے رک گئی۔ اس نے سراپا بے کسی کی تصویر بن کر آسمان کی طرف دیکھا اور اپنی نحیف آواز میں کہا:

"اے زبردست اور انصاف پسند طاقت! میری زندگی انہیں عطا کر دے اس بے رحم دنیا میں میرے بچوں کو مجھ سے زیادہ ان کی ضرورت ہے۔" ان الفاظ کے ساتھ کنول کی آنکھوں سے آنسوؤں کے چشمے پھوٹ نکلے ڈوبتا ہوا چاند اور ٹمٹماتے ہوئے ستارے اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئے اور وہ آہستہ آہستہ سکھدیو کی طرف بڑھی۔ مادھو اور شانتا روتے ہوئے بھاگ کر اس کی ٹانگوں سے لپٹ گئے۔ ماتا نے اس کی مردہ رگوں میں پھر ایک بار جان ڈال دی۔ اس نے پیار سے بچوں کو ایک طرف ہٹایا اور سکھدیو کے قریب بیٹھ کر اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔

مادھو نے ہچکیاں لیتے ہوئے پوچھا "ماتا! پتا جی کو کیا ہوا؟ ان کے سر سے خون بہہ رہا ہے۔"

"بیٹا! تم بھاگ کر کٹورے میں پانی لاؤ۔"

مادھو نے شانتا کی طرف دیکھا اور کہا "شانتا! تم میرے ساتھ آؤ۔"

مجھے ڈر لگتا ہے:

مادھو اور شانتا پانی لے کر آئے۔ کنول نے بڑی مشکل سے سکھدیو کے دانتوں میں انگلیاں دے کر اس کا منہ کھولا۔ مادھو نے پانی کا کٹورا منہ سے لگا دیا۔ پانی کے چند گھونٹ حلق سے نیچے اتارنے کے بعد سکھدیو نے آنکھیں کھولیں یکے بعد دیگرے مادھو، شانتا اور کنول کی طرف دیکھا۔ اور پوچھا "بدھو کہاں ہے؟"

کنول نے محسوس کیا کہ زبردست اور انصاف پسند طاقت کے سامنے اس کی دعا رائیگاں نہیں گئی۔ اس نے تسلی آمیز لہجے میں جواب دیا "آپ کے سر پر معمولی زخم آیا ہے۔ بدھو ابھی آ جائے گا وہ ابھی ابھی آپ کے دشمن کے پیچھے گیا ہے۔" سکھدیو نے کچھ کہے بغیر آنکھیں بند کر لیں۔

کنول نے مادھو سے کہا "بیٹا! ذرا اپنے پتا کے سر کو سہارا دینا۔ میں پٹی باندھ دوں۔" مادھو نے دونوں ہاتھوں سے سکھدیو کے سر کو سہارا دیا اور کنول نے سکھدیو کی پگڑی کا کچھ حصہ پھاڑ کر اس کے سر پر پٹی باندھ دی اور پھر اس کا سر گود میں رکھ کر بیٹھ گئی۔ سکھدیو نے دوبارہ آنکھیں کھولیں اور کہا "کنول! شاید بدھو کو دیر ہو جائے اس سے کہہ دینا میں بچوں کو اسے سونپ کر جا رہا ہوں۔ اگر وہ نہ آیا تو پانی اُتر جانے پر بچوں کو اپنے وطن واپس لے جانا بیاس کے کنارے کنارے اوپر کی طرف چلتی جانا۔ تمہیں وہ پہاڑیاں دکھائی دیں گی۔ وہ پہاڑیاں۔ . . . ." سکھدیو کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے۔

کنول نے کہا "آپ ایسی باتیں نہ کریں۔ آپ تندرست ہو جائیں گے۔ آپ ہمارے ساتھ ہوں گے۔"

سکھدیو نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے مادھو اور شانتا کی طرف دیکھا اور دونوں ہاتھ پھیلا کر ان کے سر اپنے سینے پر رکھ لیے اور پھر آنکھیں بند کر کے

اپنی نحیف و لاغر آواز میں کہنے لگا "اے زبردست اور انصاف پسند طاقت! ان کی حفاظت کرنا۔ تیرے سوا دنیا میں ان کا کوئی نہیں۔ . . . کوئی نہیں۔ . . کوئی نہیں"

سکھدیو کے ہونٹ بدستور ہل رہے تھے لیکن ضعف کے باعث اس کی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔

صبح کے آثار نمودار ہونے سے پہلے سکھدیو نے چند بار اور آنکھیں کھولیں اور کچھ مبہم باتیں کیں۔ اس کے بعد اس پر بار بار غشی طاری ہو رہی تھی اور کنول بار بار مادھو کی مدد سے اسے پانی پلا کر ہوش میں لانے کی کوشش کر رہی تھی۔

---

(۴)

بدھو چرواہوں میں بہترین تیراک مانا جاتا تھا۔ وہ چند سال قبل برسات کے دنوں میں ایک چرواہے سے دو بکریوں کی شرط لگا کر دریا عبور کر چکا تھا۔ رامو کو یقین تھا کہ وہ سکھدیو کی موت خاموشی سے برداشت نہیں کرے گا۔ اس لیے وہ ان دونوں کو بیک وقت موت کے گھاٹ اتارنے کے ارادے سے اپنی جان خطرے میں ڈال کر یہاں تک پہنچا تھا۔ لیکن سکھدیو اور بدھو ٹیلے کے دو مختلف کونوں میں ایک دوسرے سے بیس پچیس قدم کے فاصلے پر سوئے تھے اور ان کے درمیان بھیڑیں اور بکریاں بیٹھی ہوئی تھیں۔ رامو کو ان میں سے ایک پر وار کر کے فوراً دوسرے کے قریب جا کر حملہ کرنا آسان نظر نہ آیا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ اگر ایک کے زخمی ہونے سے دوسرا بیدار نہ ہوا تو وہ دونوں کو ختم کر ڈالے گا ورنہ ایک پر ضرب کاری لگاتے ہی بھاگ جائے گا۔ اس نے یہ بھی محسوس کیا کہ سکھدیو کے بعد بدھو اتنا خطرناک ثابت نہیں ہو گا جس قدر بدھو کے بعد سکھدیو

بدھو بے وقوف ہے لیکن سکھدیو مقابلے کی چوٹ ہے۔ بدھو کے انتقام سے بچنے کی امید ہو سکتی تھی لیکن سکھدیو کے انتقام کے تصور سے اس کا جی گھبراتا تھا۔

سکھدیو کے سر پر کلہاڑی کی ضرب نے کنول کو بیدار کر دیا اور اس کی خوفناک چیخ نے رامو کے ہوش و حواس مختل کر دیے۔ اس نے بدحواسی کی حالت میں دوبارہ کلہاڑی بلند کی لیکن ان لوگوں میں عورت کا قتل ایک ایسا فعل تھا جس پر رامو جیسے انسان کا ضمیر بھی صدائے احتجاج بلند کیے بغیر نہ رہا۔ کنول زخمی شوہر کے سینے پر سر رکھ کر بے ہوش ہو گئی اور رامو نے کلہاڑی ٹیلے کے نیچے پھینک کر پانی میں چھلانگ لگا دی۔ وہ کچھ دیر اپنی پوری قوت سے تیرتا رہا۔ ٹیلے سے تقریباً پچاس قدم کے فاصلے پر اس نے مڑ کر دیکھا جب کوئی پیچھا کرتا ہوا نظر نہ آیا تو وہ مطمئن ہو کر آہستہ آہستہ تیرنے لگا۔ جب بدھو نے پانی میں چھلانگ لگائی تو رامو کافی دور جا چکا تھا۔

بدھو تازہ دم تھا اور اس کی رفتار رامو کے مقابلے میں بہت تیز تھی اور دونوں کا درمیانی فاصلہ بتدریج کم ہو رہا تھا۔ بدھو اب سے چاند کی روشنی میں اچھی طرح دیکھ سکتا تھا اسے یقین تھا کہ اگر وہ پوری طاقت کے ساتھ تیرنا شروع کر دے تو رامو کو بہت جلد جا لے گا لیکن اسے یہ بھی خوف تھا کہ اگر رامو نے اسے دیکھ لیا تو وہ سیدھا بڑے ٹیلے کی طرف جانے کی بجائے آس پاس کے کسی چھوٹے ٹیلے پر پناہ لینے کی کوشش کرے گا اور ان ٹیلوں کے پناہ گزین اس کی حمایت کے لیے نکل آئیں گے۔ اس لیے اس نے منہ کے سوا اپنا سارا جسم پانی میں چھپائے رکھا اور رامو کو یہ شبہ نہ ہونے دیا کہ کوئی اس کا تعاقب کر رہا ہے۔

چھوٹے چھوٹے ٹیلوں سے آگے گزر کر جب بدھو کو یہ اطمینان ہو گیا کہ دشمن اب بڑے ٹیلے کے سوا کسی اور جائے پناہ کا رُخ نہیں کر سکتا تو اس نے

للکار کر کہا: "بدمعاش! ٹھہر جاؤ!" اور پوری طاقت کے ساتھ پانی کو چیرتا ہوا رامو کی طرف بڑھنے لگا۔

رامو پرلے درجے کا عیّار تھا لیکن نہ ٹلنے والی بلا سر پر دیکھ کر اس نے ایک لومڑی کی فراست سے کام لینے کی بجائے ایک درندے کی قوتِ فیصلہ سے کام لینا بہتر سمجھا۔ دیوتا کا ٹیلا جو اس کی آخری جائے پناہ تھی ابھی کافی دور تھا اگر ٹیلا نزدیک ہوتا تو وہ یقیناً بدھو جیسے بے ڈھب آدمی کو اپنی سپاہیانہ جِبلتوں کا ثبوت دینے کی بجائے بھاگ نکلنا زیادہ دانشمندانہ فعل خیال کرتا۔ لیکن اب مقابلے کے سوا چارہ نہ تھا۔ رامو نے اپنے قد کی بلندی سے فائدہ اٹھانے کے لیے ذرا کم گہرے پانی میں پاؤں جمانے کا ارادہ کیا لیکن بدھو کی رفتار کی تیزی نے جس قدر مہلت اسے دی اس میں وہ اپنی انتہائی کوشش کے باوجود کوئی ایسی جگہ تلاش نہ کر سکا۔ پانی ہر جگہ اس کے قد سے زیادہ تھا وہ مایوس ہو کر دشمن کی طرف دیکھنے لگا۔ بدھو، رامو کے قریب آ کر رک گیا اس نے ہانپتے ہوئے کہا،

"رامو! اب تم نہیں جا سکتے۔"

رامو نے فوراً تاڑ لیا کہ بدھو کا سانس پھولا ہوا ہے اور وہ تازہ دم ہو کر حملہ کرنا چاہتا ہے اس لیے وہ موقع دیے بغیر پانی کو دونوں ہاتھوں سے چیر کر آگے بڑھا اور بدھو کا گلا دبوچنے کی کوشش کی لیکن بدھو نے اچانک غوطہ لگا دیا۔ رامو پریشان ہو کر ابھی پانی کی لہروں کی طرف دیکھ رہا تھا کہ اس کے عقب سے بدھو کا سر نمودار ہوا اور اس کے ساتھ ہی اس نے ایک ہاتھ بڑھا کر رامو کے سر کے بال پکڑ لیے اور دونوں پانی میں غائب ہو گئے۔

---

(۳۱)

"ماما! چچا آ گیا" شانتا نے بدھو کو ٹیلے پر چڑھتے دیکھ کر کہا۔

سکھدیو نے بدھو کا نام سُن کر آنکھیں کھولیں۔ بدھو بھاگتا ہُوا اس کے قریب پہنچا اور بھیّا! بھیّا!! کہتا ہُوا اس کے قریب بیٹھ گیا۔ سکھدیو کچھ کہے بغیر بدھو کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگا۔ بدھو جو آج تک سکھدیو کو رعب و جلال اور صبر و استقلال کا مجسمہ سمجھتا آیا تھا اس کی افسردہ اور مغموم نگاہوں کی تاب نہ لا سکا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو اُمڈنے لگے۔ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا:

"بھیّا! تم فکر نہ کرو۔ تم بہت جلد اچھے ہو جاؤ گے۔ میں رامو کو موت کے گھاٹ اتار آیا ہوں۔ اب ہمارا کوئی دشمن نہیں۔ بھیّا! بھیّا!! سکھدیو بھیّا! میں تمہارا بدھو ہوں۔"

سکھدیو کے چہرے پر ایک دردناک مسکراہٹ نمودار ہوئی اور وہ بدھو سے نگاہ ہٹا کر آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔ ستارے آہستہ آہستہ صبح کی روشنی میں رُوپوش ہو رہے تھے۔ چاند کی روشنی بتدریج ماند پڑ رہی تھی۔ سکھدیو کی بے جان رگوں میں اچانک ایک ارتعاش پیدا ہُوا اس کے ہاتھ پاؤں ہلنے لگے۔ آنکھوں میں ایک خوفناک چمک آ گئی اس نے بے قراری کی حالت میں تیزی سے سانس لیتے ہوئے کنول، بدھو، شانتا اور مادھو کی طرف دیکھا۔ "کنول! کنول!! کنول!!!" کہتے ہوئے اس کی آواز بیٹھ گئی۔ آنکھوں سے آنسوؤں کے چشمے پھوٹ نکلے۔

پھر ایک لمبی سانس کے بعد سکھدیو کی زندگی کا ٹمٹماتا ہُوا چراغ بُجھ گیا۔

کنول، بدھو اور بچوں کی موجودگی کا احساس کیے بغیر دیوانہ وار اس کی آنکھوں اس کے ہونٹوں اور اس کی پیشانی کو چُوم رہی تھی۔

دُوسرا حصّہ

"اُس کے سامنے آزادی اور مسرت کی وہ دنیا تھی
جہاں پانی میں لہریں اٹھتی تھیں، پھول کِھلتے تھے، درخت
جھومتے تھے، جہاں زندگی اپنی تمام دل فریبیوں کے
ساتھ موجود تھی ..... اس نے بے بسی کی حالت
میں آسمان کی طرف دیکھا اور کہا:
"بھگوان! تو نے اسے شودر کیوں بنایا ہے — اور
اگر اسے شودر بنایا تھا تو مجھے اونچی ذات میں کیوں پیدا
کیا — ؟"

اپنا دیس

چند دن اِدھر اُدھر بھٹکنے کے بعد کنول کو دریائے بیاس دکھائی دیا اور
پانچ دن دریا کے کنارے کے ساتھ ساتھ چلنے کے بعد وہ دوسرے کنارے
پر اپنے آبائی وطن کی ان سرسبز پہاڑیوں کو دیکھ رہی تھی جو ایک طویل مدت کے
لیے تہذیب اور جہالت کے درمیان حدِ فاصل کا کام دے چکی تھیں۔ جن کی بدولت
کئی برس تک آزاد قبائل کے جھونپڑے برہمنی سماج کی آتشِ انتقام سے
محفوظ رہے تھے۔

راوی سے بیاس تک سفر کے دوران کنول کئی بستیاں اور شہر دیکھ چکی تھی
وہ شہر جہاں اونچے ایوانوں میں سماج کے مقدس بیٹوں کی عظمت کے جھنڈے
لہراتے تھے — وہ بستیاں جو شودروں کی کمتری اور بے بسی کا اعتراف کرتی
تھیں —

شہروں میں بسنے والے انسانوں کے متعلق کنول بہت کچھ جانتی تھی۔
بدھو کچھ تو کنول اور سکھدیو کے ساتھ رہ کر اور کچھ رامو کی داستانیں سن کر اس
بات پر ایمان لا چکا تھا کہ انسانیت کی تمام برائیاں ان اونچے ایوانوں میں پرورش
پاتی ہیں چنانچہ جب اسے کوئی شہر دکھائی دیتا تو وہ کنول سے مشورہ لیے بغیر اپنا
راستہ تبدیل کر دیتا۔

سفر کے شروع میں وہ بستی کو اپنے ہم جنسوں کا مسکن خیال کرتا تھا،

لیکن پہلی ہی منزل میں اسے معلوم ہو گیا کہ شہروں کی وبا بستیوں میں بھی آ چکی ہے۔

ایک شام یہ لوگ ایک گاؤں کے قریب پہنچے۔ بدھو نے گدھوں سے سامان اتارا اور بچوں کو کنول کی حفاظت میں چھوڑ کر گاؤں سے آگ لینے چلا گیا۔ اس گاؤں میں اسے سرکنڈے کی جھونپڑیوں کی بجائے خوبصورت مکان دکھائی دیئے۔ اچانک ایک مکان سے جس کا دروازہ کھلا تھا اسے ناقوس اور گھنٹیوں کی صدا آئی۔ بدھو نے پریشانی کی حالت میں جھانک کر اندر دیکھا۔ دیئے کی روشنی میں اسے ایک سیاہ پتھر کی مورتی دکھائی۔ بدھو سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا۔ اس نے کنول کے قریب پہنچ کر ہانپتے ہوئے کہا: "میں بھی حیران تھا کہ یہاں ایسے مکان کہاں سے آ گئے۔ چلو بہن! یہاں ٹھہرنا بہت خطرناک ہے۔ اگر کوئی دیکھ لیتا تو مصیبت آ جاتی۔"

بدھو نے جلدی سے گدھوں پر سامان لادا اور گاؤں سے ایک کوس دور جا کر دم لیا۔

اس کے بعد بدھو کسی بستی میں داخل ہونے سے پہلے مٹی کے مکانوں اور گھاس پھونس کی جھونپڑیوں میں اچھی طرح تمیز کر لیتا۔

شودر، بدھو اور کنول کو غریب الوطن سمجھ کر نہایت اخلاص سے پیش آتے۔ آگ کی بجائے ان کو پکا پکایا کھانا دینے پر اصرار کرتے۔ انہیں بستی سے باہر ٹھہرنے کی بجائے اپنے گھروں میں ٹھہرنے پر مجبور کرتے۔ بدھو کو ان کی یہ تمام باتیں پسند تھیں۔ لیکن رات کے وقت ان کے منہ سے دیویوں اور دیوتاؤں کے عجیب و غریب قصے سن کر وہ گھبرا اٹھتا۔ رامو کے دیوتا کی ہیبت اور سکھدیو کی مظلوم شکل اس کی آنکھوں کے سامنے آ جاتی۔ وہ رات بھر خوفناک سپنے دیکھتا۔ چند دن کے سفر کے بعد وہ یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ آئندہ

کسی شودر کے ہاں نہیں ٹھہرے گا۔

بعض اوقات وہ چلتے چلتے پریشان ہو کر کنول سے کہتا: "مجھے ڈر ہے کہیں ان لوگوں میں بھی دیوتاؤں کا مرض نہ پہنچ چکا ہو۔"

بدھو کی طرف سے اس قسم کے خدشات کا اظہار کبھی کبھی کنول کو بھی پریشان کر دیتا اور وہ اپنے دل سے یہ سوالات پوچھنے پر مجبور ہو جاتی میں کہاں جا رہی ہوں۔ کیوں جا رہی ہوں۔ وہاں میرے لیے کیا ہو گا؟ لیکن تھوڑی دیر بعد اس پر ایک بے حسی طاری ہو جاتی اور بدھو محسوس کرتا کہ کنول نیم بیداری کی حالت میں کروٹ بدلنے کے بعد پھر گہری نیند سو گئی ہے۔ اگر بدھو کوئی بات بار بار دہراتا تو اس کی پتھرائی ہوئی آنکھیں اس کی طرف متوجہ ہوتیں اور ان کی رہی سہی چمک آنسوؤں کے پردوں میں چھپ کر رہ جاتی۔

کنول پر وہ محویت طاری ہو چکی تھی جو کسی انسان میں مایوسی اور بے بسی کی انتہا دیکھنے کے بعد پیدا ہوتی ہے ـــ جو ایک جیتے جاگتے انسان کو پتھر کا مجسمہ بنا دیتی ہے۔ ایک اضطرابِ مسلسل اس کے لیے ایک دائمی سکون بن چکا تھا۔ اس کے دل میں جو غم کے سمندر کی آخری گہرائیوں میں غوطے کھا رہا تھا۔ زندگی کے ادنیٰ تفکرات کی کوئی اہمیت نہ تھی۔

بدھو بار بار اسے گدھے پر سوار کرنے کی کوشش کرتا لیکن وہ پیدل چلنے پر اصرار کرتی۔ منزلِ مقصود کی طرف اس کے پاؤں کبھی ڈھیلے اور کبھی تیز اٹھتے لیکن وہ رک جانے پر قادر نہ تھی۔

---

(۲)

انتہائی مایوسی کبھی کبھی انسان کو ناممکنات کا قائل بنا دیتی ہے۔ صحرا میں پیاسے سراب کی حقیقتوں سے واقف ہونے کے باوجود اسے دریا سمجھ کر اس کی طرف بھاگتے ہیں۔ لُٹا ہُوا سوداگر ہر تاریک غار میں جواہرات کے انبار دیکھتا ہے۔ کنول ماضی کو ایک خواب سمجھ کر اس کی تعبیریں سوچتی۔ کبھی اسے خیال آتا کہ سکھدیو مرا نہیں۔ میں نے شاید یہ تمام واقعات خواب کی حالت میں دیکھے ہیں لیکن اپنے ساتھ مادھو، شانتا اور بدھو کو دیکھ کر وہ اضطراری حالت میں اکثر یہ پوچھ بیٹھتی "بھیا! وہ واقعی مر چکے ہیں؟"

بدھو ایک لمحے کے لیے مڑ کر مایوسی اور حسرت کے اس مجسمے کی طرف دیکھتا اور کانپتے ہوئے ہونٹوں کو بھینچ کر آواز کو قابو میں لانے کی کوشش کرتے ہوئے کہتا "کنول بہن! اب ہم صبر کے سوا کر ہی کیا سکتے ہیں؟"

کنول کی طرح بدھو کے لیے بھی سکھدیو کی موت نے زندگی کا مفہوم بدل دیا تھا۔ سورج ہر صبح اپنی پرانی آب و تاب کے ساتھ نکلتا۔ ستارے ہر شام نمودار ہوتے۔ چاند ہر رات اپنی شکلیں بدلتا۔ درخت اسی طرح کھڑے تھے فضا میں پرندے اسی طرح اُڑتے تھے ـــــ بیاس کی لہریں راوی کی لہروں سے مختلف نہ تھیں لیکن بدھو یہ محسوس کرتا تھا کہ اس کی کائنات میں ایک ایسا خلا پیدا ہو گیا ہے جو اب پُر نہیں ہو سکتا۔

سازِ ہستی کا وہ تار جس کی ہر جنبش کے ساتھ بدھو کی سادہ اور معصوم زندگی کی مسرتیں رقص کرتی تھیں ٹوٹ چکا تھا۔ اس شخص کی طرح جسے ہاتھ پاؤں باندھ کر گہرے پانی میں پھینک دیا گیا ہو، بدھو کو اپنا دم گھٹتا ہُوا محسوس ہوتا انتہائی

کرب کی حالت میں وہ چیخیں مار کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتا لیکن وہ طوفان جو دل سے دردناک چیخیں بن کر اٹھتا ہونٹوں تک پہنچتے پہنچتے ہلکی ہلکی آہوں اور سسکیوں میں تبدیل ہو کر رہ جاتا۔ بعض اوقات کنول اور بچوں کا خیال اسے ہونٹ بھینچنے پر مجبور کر دیتا اور آگ کے وہ شعلے جو دل سے اٹھتے پانی میں تبدیل ہو کر آنکھوں کے راستے بہہ نکلتے۔ آسمان کے ستاروں کے سوا جنھوں نے بار بار بدھو کی چھلکتی ہوئی آنکھوں کو دیکھا تھا اور خاک کے ان ذروں کے سوا جن میں بارہا اس نے اشکوں کے موتی لُٹائے تھے کسی کو یہ معلوم نہ تھا کہ اس کی چھوٹی سی دنیا میں کیا کیا طوفان اٹھتے ہیں۔

کنول کے کان اس کی آہوں اور اس کی نگاہیں اس کے آنسوؤں سے نا آشنا تھیں۔ اس کے خیال میں بدھو ایک مرد تھا ایک ایسا مرد جو زندگی کے ہر طوفان کا مقابلہ کر سکتا تھا۔ صرف ایک رات جب وہ دریا کے کنارے سوئے ہوئے تھے اور کنول حسبِ معمول لیٹے لیٹے آسمان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس نے بدھو کو جو اس کے قریب منہ کے بل ریت پر لیٹا ہُوا تھا یہ کہتے ہوئے سنا "بھیا! تم کہاں ہو؟" اس کے بعد بدھو دیر تک ہچکیاں لیتا رہا۔

کنول کو پہلی بار یہ محسوس ہُوا کہ وہ آہوں اور آنسوؤں کی دنیا میں اکیلی نہیں اس نے کہا: "بھیا! تم رو رہے ہو؟"

بدھو نے کروٹ بدل کر اس کی طرف دیکھا اور کہا: "بہن تم جاگ رہی تھیں؟"

"سونا اب میرے بس کی بات نہیں؟"

بدھو نے ذرا سنبھل کر کہا "بہن! ماہی گیر کہتے تھے کہ تمہارا گاؤں ایک شہر بن چکا ہے اور وہاں راجہ کے سپاہیوں کی حکومت ہے۔ ہمیں شہر کے اندر

جانے کی اجازت نہیں ملے گی۔"

"بھیا! ہم شہر سے باہر جھونپڑی بنا لیں گے۔"

"لیکن وہاں جا کر اگر شہر سے باہر جھونپڑی بنانی ہے تو یہیں ان ماہی گیروں کے پاس کیوں نہ رہیں۔ یہ لوگ اگر دیوتاؤں کے متعلق اتنی باتیں نہ کریں تو بُرے نہیں۔"

"بھیا! یہ تمہارے بھائی کی آخری خواہش تھی۔"

"لیکن انہیں یہ تو معلوم نہ تھا کہ دیوتاؤں کے پُجاری وہاں قدم جما چکے ہیں۔ بہن! مجھے اپنا نہیں ان بچوں کا خیال ہے۔"

"بھیا ایسی باتیں نہ کرو۔ آخر میری قوم کے اور لوگ بھی تو اس جگہ رہتے ہیں۔"

"بہن! تمہاری مرضی۔ لیکن میں یہ پسند نہیں کروں گا کہ کوئی مادھو اور شانتا سے دیوتاؤں کے متعلق باتیں کرے اس بارے میں تمہاری قوم کے لوگوں کے پاس رہنا بھی پسند نہیں کروں گا۔ ہماری جھونپڑی سب سے علیٰحدہ ہوگی۔"

"بھیا! میں خود کسی کے پاس نہیں رہنا چاہتی۔"

---

(۲۳)

صبح کا ستارہ آفتاب کی آمد کا پیغام دے رہا تھا۔ ماہتاب کے گرد نور کی موجوں کا دائرہ محدود ہو رہا تھا۔ تاروں کے قہقہے مغموم مسکراہٹوں میں تبدیل ہو چکے تھے رات بھر فضا میں اڑنے والے جگنو گھاس میں چھپ رہے تھے۔ آس پاس کے درختوں پر چڑیاں چہچہا رہی تھیں۔

مشرق کے بلند پہاڑوں کے عقب سے سُرخ روشنی کی شعاعیں آسمان کی طرف اٹھ رہی تھیں اور شب کی سیاہ چادر مغرب کی طرف سمٹ رہی تھی۔ سورج

جو آگ کے انگارے کی طرح سرخ اور اپنی ضخامت سے کئی گنا بڑا نظر آتا تھا۔ آہستہ آہستہ پہاڑ کی چوٹی پر نمودار ہوا اور اس کی سُرخ کرنوں کی بدولت بیاس کے شفاف پانی میں خون کی آمیزش نظر آنے لگی۔ پھر سورج کے سُرخ چہرے پر پگھلے ہوئے لوہے کی سی سفیدی اور چمک پیدا ہونے لگی۔ اس کی ضخامت کم ہوتی گئی اور درختوں کے طویل اور دھندلے سائے گھٹنے لگے۔ آس پاس کی جھاڑیوں میں مکڑی کے جالوں اور گھاس کی پتیوں پر شبنم کے قطرے رنگ رنگ کے بیش قیمت موتی نظر آتے تھے۔

کنول حسبِ معمول سب سے پہلے بیدار ہو کر بکریوں کا دودھ دوہ رہی تھی۔ مادھو اٹھ کر بیٹھ چکا تھا اور شانتا لیٹے لیٹے آنکھیں مل رہی تھی۔ بدھو دیر تک جاگنے کے بعد اب گہری نیند سو رہا تھا۔ کنول دودھ دوہ کر اٹھی اور مادھو کی طرف دیکھ کر بولی "بیٹا! اٹھ کر نہا لو۔ اپنے چچا کو بھی جگا دو۔"

چچا کے لفظ پر شانتا چونک کر اٹھی اور مادھو بھی اٹھ کر جمائی لے ہی رہا تھا کہ اس نے بھاگ کر بدھو کو جا جگایا۔

بدھو نے ایک دو بار آنکھیں کھول کر پھر سو جانے کی کوشش کی لیکن شانتا کے بار بار جھنجھوڑنے پر اٹھ کر انگڑائیاں لینے لگا۔

کنول نے کہا، "بھیا تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟"

اس نے جواب دیا "جسم ٹوٹ رہا ہے۔"

کنول نے کہا: "مچھیرے ابھی تک نہیں آئے۔"

بدھو نے دریا کے کنارے تین چھوٹی چھوٹی کشتیوں کی طرف دیکھا اور کہا "وہ آتے ہی ہوں گے۔"

مادھو نے جنوب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: "ماتا! ادھر دیکھو! وہ آ رہے ہیں۔"

کنول، بدھو اور شانتا پیچھے مڑ کر دیکھنے لگے۔ کوئی پانچ سو قدم پر ایک چھوٹی سی بستی سے چند ماہی گیر دریا کی طرف آ رہے تھے۔

بدھو نے کہا "میں جلدی سے نہا لوں۔ آؤ مادھو!"

بدھو اور مادھو نے بھاگ کر دریا میں چھلانگیں لگا دیں۔ تھوڑی دیر تیرنے اور چند بار غوطے لگانے کے بعد دونو دریا سے باہر نکلے۔ اتنی دیر میں ماہی گیر کنول کے قریب پہنچ چکے تھے۔

ایک ماہی گیر نے جو دوسروں کی نسبت عمر رسیدہ معلوم ہوتا تھا کنول کے سامنے بانس کی ایک چھوٹی سی ٹوکری رکھ دی اور کہا "ہمیں افسوس ہے کہ آپ نے ہماری بستی میں ٹھہرنا پسند نہ کیا۔ اب جو کچھ ہم کھاتے ہیں آپ کے لیے لائے ہیں آپ تھوڑا بہت کھا لیں۔ ہم آپ کو ابھی پار پہنچا دیتے ہیں"۔

"آپ نے بہت تکلیف کی" یہ کہہ کر کنول نے ٹوکری کے اوپر سے بڑے بڑے پتے اٹھائے تو نیچے چند روٹیاں اور مٹی کا ایک کٹورا مکھن سے بھرا ہوا تھا۔

کھانا کھانے کے بعد یہ مسافر اپنی بھیڑوں، بکریوں اور گدھوں سمیت کشتیوں میں سوار ہوئے۔ دریا کا بہاؤ اگرچہ تیز تھا لیکن اس کی موجوں میں برسات کے ابتدائی ایام کی سرکشی نہ تھی۔ منجدھار میں ایک تیز لہر کشتیوں کو چند قدم نیچے کی طرف لے گئی لیکن ملاحوں نے جلد ہی ان کی رفتار پر قابو پا لیا اور تینوں کشتیاں کنارے پہنچ گئیں۔

کنول نے ملاحوں کا شکریہ ادا کیا اور انہیں ایک بکری دینے کی کوشش کی۔ لیکن انھوں نے بیوہ کا مال لینے سے انکار کر دیا۔ ملاحوں کی جماعت کے دو آدمی آخری منزل تک کنول کا ساتھ دینا چاہتے تھے لیکن بدھو ہر اجنبی سے مراسم بڑھانے کے خلاف تھا اس نے کہا آپ نے ہمارے لیے پہلے ہی بہت تکلیف اٹھائی ہے اب ہماری منزل دور نہیں۔ ہم شام تک وہاں پہنچ جائیں گے۔

ایک ملاح نے پوچھا "آپ کہاں جائیں گے؟"

مادھو نے پریشان ہو کر کنول کی طرف دیکھا اور اس نے ایک پہاڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا "وہاں پہاڑی کے پیچھے جوبن پور"

ایک بوڑھے ملاح نے حیران ہو کر کہا "جوبن پور تو مدت ہوئی اجڑ چکا ہے۔ اب وہاں اونچی ذات والوں کا شہر آباد ہے۔ شاید اس شہر کے آس پاس اچھوتوں کی جو بستیاں ہیں ان میں سے کسی کا نام جوبن پور ہو۔ میں نے سنا ہے کہ شہر کا سردار بہت اچھا آدمی ہے اور ہماری قوم کے آدمیوں پر جو شہر کے نزدیک بستیوں میں رہتے ہیں کوئی ظلم نہیں کرتا۔ انہیں ہماری طرح صرف شہر کے مندروں اور کنوؤں پر جانے کی اجازت نہیں ورنہ وہ ہر طرح آزاد ہیں۔ شروع شروع میں ان لوگوں پر بہت ظلم ہوتا تھا — راجہ کا سیناپتی گنگارام اور اس کا بھائی جے رام بہت ظالم تھے"۔

گنگارام کا نام سن کر کنول کو تصور میں چاروں طرف خون کی ندیاں اور آگ کے شعلے دکھائی دینے لگے۔ اسے جلتے ہوئے جھونپڑوں کے درمیان اپنا باپ خاک و خون میں تڑپتا دکھائی دیا۔ بیواؤں اور یتیموں کی چیخ پکار سنائی دی۔ سماج کے باغیوں کے خلاف سردار کی بیٹی کے دل میں انتقام کی دبی ہوئی چنگاریاں سلگ اٹھیں لیکن ان مہیب مناظر کے درمیان سکھدیو کی صورت دکھائی دی اور آگ کے شعلے اور تڑپتی ہوئی لاشیں آہستہ آہستہ اس کی نگاہوں سے اوجھل اور زخمیوں کی چیخ پکار کا شور اس کے کانوں سے محو ہو تا گیا۔ وہ صرف سکھدیو کو دیکھ رہی تھی اس کی پیاری اور میٹھی دلکش آواز سن رہی تھی۔ وہ چند قدم آگے بڑھ کر دریا کے کنارے ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئی اور اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپا لیا۔

بدھو دیر تک ملاحوں سے باتیں کرتا رہا واپس لوٹتے وقت انھوں نے

کنول سے رسمی الوداع کی خواہش ظاہر کی لیکن بدھو نے اشارے سے منع کر دیا۔

ملاح اپنی اپنی کشتیوں پر بیٹھ کر چل دیئے۔ بدھو کچھ دیر خاموش کھڑا دریا کی طرف دیکھتا رہا۔ شانتا اور مادھو بھی ایسے موقعوں پر خاموش رہنا سیکھ چکے تھے۔ اور وہ حیران ہو کر بدھو کی طرف دیکھ رہے تھے۔ بالآخر وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہُوا کنول کے قریب پہنچا۔

"بہن! بہن کنول!" اس نے مغموم آواز میں کہا۔

کنول سر اٹھا کر بدھو کی طرف متوجہ ہوئی۔ سردار کی بیٹی کے دل میں انتقام کی چنگاریاں غم کے آنسوؤں میں تبدیل ہو چکی تھیں۔

بدھو نے کہا "بہن کنول! ہم وہاں نہیں جائیں گے۔"

کنول نے ملتجی نگاہوں سے بدھو کی طرف دیکھا اور کہا: "بھیا! صرف ایک بار مجھے وہاں لے چلو۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ وہاں ٹھہرنے کے لیے ضد نہیں کروں گی میں صرف دور سے اپنا اجڑا ہُوا گھر دیکھ کر واپس چلی آؤں گی۔ اور بھیا! کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ اپنی قوم کے دوسرے آدمیوں کی طرح ہمیں شہر کے آس پاس رہنے کیلئے کوئی جگہ مل جائے؟"

بدھو نے جواب دیا کہ "اگر راجہ کے آدمیوں کو یہ علم ہو گیا کہ تم سردار کی لڑکی ہو تو پھر ان بچوں کا کیا حال ہو گا؟"

"نہیں بھیا! اب مجھے کون پہچانے گا۔ ان ملاحوں میں ایک ہماری بستی کا آدمی تھا اسے میرے متعلق شک بھی نہیں ہُوا۔ اب تو اگر تمہارا بھائی بھی آ کر مجھے اس حال میں دیکھے تو وہ بھی شاید پہچان نہ سکے۔"

بدھو نے کہا "اچھا بہن! جیسے تمہاری مرضی۔ جوہن پور اب کتنی دور ہو گا؟"

"اس ٹیلے سے پرے یہاں سے کوئی تین کوس۔"

"تو پھر دوپہر یہیں گزار لیتے ہیں۔" بدھو نے کہا۔

مادھو نے کہا "آؤ چچا! دریا میں نہائیں!"

بدھو نے کہا "نہیں! نہیں!! اس کنارے پانی تیز ہے۔" لیکن مادھو نے پورا فقرہ سننے سے پہلے بھاگ کر دریا میں چھلانگ لگا دی۔

"بے وقوف! کنارے سے دور نہ جانا" یہ کہہ کر بدھو بھی پانی میں کود پڑا۔

مادھو نے ہنستے ہوئے غوطہ لگا دیا۔

---

(۴)

غروبِ آفتاب سے کچھ دیر پہلے یہ قافلہ ایک ٹیلے پر چڑھ رہا تھا۔ کنول سب سے آگے تھی۔ شانتا ایک گدھے پر سوار تھی اور بدھو اور مادھو سب سے پیچھے مویشیوں کو ہانک رہے تھے۔

دل کی دھڑکن کے ساتھ کنول کی رفتار کبھی تیز اور کبھی سست ہو رہی تھی اس کی زندگی کے ہر افق پر تاریک گھٹاؤں کے سوا کچھ نہ تھا۔ مایوسی ایک ناقابلِ تردید حقیقت بن کر اس کے سامنے کھڑی تھی۔ ولولوں، حوصلوں اور اُمنگوں کی دنیا اُجڑ چکی تھی — امید کا ہر نخلستان یاس کے صحرا کی بھیانک وسعتوں نے چھپا لیا تھا۔ تاہم ایک وہم — ایک جنون جو ایک انسان کے دل میں عقل و شعور کے اعترافِ شکست کے بعد پیدا ہوتا ہے۔ اسے ہر ٹھوکر کے بعد اُٹھنے اور اٹھ کر آگے بڑھنے کا سہارا دے رہا تھا۔

توہمات کے حسین پردوں میں حقیقت کا بھیانک چہرہ چھپانے کی کوشش کر رہی تھی وہ اپنے ماحول کی تاریکی میں عقل و شعور کی مشعل کا سہارا چھوڑ کر موہوم

امیدوں کی چراغ روشن کر رہی تھی۔ ایک فریب خوردہ بچے کی طرح وہ تمام دنیا کو جھٹلا رہی تھی۔ کبھی کبھی ماضی کے تمام واقعات اسے وہم نظر آتے اور وہ اپنے دل کو یہ تسلیم کرنے پر مجبور کرتی کہ اس کے آباؤ اجداد کی بستی اُجڑی نہیں بلکہ اسی طرح آباد ہے۔ سکھدیو زندہ ہے اور بستی کے باہر جھیل کے کنارے اس کا انتظار کر رہا ہے وہ اسے دیکھتے ہی بھاگ کر اس سے لپٹ جائے گا اور پوچھے گا: "کنول! تم کہاں تھیں؟" وہ یہ کہے گی "سکھدیو! تم نے مجھے بہت رُلایا"۔ اس کے دل کی دھڑکن کے ساتھ اس کے پاؤں کی رفتار بھی تیز ہو جاتی لیکن موہوم امیدوں کے چراغ کچھ دیر ٹمٹمانے کے بعد بجھ جاتے اس کا رہا سہا شعور اپنے بے رحم ہاتھوں سے حقیقتوں کے منحوس چہرے سے توہمات کے حسین نقاب اٹھا دیتا۔ اس کے دل کی دھڑکن مدھم اور پاؤں کی رفتار سست پڑ جاتی۔

لیکن اس کے دل میں پھر ایک نیا ردِعمل شروع ہوتا اور وہ وہم اور شعور کے ملے جلے جذبات کے ساتھ ایک نیا وہم پیدا کرتی اور اپنے دل سے کہتی کہ وہ مر چکے ہیں۔ لیکن کیا یہ ممکن نہیں کہ مُردے پھر زندہ ہو چکے ہوں۔ سکھدیو اس کی تلاش میں کسی دوسرے راستے جوبن پور پہنچ چکا ہو اور اس کے باپ کے ساتھ دریا کے کنارے کھڑا اس کا انتظار کر رہا ہو۔ اس کی قوم کے مُردوں نے زندہ ہو کر اس کے آباؤ اجداد کی سرزمین سے سماج کے حملہ آوروں کو مار بھگایا ہو اور اونچی ذات والوں کے محلات پھر شودروں کے جھونپڑوں میں تبدیل ہو چکے ہوں؟

سورج کی شعاعوں کا جال مغرب کی طرف سمٹ رہا تھا۔ اُفق پر مٹیالے رنگ کے بادل کا ایک ٹکڑا بتدریج سرخ ہو رہا تھا۔ مشرق کی طرف کانگڑہ کے بلند پہاڑوں کی چوٹیوں پر چمکتی ہوئی برف سونے کے انبار نظر آنے لگی اور شفق کی بڑھتی ہوئی سرخی کی بدولت یہ سنہری انبار یاقوت کے پہاڑ دکھائی دینے لگے۔

کنول پہاڑی کی چوٹی پر کھڑی اپنے بدلے ہوئے گھر کا نقشہ دیکھ رہی تھی آس پاس کے ٹیلے اور ان پر درخت اسی طرح کھڑے تھے۔ دریا اسی طرح بہہ رہا تھا۔ نیچے جھیل کے پُرسکون اور شفاف پانی میں درختوں کے سائے اسی طرح نظر آ رہے تھے۔ لیکن وہ چھوٹی سی بستی جس کا تصور کنول کے لیے ان مناظر سے کہیں زیادہ دل فریب تھا اب ایک خوش نما شہر بن چکی تھی۔ کنول اپنے ڈوبتے ہوئے دل کو دونوں ہاتھوں کا سہارا دے کر اس عالی شان محل کی طرف دیکھ رہی تھی۔ جس کی بنیاد کے نیچے اس کے آباؤ اجداد کے گھر کی راکھ دفن تھی۔ شہر کے اردگرد چھوٹی چھوٹی جھونپڑیاں اس بات کا ثبوت دے رہی تھیں کہ سماج کے باغیوں میں سے بعض پُرامن شودر بن چکے ہیں۔"

مایوسی اور بے کسی کے سمندر کی اتھاہ گہرائی میں غوطہ لگانے کے بعد اپنے دل سے کنول کا پہلا سوال یہ تھا "میں یہاں کیوں آئی؟" اس نے بدھو، مادھو اور شانتا کی طرف دیکھا اور اس کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔ کنول نے اپنے چہرے کو پھٹی ہوئی چادر میں چھپا لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ شانتا گھبرا کر ماں کے ساتھ لپٹ گئی اور سسکیاں لینے لگی۔ مادھو ایسے موقعوں پر بدھو کی تقلید کرنے کا عادی تھا لیکن اس دفعہ وہ بھی زیادہ دیر ضبط سے کام نہ لے سکا اور آنسو بہانے لگا۔ بچوں کو روتا دیکھ کر مامتا کنول کی تمام حسیات پر غالب آ گئی۔ اس نے آنسو پونچھے۔ بچوں کو یکے بعد دیگرے گلے لگایا اور بدھو کی طرف دیکھ کر کہنے لگی "بھیا چلو!"

بدھو نے کہا "اب، کہاں جائیں بہن؟"

"چلو اس شہر کے باہر کہیں ہم بھی ڈیرہ جما لیں گے۔ اب رات ہو رہی ہے اگر تم نے یہاں ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا تو کل کہیں اور چلے جائیں گے۔"

مادھو نے کہا "چچا! چلو، مجھے پیاس لگ رہی ہے۔"

ٹیلے سے نیچے اترنے کے بعد اچھوتوں کی ایک چھوٹی سی بستی کے کتوں نے نہایت گرم جوشی کے ساتھ اس قافلے کا خیر مقدم کیا۔ چند مرد، عورتیں اور بچے کتوں کی چیخ پکار سن کر گھروں سے نکلے اور بدھو اور کنول سے طرح طرح کے سوال کرنے لگے: "کہاں سے آئے ہو؟ — کون ہو —؟ کہاں جا رہے ہو؟ رات یہاں کیوں نہیں ٹھہرتے؟"

کنول خاموش تھی۔ بدھو نے بھی کسی سوال کا جواب نہ دیا اور گدھوں کو ہانکتا اور کتوں کو گالیاں دیتا ہوا بستی سے باہر نکل آیا۔ کنول کی خواہش پر اس نے جھیل کے قریب چند گھنے درختوں کے درمیان گدھے روک لیے اور سامان اتارنے لگا۔

---

(۵)

آدھی رات کے وقت بدھو، شانتا اور مادھو شبنم سے بھیگی ہوئی گھاس پر پھٹے پرانے بستر بچھاتے گہری نیند سو رہے تھے۔ کنول کئی بار کروٹیں بدل کر سونے کی ناکام کوشش کے بعد آسمان کے جگمگاتے ستاروں کو دیکھنے لگی۔ مشرق میں ایک ٹیلے کے عقب سے چاند نمودار ہوا اور ستاروں کی چمک ماند پڑنے لگی۔ کنول کو اچانک ایک خیال آیا اور وہ اٹھ کر جھیل کی طرف چل دی۔

جھیل میں جا بجا کنول کے پھول کھلے ہوئے تھے۔ چمکتے ہوئے جگنو فضا میں رقص کر رہے تھے۔ کنول اپنی ابتدائی زندگی میں ہزاروں بار یہ مناظر دیکھ چکی تھی لیکن اب ان میں وہ دل کشی نام کو نہ تھی۔ بچپن میں وہ ان تمام چیزوں کو اپنی زندگی کا ایک جزو خیال کرتی تھی۔ جگنوؤں کے پیچھے بھاگنے اور کنول کے پھولوں کو توڑ کر ان کی پتیاں

بکھیرنے میں ایک لطف آتا تھا۔ وہ ٹیلوں اور وادیوں میں گھومتے اور جھیل میں تیرتے ہوئے خوش ہوتی تھی — پھر سکھدیو آیا اور اس نے کنول کے زمین و آسمان میں ایک نیا رنگ بھر دیا۔ اور اسے دنیا کی ہر حسین شے سکھدیو کی کسی نہ کسی خوبی کا مظہر نظر آنے لگی۔ اسے پہاڑوں میں سکھدیو کی عظمت، چاند میں اس کی دل فریبی، سورج میں اس کا جاہ و جلال۔ ستاروں میں اس کی مسکراہٹیں اور کنول کے پھولوں میں اس کی پاکیزگی نظر آتی۔ لیکن سکھدیو کی موت کے بعد قدرت کا حسین چہرہ اس کی نگاہوں میں مسخ ہو چکا تھا اور زندگی کے میٹھے راگ تلخ ہو چکے تھے۔

کنول جھیل کے کنارے کے ساتھ ساتھ چلتی گئی۔ ایک ٹیلے کے قریب اسے آم کے درختوں کا ایک جھنڈ دکھائی دیا۔ وہ رکی، جھجکی اور پھر بھاگ کر ایک درخت کے ساتھ لپٹ گئی۔ یہ ان آموں کی بوئی ہوئی گٹھلیاں تھیں جنہیں سکھدیو نے کھایا تھا۔

کنول نے دردبھری آواز میں کہا: "سکھدیو! ہماری محبت کے پودے اب تناور درخت بن چکے ہیں۔ سکھدیو! تم کہاں ہو؟" خاموش کائنات کنول کے اس سوال کا جواب نہ دے سکی اور وہ خیالات کی دنیا میں کھو گئی۔ سکھدیو اس کے سامنے کھڑا تھا اور وہ چارپائی پر پڑے ہوئے آموں کے ڈھیر کی طرف اشارہ کر کے کہہ رہی تھی۔ "کھانے کی چیز کھا لینے میں کیا ہرج ہے۔ آپ شاید پرسوں تک دریا عبور نہ کر سکیں — — شاید چند دن اور یہیں رہیں اتنے دن بغیر کچھ کھائے ...." اور پھر جب وہ اپنے ہاتھ کے لگائے ہوئے پودوں میں سے گھاس اکھاڑ رہی تھی وہ ٹیلے سے اتر کر اس کے پاس آ کھڑا ہوا تھا۔ کنول دھڑکتے ہوئے دل پر ہاتھ رکھ کر یہ کہہ رہی تھی۔ "یہ آم اس دن آپ نے کھائے تھے۔ میں نے گٹھلیاں لا کر اس جگہ بو دیں۔ یہ تمام اُگ آئی ہیں۔"

اچانک آم کے درخت پر سے اُلّو کی خوفناک آواز سنائی دی اور کنول کے تصورات کی حسین دنیا درہم برہم ہو گئی اسے بچوں کا خیال آیا اور وہ تیزی سے قدم اٹھاتی ہوئی واپس چل دی۔

علی الصباح جب بدھو اٹھ کر جھیل میں نہانے کا ارادہ کر رہا تھا اسے کنول کی آواز سنائی دی۔ وہ بچوں کے قریب لیٹی ہوئی گہری نیند میں کہہ رہی تھی میں یہیں ہوں گی۔ یہ میرا وطن ہے۔ میرے بچوں کا وطن ہے۔ میں یہیں رہوں گی۔ یہیں رہوں گی"

بدھو کچھ دیر ماتھے پر ہاتھ رکھ کر بیٹھا سوچتا رہا بالآخر وہ انگڑائی لے کر اٹھا اور مادھو کو جھنجھوڑ کر جگانے لگا۔ مادھو آنکھیں ملتا ہوا اٹھا۔

بدھو نے کہا "چلو نہائیں"

نہانے کی دعوت پر مادھو کی تمام سُستی کافور ہو گئی اور وہ خوشی سے اُچھلتا، کُودتا بدھو کے آگے آگے چل دیا۔

بدھو نے کہا "پہلے کون پہنچے گا؟"

مادھو "میں میں" کہتا ہوا، ہنستا ہُوا بھاگا اور جھیل میں کود کر غوطے لگانے لگا۔

اسی دن بدھو پڑوس کے شودروں کی مدد سے سرکنڈے کا جھونپڑا تعمیر کر رہا تھا۔ شودروں کی زبانی اسے معلوم ہو چکا تھا کہ شہر والے آدھ کوس کے فاصلے کو دھرم کی حفاظت کے لیے کافی سمجھتے ہیں۔ جھیل کے دوسرے کنارے شہر کا بڑا مندر تھا لیکن شہر کی طرح یہ مندر بھی کافی فاصلے پر تھا۔ بدھو کو شودروں کی زبانی یہ بھی معلوم ہُوا کہ اس شہر کا سردار راجہ کے دوسرے سرداروں سے بہت مختلف ہے اگر اسے معلوم ہو جائے کہ کسی راجہ کے کسی سپاہی نے کسی شودر کے ساتھ بلا وجہ سختی کی ہے تو وہ اسے سخت سزا دیتا ہے۔

دن، ہفتوں اور ہفتے مہینوں میں تبدیل ہوتے گئے۔ وقت کا مرہم اگرچہ کنول کے نہ مٹنے والے زخموں کا مداوا نہ بن سکا۔ تاہم درد کی شدت آہستہ آہستہ کم ہوتی گئی۔ مرنے والے شوہر کی محبت اس کی زندہ نشانیوں کی طرف منعطف ہونے لگی۔ بیوہ کی مایوسیاں ایک ماں کی امنگوں میں تبدیل ہونے لگیں۔ بدھو کا دن، بھیڑوں اور بکریوں کے پیچھے گھٹتے اور بڑھتے ہوئے سائے ناپنے میں گزر جاتا وہ شام کو تھکا ہُوا آتا اور کھانا کھا کر سو جاتا۔ اور اگر مادھو اور شانتا اصرار کرتے تو چڑیلوں اور بھوتوں کی کوئی کہانی سنانے بیٹھ جاتا۔ آس پاس کی بستیوں کے چرواہوں سے وہ سماج کے دیوتاؤں کے متعلق بہت کچھ سُن چکا تھا۔ لیکن دیوتا کے معنی اس کے لیے مٹی کی ایک بھیانک مورتی کے سوا کچھ نہ تھے۔ پہاڑی قوم کے ہر چرواہے کی زبان سے دیوتا کا لفظ سن کر وہ یہی سمجھتا کہ کوئی رام اسے بے وقوف بنا چکا ہے۔

دس مہینوں میں کوئی قابلِ ذکر واقعہ پیش نہ آیا۔ برسات کا پہلا مہینہ مادھو اور شانتا کے لیے انتہائی مسرت کا مہینہ تھا۔ وہ دن بھر جھیل میں نہاتے اور شام کے وقت کسی ٹیلے پر چڑھ کر دریا کی روانی کا منظر دیکھتے۔

ننھے پجاری

رات بھر بارش ہونے کی وجہ سے صبح کے وقت ہلکی ہلکی بدلیاں ایک لٹے ہوئے قافلے کی طرح منتشر ہو کر مغرب کا رُخ کر رہی تھیں۔ دُور سے مندر کی گھنٹی کی آواز آ رہی تھی۔ پتھر کے ایک مکان کے کشادہ صحن میں آم کے ایک درخت کے نیچے چند گائیں کھڑی تھیں۔ برآمدے میں ایک کمسن لڑکی بستر سے انگڑائی لے کر اٹھی اور آنکھیں ملتے ہوئے بولی: ماتا! ماتا!!"

"بیٹی! میں دُودھ دوہ رہی ہوں۔"

لڑکی نے صحن میں آ کر پوچھا "ماتا! پتاجی چلے گئے ہیں؟"

ماں نے جواب دیا "بیٹی! وہ تو دیر کے مندر جا پہنچے ہوں گے۔"

لڑکی نے بگڑ کر کہا "مجھے ساتھ کیوں نہیں لے گئے۔ میں نے رات کے وقت آپ سے کہا نہیں تھا کہ مجھے بھی ان کے ساتھ ہی جگا دینا۔"

ماں نے دلاسا دیتے ہوئے جواب دیا "بیٹی! وہ بہت سویرے اٹھے تھے اور جاتے ہوئے کہہ گئے تھے کہ موہنا کو دن چڑھے ناشتہ کرا کر بھیج دینا۔ اب تم ہاتھ منہ دھو کر دودھ پی لو۔ شاید رندھیر آ جائے اس کے ساتھ چلی جانا۔"

موہنی پانی کا کٹورا سامنے رکھ کر بیٹھ گئی۔ اور ابھی منہ دھونے کا ارادہ کر رہی تھی کہ رندھیر بھاگتا ہوا اندر آیا اور اس نے ہانپتے ہوئے کہا "چلو موہنا! جھیل کی طرف چلیں۔ وہاں سے کنول کے پھول لائیں گے۔ رام۔ سروپ۔ اِندر اور

پہلے ہی جا چکے ہیں۔"

موہنی کی ماں بولی "دیکھو رندھیر! اگر جانا ہے تو مندر جاؤ ورنہ موہنی کو یہیں رہنے دو۔"

موہنی منہ پر پانی کے چھینٹے مارتی ہوئی بولی "ماتا! ہم جھیل سے ہوتے ہوئے مندر جائیں گے۔ تمہارے لیے کنول کے پھول لاؤں گی۔"

ماں نے بگڑ کر کہا "بھاڑ میں جائیں تمہارے پھول۔ کہیں پانی میں ڈوب جاؤ گی۔"

"نہیں ماتا! پھول تو رندھیر توڑے گا میں تو پانی کے نزدیک بھی نہیں جاؤں گی۔"

"اچھا بیٹا رندھیر! اس کا خیال رکھنا۔ لو بیٹی۔ دودھ پی لو!"

موہنی نے پیتل کا ایک کٹورا اٹھایا اور ماں کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ ماں نے کٹورا بھر دیا تو وہ ننگے پاؤں رندھیر کے پاس آئی اور آہستہ سے بولی: لو جلدی کرو!"

"میں پی آیا ہوں۔" رندھیر نے سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

"اوں ہوں! یہ پینا پڑے گا ورنہ میں نہیں جاؤں گی۔"

رندھیر نے مسکراتے ہوئے کٹورا لیا اور دودھ پی کر واپس کر دیا۔ موہنی پھر بھاگ کر ماں کے پاس پہنچی اور کہنے لگی "ماتا! آج دو پیوں گی۔ ماں نے مڑ کر رندھیر کی طرف دیکھا وہ ہنس پڑا اور اس نے مسکراتے ہوئے کٹورا بھر دیا۔ موہنی نے دودھ پی کر کٹورا برآمدے میں رکھ دیا اور رندھیر کے ساتھ چل دی۔ ماں نے پیچھے سے آواز دی "بیٹی! دیر نہ لگانا!"

"نہیں بہت جلد آ جاؤں گی۔"

موہنی اس خیال سے کہ شاید ماں واپس نہ بُلا لے۔ رندھیر کے آگے آگے بھاگنے لگی۔

رندھیر کی عمر قریباً دس سال تھی اور موہنی اس سے دو سال چھوٹی تھی موہنی کی ماں کا نام ساوتری تھا۔ رندھیر اس شہر کے سردار کا لڑکا تھا اور اس کی ماں مر چکی تھی۔

جھیل کے کنارے ان بچوں کے ساتھی ایک اجنبی لڑکی کے پاس کھڑے ایک لڑکے کی طرف دیکھ رہے تھے جو جھیل کے گہرے پانی میں غوطے لگا رہا تھا۔

تیرنے والے لڑکے نے ان سب کو داد طلب نگاہوں سے دیکھ کر کہا:

"شانتا! دیکھو میں نیچے سے مٹی لاتا ہوں۔"

شانتا کو ان بچوں کے صاف ستھرے لباس نے مرعوب کر دیا تھا وہ پریشان ہو کر کنارے کی طرف بڑھی اور کہنے لگی: "چلو مادھو! گھر چلیں۔ ماتا انتظار کرتی ہوں گی۔"

"ابھی آیا" مادھو نے یہ کہہ کر غوطہ لگا دیا۔ بچے چند لمحے پریشان کھڑے رہے۔ موہنی دیر تک ضبط نہ کر سکی۔ اس نے ملتجی نگاہوں سے رندھیر کی طرف دیکھا اور کہنے لگی: "رندھیر! وہ بیچارا ڈوب گیا اسے نکال لاؤ نا!"

رندھیر نے جلدی سے کرتا اتار کر پانی میں چھلانگ لگا دی۔ وہ ابھی گہرے پانی میں نہ پہنچا تھا کہ مادھو نے کنارے کے پاس آ کر سر نکالا اور شانتا کی طرف ایک سیب پھینکتے ہوئے بولا: "یہ لو۔"

"آہا سیب!" موہنی نے شانتا کے پاس آتے ہوئے کہا۔

"تم لو گی؟" شانتا نے یہ کہہ کر سیب اس کی طرف بڑھا دیا۔

موہنی نے سیب اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے پوچھا "وہ تمہارا بھائی

ہے؟"

"ہاں!"

"ہمیں بھی سیب لا دو نا!" لچھمی نے مادھو سے مخاطب ہو کر کہا:

"اچھا تمہیں بھی لا دیتا ہوں۔"

مادھو نے چند بار پانی میں غوطے لگائے اور ہر ایک کو ایک سیب لا دیا۔

رندھیر نے بھی سیب حاصل کرنے کے لیے چند بار غوطے لگائے لیکن اس کے ہاتھ کچھ نہ آیا۔

مادھو نے پوچھا "تمہیں بھی لا دوں؟"

رندھیر نے جواب دیا "نہیں میں خود نکالوں گا۔"

رام سروپ اور اندر کنارے کے کم گہرے پانی میں اتر کر کنول کے پھول توڑنے لگے۔ موہنی نے پانی میں اترنے کی بجائے کنارے سے ہاتھ بڑھا کر ایک پھول توڑنے کی کوشش کی لیکن پاؤں پھسلا اور وہ دھم سے پانی میں گر پڑی۔ باقی تمام بچوں نے قہقہہ لگایا۔ رندھیر اس کی مدد کے لیے بڑھا لیکن وہ اس کے پہنچنے سے پہلے اٹھ بیٹھی اور کچھ دیر منہ بسورنے کے بعد بچوں کی ہنسی میں شریک ہو گئی۔

مادھو نے گہرے پانی سے کنول کے چند بڑے بڑے پھول توڑے اور جھیل سے باہر نکل کر جھجکتے ہوئے موہنی کو پیش کر دیئے۔

موہنی نے کچھ کہے بغیر اس کے ہاتھ سے پھول لے لیے۔ مادھو نے پوچھا "اور لا دوں؟"

موہنی نے جواب دیا "نہیں یہ بہت ہیں۔"

مادھو کو اب بھوک محسوس ہو رہی تھی لیکن ان بچوں کو چھوڑ کر اس کا گھر جانے کو جی نہ چاہا اس نے پھر جھیل میں چھلانگ لگا دی۔ اور رندھیر کے پاس جا کر کہا:

"میں غوطہ لگاتا ہوں تم پکڑو گے"؟

"ہاں!"

مادھو نے غوطہ لگایا۔ رندھیر نے اسے پکڑنے کی کوشش کی لیکن وہ بہت دُور جا نکلا اس کے بعد رندھیر نے غوطہ لگایا لیکن مادھو نے اسے پکڑ لیا۔ مادھو اور رندھیر دیر تک اس کھیل میں مصروف رہے۔ موہنی نے کئی آوازیں دیں لیکن رندھیر اس نئی دلچسپی میں مندر کی طرف جانے یا گھر لوٹنے کا خیال چھوڑ چکا تھا۔ باقی بچے اپنے اپنے گھر جا چکے تھے۔ موہنی رندھیر کی بے توجہی سے تنگ آ کر شانتا سے بے تکلف ہونے کی کوشش کر رہی تھی۔

اس نے شانتا کے قریب گھاس پر بیٹھے ہوئے پوچھا "تم بھی تیرنا جانتی ہو؟"

"ہاں اور تم؟"

"مجھے گہرے پانی سے ڈر لگتا ہے۔"

شانتا نے پوچھا "تم شہر سے آئی ہو؟"

"ہاں — اور تم؟"

"ہم یہیں رہتے ہیں۔ جھیل کے کنارے۔"

"تم نے شہر دیکھا ہے؟"

"نہیں! چچا بدھو کہتا ہے شہر کے دیوتا انسانوں کو کھا جاتے ہیں۔"

"پگلی! وہ تو ہماری حفاظت کرتے ہیں۔"

"بھلا تم نے دیوتا دیکھے ہیں؟"

"میں تو ہر روز دیکھتی ہوں تم بھی دیکھو گی؟"

"کہاں؟"

"مندر میں۔"

"مندر میں؟ میں وہاں نہ جاؤں گی۔"

"کیوں؟"

"مجھے ڈر لگتا ہے۔"

"پگلی! بھلا لوگ دیوتاؤں سے بھی ڈرا کرتے ہیں؟"

"تمہیں اُن سے ڈر نہیں لگتا؟"

"نہیں تو۔"

"اگر وہ تمہیں پکڑ کر کھا جائیں تو؟"

"یہ تمہیں کس نے بتایا کہ دیوتا لوگوں کو کھا جاتے ہیں؟"

"چچا بدھو نے۔"

"وہ کون ہے؟"

"میرا چچا۔"

"وہ کوئی جنگلی ہو گا۔"

"جنگلی کیا ہوتا ہے؟"

"جنگلی وہ ہوتا ہے جس نے شہر نہ دیکھا ہو۔"

"تو پھر ہم سب جنگلی ہیں۔ ہم میں سے کسی نے شہر نہیں دیکھا۔ بھلا شہر کے لوگ جنگل کے لوگوں کو مارتے ہیں؟"

"نہیں تو۔"

شانتا شہر کے متعلق کچھ اور پوچھنا چاہتی تھی لیکن مادھو اور رندھیر نے جھیل سے نکل کر اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کر لی۔

مادھو نے رندھیر سے سوال کیا "کل تم یہاں آؤ گے؟"

رندھیر نے جواب دیا۔ "آؤں گا۔"

"تم بنسری بجانا جانتے ہو؟"

"نہیں! ___ تم؟"

"میں جانتا ہوں۔ ٹھہرو! میں تمہیں سناتا ہوں۔"

مادھو کا کُرتہ ایک درخت کی ٹہنی کے ساتھ لٹک رہا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر جیب سے بنسری نکالی اور اسے ہونٹوں سے لگا کر مسکراتی ہوئی نگاہوں سے موہنی اور رندھیر کی طرف دیکھنے لگا۔

موہنی نے کہا۔ "چلو رندھیر! گھر چلیں۔"

مادھو نے اپنا کمال دکھانے کا موقع کھونا مناسب نہ سمجھا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی اُنگلیاں بنسری پر پھرنے لگیں اور فضا میں بھیرویں کا دل کش نغمہ گونجنے لگا۔

رندھیر اور موہنی کے کان موسیقی کی لطافتوں سے نا آشنا نہ تھے۔ بنسری کی لَے انہیں معمول سے زیادہ خوش گوار معلوم ہو رہی تھی۔ شاید اس لیے کہ بنسری بجانے والا اُن کا ہم عمر تھا۔ وہ ایک دوسرے کے تاثرات کا اندازہ کرنے کے لیے بار بار ایک دوسرے کی طرف دیکھتے۔ رندھیر کی آنکھیں زبانِ حال سے کہہ رہی تھیں۔ دیکھا تم نے گھر جانے کی رٹ لگا رکھی تھی اور موہنی کی نگاہیں اس کا جواب دے رہی تھیں۔ کاش! تم بھی اسی طرح بنسری بجا سکتے۔

مادھو نے یہ نغمہ ختم کیا اور فضا میں خاموشی اور اداسی چھا گئی۔ رندھیر اور موہنی ایک گہری دل چسپی سے اس کی طرف دیکھنے لگے۔

شانتا درخت کی ٹہنی سے کرتہ اتار لائی اور مادھو کو دیتے ہوئے بولی:

"اب کرتہ پہنو! گھر چلیں۔"

رندھیر نے جواب دیا: "ہم کل پھر آئیں گے۔ تم بھی آؤ گے نا؟"

"آؤں گا۔" مادھو نے کُرتہ پہنتے ہوئے کہا۔

رندھیر کپڑے پہن کر موہنی کے ساتھ ہو لیا لیکن چند قدم چل کر واپس مڑا اور مادھو سے پوچھنے لگا۔ "تم کہاں جاؤ گے؟"

"ہم جھیل کے اس طرف بستے ہیں۔"

"مَیں کل بنسری لاؤں گا۔ مجھے سکھا دو گے؟"

"سکھا دوں گا۔"

"تمہارا نام کیا ہے؟"

"مادھو اور تمہارا؟"

"رندھیر۔" اس نے جواب دیا۔

"اور تمہارا؟" ___ مادھو نے موہنی سے پوچھا۔

"میرا نام موہنی ہے۔"

"تم بنگلے کے بچے دیکھو گی؟"

"ہاں وہ کہاں ہیں؟"

"تم انہیں مارو گی تو نہیں؟"

"نہیں ماروں گی۔"

"اچھا چلو! تمہیں دکھاتا ہوں۔"

شانتا کا پیمانۂ صبر لبریز ہو چکا تھا۔ اس نے کہا: "میں بنگلے کے بچے دیکھ چکی ہوں۔ مجھے بھوک لگ رہی ہے۔ میں گھر جاؤں گی۔"

"اچھا تم جاؤ۔"

شانتا جھونپڑی کی طرف چل دی۔

رندھیر نے کہا: "چلو موہنی! پھر دیکھیں گے۔"

"نہیں! میں ابھی دیکھوں گی۔ جب تم نہا رہے تھے۔ میری بات بھی نہیں سنتے تھے۔ اب میں بگلے کے بچے دیکھنا چاہتی ہوں تو تم بھاگنا چاہتے ہو!"

"اچھا بھئی چلو!"

رندھیر اور موہنی مادھو کے پیچھے پیچھے چل دیئے۔

چند قدم چل کر مادھو ایک درخت کے اوپر چڑھا اور اس نے ایک گھونسلے میں سے بگلے کے دو بچے اتار کر رندھیر اور موہنی کے سامنے رکھ دیئے۔

موہنی نے پوچھا: "یہ چونچ کیوں کھولتے ہیں؟"

مادھو نے جواب دیا: "انہیں بھوک لگ رہی ہے۔"

موہنی نے کہا: "نہیں تم غلط کہتے ہو۔ یہ بھگوان جی کا نام جپتے ہیں۔"

"بھگوان جی! وہ کیا ہوتا ہے؟"

موہنی نے حیران ہو کر جواب دیا "اوں ہوں۔ تمہیں بھگوان جی کا پتہ نہیں؟ بھگوان جی نے تو ہمیں بنایا ہے۔"

مادھو نے سوال کیا: "تمہیں بھگوان جی نے بنایا ہے؟"

"ہاں۔"

"اور مجھے؟"

"تمہیں بھی اسی نے بنایا ہے۔"

"اور ان پھولوں کو؟"

"یہ بھی بھگوان جی نے بنائے ہیں۔ پتا جی کہتے تھے کہ سب چیزیں بھگوان جی نے بنائی ہیں۔"

مادھو نے پریشان ہو کر سوال کیا "وہ بھگوان جی کہاں ہے؟"

"تم نے ابھی تک بھگوان جی کو نہیں دیکھا۔"

مادھو نے سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ "نہیں!"

"وہ مندر میں ہیں۔ ہم انہیں ہر روز دیکھا کرتے ہیں۔ تم بھی دیکھو گے؟"

"لیکن چچا بدھو تو یہ کہتا تھا کہ مندر میں شہر کے لوگ بچوں کو کھا جاتے ہیں۔"

"وہ تمہیں یونہی ڈراتا ہو گا۔ چلو رندھیر اسے مندر دکھا لائیں۔"

"لیکن دیر ہو جائے گی۔"

"نہیں ہم جلدی سے لوٹ آئیں گے۔"

---

(۲)

مادھو، خوف، تشویش اور تذبذب کے ملے جلے جذبات کے ساتھ موہنی اور رندھیر کے ساتھ مندر کی طرف چل دیا۔ بدھو نے اسے اور شانتا کو مندر کے متعلق ہزاروں خوفناک باتیں سنائی تھیں لیکن موہنی نے یہ کہہ کر وہ تمہیں ڈراتا ہو گا اس کے اکثر توہمات دور کر دیئے تھے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ چچا بدھو اسے اکثر ڈرایا کرتا تھا۔ جب وہ بہت چھوٹا تھا تو وہ اسے یہ کہہ کر درختوں پر چڑھنے سے منع کیا کرتا تھا کہ وہاں چڑیلیں رہتی ہیں لیکن اب وہ اونچے سے اونچے درخت پر چڑھ سکتا تھا اور کسی چڑیل نے اسے نیچے نہ گرایا۔ جب وہ ذرا بڑا ہوا تو بدھو جھیل میں جانے سے روکنے کے لیے یہ کہا کرتا تھا کہ وہاں مگرمچھ رہتے ہیں لیکن اب وہ گہرے پانی میں تیرتا ہے اور مگرمچھ اسے کھانے کے لیے نہیں دوڑتے۔ مندر میں اگر کوئی ڈرانے والی چیز ہوتی تو رندھیر اور موہنی کو کیوں نہ ڈراتی۔

مادھو اپنے دل میں کہہ رہا تھا۔ بدھو چچا مجھے درختوں سے اس لیے ڈراتا تھا

کہ میں گر نہ پڑوں۔ پانی سے اس لیے ڈراتا تھا کہ میں ڈوب نہ جاؤں اور مندر سے شاید اس لیے ڈراتا ہے کہ میں راستہ نہ بھول جاؤں۔ اور شہر ــــ ؟ شہر کے متعلق بھی تو وہ مجھے ڈرایا کرتا تھا۔ ممکن ہے کہ شہر کے متعلق بھی اس نے جھوٹ بولا ہو اگر شہر کے لوگ بچے کھانے والے ہوتے تو رندھیر اور موہنی اور دوسرے بچوں کو کیوں چھوڑتے۔ چچا جھوٹ بولتا ہے۔ آج میں اسے بتاؤں گا کہ میں مندر دیکھ آیا ہوں اور تم شہر کے متعلق بھی جھوٹ بولتے ہو۔

مادھو کا دل خوشی سے اچھلنے لگا لیکن پھر اس کے دل میں ایک خیال آیا وہ بھگوان کیسا ہوگا۔ مندر میں بیٹھ کر یہ سب کچھ کس طرح بناتا ہوگا؟ اس کے دماغ میں بھگوان کی کوئی خیالی تصویر نہ آسکی۔ بہرصورت اسے یہ اطمینان ہو چکا تھا کہ وہ کوئی خوفناک شے نہ ہوگی۔

مندر سے باہر شنکر اور گوپال دو پجاری، آم کے درختوں کی گھنی چھاؤں میں سو رہے تھے۔ موہنی اور رندھیر کے ساتھ مادھو اپنے دماغ میں بھگوان کی عجیب و غریب خیالی تصویریں لیے مندر میں داخل ہوا۔ مندر کے وسیع کمرے میں طرح طرح کی مورتیاں دیکھ کر ہیبت سی طاری ہوگئی۔

"مجھے ڈر لگتا ہے" اس نے واپس مڑتے ہوئے کہا۔

موہنی نے اسے تسلی دی اور کہا "ڈر کس بات کا؟ یہ سب اچھے دیوتا ہیں۔"

"دیوتا؟" اس نے حیران ہو کر سوال کیا۔ "تم تو مجھے بھگوان دکھانے کے لیے لائے تھے وہ جس نے ہمیں بنایا ہے۔"

موہنی نے جواب دیا "وہ دیکھو سب سے اونچے بھگوان جی ہیں آؤ قریب آکر اچھی طرح دیکھو۔ ڈرتے کیوں ہو؟"

مادھو ڈرتے ڈرتے آگے بڑھا۔ رندھیر اور موہنی کی ہنسی سے اس کا خوف

بھی آہستہ آہستہ جاتا رہا اور وہ مورتی جس نے تمام دنیا کی چیزوں کے علاوہ کنول کے پھول اور موہنی جیسی دلفریب صورتیں بنائی تھیں اسے پیاری نظر آنے لگی۔ وہ ذرا اور آگے بڑھا اور چند بار کانپتے ہوئے ہاتھوں سے مورتی کو چھونے کے بعد بے تکلفی سے اس کے جسم پر ہاتھ پھیرنے لگا اس نے موہنی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "یہ ہلتے اور بولتے کیوں نہیں۔ یہ بہت سخت ہیں۔ شاید یہ پتھر کے بنے ہوئے ہیں!"

موہنی نے کہا "ایسا نہ کہو بھگوان جی خفا ہو جائیں گے۔ ان کے سامنے لوگ بھجن گایا کرتے ہیں آؤ ہم بھی گائیں۔"

"بھجن کیا ہوتا ہے؟"

"تمہیں بھجن بھی نہیں آتا۔ اچھا ہم گاتے ہیں تم سنو!"

موہنی اور رندھیر کی شیریں آواز مندر میں گونجنے لگی۔ مادھو چند بار ان کے الفاظ منہ میں دہرانے کے بعد ان کے ساتھ گانے میں شریک ہو گیا۔

بھجن کے اختتام پر مادھو نے پوچھا "میں بھگوان کے سامنے بنسری بجاؤں۔"

رندھیر نے جواب دیا "بجاؤ!"

مادھو نے ایک دل کش ترانہ شروع کیا۔ مندر سے باہر بنسری کے اونچے سروں سے شنکر اور گوپال چونک اٹھے۔

گوپال نے کہا "ارے شنکر! کتنی میٹھی آواز ہے؟"

شنکر نے ڈنڈا سنبھال کر اٹھتے ہوئے کہا "ارے مارے گئے۔ ارے یہ وہی اچھوت لونڈا ہے جو جھیل کے کنارے بنسری بجایا کرتا ہے۔"

شنکر مندر کی طرف بھاگا اور گوپال اس کے پیچھے ہو لیا۔ انہیں بے تحاشا مندر میں داخل ہوتے دیکھ کر مادھو کے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے بنسری گر پڑی

اور وہ رندھیر کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔

مادھو کو دیکھتے ہی شنکر نے غضب ناک ہو کر ڈنڈا اٹھایا اور پیشتر اس کے کہ رندھیر اور موہنی اس کے بچاؤ کی کوشش کر سکتے اس کا ڈنڈا مادھو کے سر پر پڑا مادھو تیورا کر زمین پر گرا اور اس کے سر سے خون کا فوارہ بہہ نکلا۔ شنکر نے دوسری بار ڈنڈا اٹھایا لیکن گوپال نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہنے لگا: "شنکر! یہ بھگوان کا مندر ہے۔ کالی دیوی کا مندر نہیں۔"

رندھیر اگرچہ کم سن تھا لیکن اس کی رگوں میں ایک بہادر کشتری کا خون تھا اور پھر شہر کے سب سے بڑے سردار کے بیٹے کے سامنے ایک معمولی پجاری کی یہ حرکت ایک نئی بات تھی۔

اس نے گرج کر کہا: "تم نے اسے کیوں مارا، اس نے تمہارا کیا بگاڑا تھا؟"

پجاری کو غصے کی حالت میں سردار کے بیٹے کو پہچاننے میں ذرا دیر لگی۔

اس نے کہا "تم اسے لائے تھے یہاں؟"

"ہاں! ہم لائے تھے۔ مجھے گھر پہنچ لینے دو۔ دیکھنا پتا جی تمہارے ساتھ کیا کرتے ہیں۔"

"بے وقوف! تمہارے پتا کو بھی دیکھ لوں گا۔ تم نہیں جانتے۔ یہ ایک اچھوت ہے اور اسے مندر میں لانا مہا پاپ ہے۔" یہ کہہ کر شنکر نے مادھو کو پاؤں سے پکڑا اور گھسیٹتا ہوا مندر سے باہر لے گیا۔ خون کی لکیر بھگوان کی مورتی سے شروع ہوئی سیاہ پتھر کے فرش پر گہرا نشان چھوڑتی ہوئی مندر سے باہر گھاس اور مٹی میں روپوش ہوتی چلی گئی۔

رندھیر غصے سے کانپتا اور موہنی روتی ہوئی اس کے پیچھے جا رہے تھے۔ گوپال رندھیر کو پہچان چکا تھا اور وہ سب سے پیچھے تھا۔ شنکر مادھو کو مندر کے

احاطے سے باہر چھوڑ کر گالیاں دیتا ہوا واپس مڑا۔ اس نے رندھیر کی طرف دیکھا اور دھمکانے کے لیے ڈنڈا دکھاتے ہوئے چلایا: "اور تم اسے ساتھ لائے تھے؟"

اس عرصہ میں گوپال رندھیر کے پاس پہنچ چکا تھا اس نے رندھیر کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا: "اب تم بھاگ جاؤ۔"

گوپال کے ان الفاظ سے رندھیر کی غیرت نے جوش مارا اس نے جلدی سے نیچے جھک کر ایک پتھر اٹھایا اور شنکر کی طرف دے مارا۔ پتھر نشانے پر لگا اور شنکر دونوں ہاتھ ماتھے پر رکھتے ہوئے زمین پر بیٹھ گیا۔

ایسے معاملات میں گوپال شنکر کی نسبت زیادہ آزاد خیال نہ تھا لیکن شنکر سے کسی پرانی رنجش نے اس کے ہاتھ پاؤں باندھ رکھے تھے۔ شنکر انتہائی غصے کی حالت میں رندھیر کو پہچان نہ سکا۔ اگر وہ گوپال کی طرح ٹھنڈے دماغ سے کام لیتا تو شاید پتھر کھا کر بھی واہی تباہی بکنے کی بجائے اپنے دل کو یہ کہہ کر تسلی دینے کی کوشش کرتا کہ یہ پتھر پھینکنے والے ہاتھ کسی معمولی بچے کے ہاتھ نہیں شنکر اپنی پیشانی سے خون پونچھتا ہوا اٹھا اور ڈنڈا اٹھا کر زخم خوردہ چیتے کی طرح رندھیر کی طرف بڑھا لیکن گوپال نے اس کا راستہ روک لیا "پاگل ہو گئے ہو شنکر! جانتے ہو یہ کون ہے؟ ارے یہ سردار رام داس کا بیٹا ہے۔"

گوپال کے ان الفاظ نے شنکر کے دماغ میں جلتے ہوئے انگاروں پر برف کی ڈلی رکھ دی اور وہ ٹھٹک کر رہ گیا۔ ڈنڈے کا وہ سرا جو آسمان کی طرف اٹھ رہا تھا۔ زمین کی طرف جھک گیا۔ اس نے خفیف ہو کر کہا: "اچھا میں پروہت کے پاس جاتا ہوں۔ یہ خواہ سردار کا لڑکا ہو یا راجہ کا۔ اسے یہ حق نہیں پہنچتا کہ شودروں کو ساتھ ملا کر ہمارے مندر بھرشٹ کرے۔"

گوپال نے کہا۔ "تمہاری بھاگ دوڑ کا زیادہ سے زیادہ اثر یہ ہوگا کہ ہمیں دریا

سے پانی لاکر سارا مندر دھونا پڑے گا۔ شنکر یاد رکھو! پروہت کو پرسوں ہی اس
کے باپ نے تین گائیں اور ایک گھوڑا دیا تھا۔ وہ تمام ذمہ داری ہم پر ڈالے گا
اور رام داس سے بگاڑنے کی بجائے اس کے بیٹے مندر میں ہماری جگہ دینے
پجاری رکھ لینا زیادہ آسان ہوگا۔"

شنکر کچھ جواب دیئے بغیر رندھیر اور موہنی کو گھورتا ہوا ایک طرف چل دیا۔

گوپال نے پیچھے سے آواز دے کر پوچھا "کہاں جا رہے ہو؟"

"دریا میں اشنان کے لیے۔ تم مندر سے خون صاف کرو۔"

گوپال نے جواب دیا: "اپنی بلا میرے سر نہ ڈالو۔ تم مندر صاف کرو، میں
تمہاری جگہ اشنان کر آتا ہوں۔"

گوپال کی طنز نے شنکر کی رفتار ذرا تیز کر دی۔

موہنی بھاگ کر مادھو کے پاس پہنچ چکی تھی۔ گوپال نے رندھیر سے کہا "جاؤ
بیٹا! تمہیں معلوم نہیں کہ یہ کتنا بڑا پاپ ہے۔ موہنی کو گھر لے جاؤ۔ وہ نحس شودر
کے پاس کھڑی کیا دیکھ رہی ہے۔ جاؤ! پروہت آنے والا ہے اور مجھے مندر
صاف کرنا ہے ورنہ میں تمہیں گھر چھوڑ آتا۔ کل میرے لیے کھیر لاؤ گے نا؟"

رندھیر کچھ جواب دیئے بغیر موہنی کی طرف چل پڑا اور گوپال مندر کی طرف لوٹ آیا۔

مادھو نے ہوش میں آکر آنکھیں کھولیں اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔

رندھیر نے کہا "موہنی! اس کا خون ابھی بند نہیں ہوا۔ لاؤ کپڑا اس کا زخم باندھ
دوں۔"

موہنی نے جلدی سے اپنی اوڑھنی اتار کر رندھیر کو دی۔ رندھیر نے اس کا
زخم باندھا۔ موہنی سسکیاں لیتی اور آنسو پونچھتی ہوئی مادھو کے سامنے بیٹھ گئی۔

"تمہیں بہت درد ہوتا ہوگا؟" اس نے کہا۔

"نہیں!" مادھو نے سہمی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

رندھیر نے پوچھا "تمہارا گھر کس طرف ہے؟ چلو تمہیں چھوڑ آئیں۔"

موہنی نے تسلی دیتے ہوئے کہا "تم فکر نہ کرو! رندھیر نے تمہارا بدلہ لے لیا
ہے اتنا بڑا پتھر مارا تھا اس کے سر پہ۔"

مادھو نے خوف زدہ ہو کر ادھر ادھر دیکھا اور کہا "چلو! یہاں سے بھاگ چلیں"

رندھیر نے جواب دیا "بھاگنے کی ضرورت نہیں۔ وہ تمہیں اب کچھ نہیں کہے گا"

تینوں بچے وہاں سے چل دیے۔ مادھو نے پہلے ان کے ساتھ پاؤں اٹھانے
کی کوشش کی لیکن چند قدم چل کر اس کی رفتار سست ہو گئی۔ اس نے کہا۔

"میرا سر دکھ رہا ہے۔ ذرا آہستہ چلو۔"

رندھیر اور موہنی نے اپنی رفتار کم کر دی۔

---

(۴)

جھیل کے کنارے پہنچ کر مادھو کو شانتا اور اپنی ماں دکھائی دی — کنول
وحشت بھری نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ مادھو کو دیکھتے ہی وہ باغ باغ
ہو گئی اور تیزی سے اس کی طرف بڑھی۔

"مادھو! مادھو! میرے لال تم کہاں تھے؟" اس نے مسرت کے آنسو پونچھتے
ہوئے کہا۔

"اور یہ کیا ۔ ۔ ۔ ۔ تمہارے سر پہ ۔ ۔ ۔ ۔ اُف! ۔ ۔ ۔ ۔ تمہارے سر سے خون نکل
رہا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ تمہیں کس نے مارا ۔ ۔ ۔ ۔ انہوں نے ۔ ۔ ۔ ۔ ؟" اس نے رندھیر اور
موہنی کی طرف اشارہ کیا۔

"نہیں ماتا! انھوں نے مجھے کچھ نہیں کہا۔"

"تو کس نے مارا تمہیں؟"

مادھو کی خاموشی پر موہنی نے جواب دیا۔ "اسے شنکر نے مارا ہے۔"

کنول نے مادھو کے سر سے پٹی کھولتے ہوئے پوچھا "شنکر کون ہے اس نے میرے لال کو کیوں مارا؟"

رندھیر نے جواب دیا "میں نے بھی اس سے بدلہ لے لیا ہے۔"

کنول نے پوچھا "تم کون ہو بیٹا؟"

"میں رندھیر ہوں ہم اسے بھگوان دکھانے کے لیے مندر لے گئے تھے وہاں شنکر نے اسے مارا۔ میں بھی اس کا سر پھوڑ آیا ہوں۔"

کنول نے بدحواس سی ہو کر کہا "مندر میں . . . . بھگوان دکھانے کیلئے؟"

"ہاں یہ کہتا تھا میں نے بھگوان نہیں دیکھا۔"

عہدِ ماضی کی کئی تصویریں کنول کی آنکھوں میں پھر گئیں اور وہ ایک گہری سوچ میں پڑ گئی۔

موہنی نے پوچھا "تم اس کی ماں ہو؟"

"ہاں بیٹی! یہ اوڑھنی تمہاری ہے؟"

"ہاں۔"

"تمہارا گھر شہر میں ہے؟"

"ہاں۔"

"یہ خون سے بھر گئی ہے۔ میں ابھی اسے دھو دیتی ہوں۔"

"نہیں اسے اس کے سر پہ رہنے دیجیے۔"

"نہیں بیٹی! تمہاری ماں پوچھے گی تو کیا جواب دو گی؟"

"میں نے کئی دوپٹے گنوائے ہیں وہ مجھ سے نہیں پوچھے گی۔ آپ اس کا زخم اچھی طرح باندھ دیں۔"

"تمہارا نام کیا ہے بیٹی؟"

"موہنی۔"

"جیتی رہو بیٹی! چلو مادھو!"

رندھیر نے کہا "چلو ہم بھی چلیں موہنی!"

موہنی نے چلتے چلتے رک کر پوچھا "شنکر کہتا تھا یہ اچھوت ہے تم بھی اچھوت ہو؟"

کنول نے درد بھری آواز میں جواب دیا "میں . . . . میں اچھوت ہوں لیکن میرا بیٹا . . . . !"

موہنی، کنول کا مطلب نہ سمجھ سکی لیکن کم سن ہونے کے باوجود وہ محسوس کیے بغیر نہ رہ سکی کہ اس نے یہ سوال پوچھ کر اچھا نہیں کیا۔ اس نے گھبرا کر دوسرا سوال کیا:

"اچھوت کیا ہوتے ہیں؟"

"تمہیں معلوم نہیں؟"

"نہیں تو!"

کنول نے جواب دیا "اچھوت انسان ہوتے ہیں، محبت کرنے والے انسان۔ لیکن اس دنیا میں انہیں انسان نہیں سمجھا جاتا۔ چلو مادھو! جاؤ بیٹا تم بھی ---!"

موہنی اور رندھیر شہر کی طرف چل دیے۔ مادھو، کنول اور شانتا کچھ دیر وہیں کھڑے ان کی طرف دیکھتے رہے۔ موہنی نے چند بار مڑ مڑ کر دیکھا اور اس کی آنکھیں

مادھو کو ایک نہ بھولنے والا پیغام دے گئیں۔ کنول کو مادھو کا موہنی کی طرف اس طرح دیکھنا پسند نہ تھا لیکن شہر کے خوش وضع اور خوش پوش بچے کچھ اس قدر جاذبِ توجہ تھے کہ اس کی اپنی نگاہیں بھی دیر تک ان کا تعاقب کرتی رہیں۔ بالآخر اس نے مادھو کی طرف دیکھا اور اپنے دل میں کہا "میرے لال! تم ان سے کسی بات میں کم نہیں تمہارا رنگ ان سے زیادہ سفید اور تمہاری آنکھیں ان سے زیادہ خوبصورت ہیں لیکن تم اپنی ماں کے پیٹ سے ایک اچھوت کی قسمت لے کر پیدا ہوتے ہو۔" اس نے مادھو کا بازو پکڑتے ہوئے کہا "چلو بیٹا! کیا دیکھتے ہو، تمہاری دنیا ان کی دنیا سے علیحدہ ہے۔"

جھونپڑی کے قریب پہنچ کر کنول کچھ سوچ کر رک گئی اور مادھو کے سر پر ہاتھ رکھ کر بولی "بدھو کو کچھ نہ بتانا۔ اگر اسے معلوم ہو گیا کہ تمہیں کسی نے مارا ہے تو وہ بدلہ لیے بغیر نہ رہے گا اور ہم سب مصیبت میں پھنس جائیں گے۔"

مادھو نے تسلی دیتے ہوئے کہا "نہیں ماتا! میں اسے نہیں بتاؤں گا۔ میں کہوں گا کہ میں درخت پر سے گر پڑا تھا۔"

"اور مجھ سے یہ بھی وعدہ کرو کہ تم پھر اس طرف نہیں جاؤ گے اور ان بچوں سے ملنے کی کوشش نہیں کرو گے۔"

"کیوں ماتا! انہوں نے تو مجھے نہیں مارا۔"

"بیٹا! اگر ان کے ماں باپ کو علم ہو گیا کہ ان کے بچے ہمارے بچوں کے ساتھ کھیلتے ہیں تو وہ ہمیں اس جگہ سے نکال دیں گے تم جھیل کی دوسری طرف نہ جایا کرو!"

"بہت اچھا ماتا! میں اس طرف نہیں جاؤں گا۔"

(۴)

ارجن، موہنی کا باپ اپنے مکان کے صحن میں آم کے درخت کے سائے تلے چارپائی پر بیٹھا ہوا تھا۔ ساوتری گھبرائی ہوئی باہر سے آئی۔

ارجن نے پوچھا "نہیں آئی موہنی؟"

ساوتری نے جواب دیا۔ "بھگوان جانے کہاں چلی گئی۔ میں رندھیر کے گھر سے بھی پوچھ آئی ہوں۔ وہ بھی ابھی تک نہیں آیا۔"

"تو پھر اس کے ساتھ کہیں کھیل رہی ہو گی۔ تم اس قدر پریشان کیوں ہو جب بھوک لگے گی آ جائے گی۔"

"تم یہاں کیا کرتے ہو جاؤ نا اس کو تلاش کرو وہ جھیل پر گئے ہیں۔ مجھے بہت ڈر لگتا ہے۔۔۔۔!"

ارجن نے ساوتری کو چھیڑنے کی نیت سے کہا "موہنی تمہاری طرح بیوقوف نہیں وہ مندر میں گئی ہو گی۔"

"اچھا آلینے دو اسے! آج میں اس کی اچھی طرح خبر لوں گی۔"

"اسے کچھ نہ کہنا اس عمر میں ہم بھی سارا دن باہر گزارا کرتے تھے۔"

"تمہارے پیار ہی نے تو اسے بگاڑا ہے۔"

"اچھا سر نہ کھاؤ! میں جاتا ہوں۔" ارجن اٹھ کر جوتا پہن رہا تھا کہ باہر کا دروازہ کھلا اور موہنی اور رندھیر داخل ہوئے۔

ارجن نے پھر چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا "لو وہ آ گئی۔ تم نے مفت میں شور مچا رکھا تھا کیوں بیٹی؟" اس نے موہنی سے مخاطب ہو کر پوچھا "تم نے اتنی دیر کہاں لگائی؟"

"پتاجی ہم جھیل پر گئے تھے اور وہاں پر ...... موہنی آگے کچھ نہ کہہ سکی اس کا گلا بیٹھ گیا اور آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔"

"وہاں پر کیا ہُوا؟ ہائیں تم رو رہی ہو بتاؤ تو سہی کیا ہُوا؟"

ساوتری نے کہا "بیٹی! بتاتی کیوں نہیں۔ کیا ہُوا جھیل پر۔ وہاں کسی نے مارا تو نہیں؟"

موہنی نے دل کو قابو میں لانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "جھیل پر ایک لڑکا نہا رہا تھا اس نے مجھے یہ پھول دیے۔ ہمیں بگلے کے بچے دکھائے ہم اسے بھگوان جی کے درشن کرانے کے لیے مندر لے گئے۔ شنکر نے ڈنڈا مار کر اس کا سر پھوڑ دیا" موہنی یہ کہہ کر سسکیاں لینے لگی۔

ارجن نے پوچھا "شنکر نے اسے کیوں مارا؟"

موہنی کی خاموشی پر رندھیر نے جواب دیا "وہ کہتا تھا یہ اچھوت ہے۔"

"اچھوت؟" ارجن نے بدحواس ہو کر کہا "ہرے ہرے! تم اچھوت کو مندر میں لے گئے تھے۔ اور موہنی! یہ پھول تم نے ایک اچھوت کے ہاتھ سے لیے ہیں؟"

"ہاں، اور یہ سیب بھی!"

"انہیں دُور پھینک دو موہنی۔ یہ اپوتر ہیں اور ساوتری! تم موہنی کو نہلا کر اس کے کپڑے بدل دو۔"

موہنی ان پھولوں کے اپوتر ہونے کا راز نہ سمجھ سکی وہ بولی "پتاجی! یہ تو اس نے جھیل کے صاف پانی سے توڑے تھے۔"

"پانی صاف ہو یا گدلا۔ اچھوت کے ہاتھ کے توڑے ہوئے پھول پوتر نہیں ہو سکتے۔"

"پتاجی! اس کے ہاتھ بھی صاف تھے۔ ہم گئے تھے تو وہ نہا رہا تھا۔"

ارجن نے گرجتی ہوئی آواز میں کہا "اچھوت نہا کر چھوت نہیں بن سکتے مٹی ڈھل کر ہیرا نہیں بن سکتی۔ پھینک دو ان پھولوں کو۔"

موہنی نے ارجن کی منطق سے زیادہ اس کی گرجتی ہُوئی آواز سے مرعوب ہو کر پھول پھینک دیے۔ صحن میں کھڑی ہوئی بچھیا اٹھ کر پھولوں کی طرف بڑھی اور چند بار سونگھنے کے بعد منہ کھولے بغیر پیچھے ہٹ گئی۔

ارجن نے کہا "دیکھا ہماری گائیں بھی شودروں کے ہاتھ کی شے نہیں کھاتیں!"

رندھیر جو اس وقت تک خاموش کھڑا تھا، بول اٹھا "کنول کے پھول تو گائے کھایا ہی نہیں کرتی اگر آپ اپنے ہاتھوں سے بھی توڑ کر لائیں تو بھی یہ مُنہ نہ لگائے گی۔ بہت بھوکی ہو تو شاید کھا لے۔"

"تم خاموش رہو" ارجن نے اپنا کھسیانہ پن چھپاتے ہوئے کہا۔

رندھیر خاموش ہو گیا۔ موہنی نے اس کا دل رکھنے کے لیے اس بحث کو طول دینا ضروری خیال کیا۔ وہ بولی: "پتاجی! اس کے ہاتھ بالکل ہماری طرح تھے اگر یہ پھول ہمارے ہاتھوں سے اپوتر نہیں ہوتے تو اس کے ہاتھ لگنے سے کیسے اپوتر ہو گئے؟"

"بیٹی! وہ سر سے لے کر پاؤں تک اپوتر ہیں اور ان کی چھوت سے ہر پوتر شے اپوتر ہو جاتی ہے۔"

"پتاجی! انہیں مندر میں لے جانا بھی پاپ ہے؟"

"مہا پاپ"

"کیوں؟"

"اس لیے کہ بھگوان انہیں دیکھ کر خوش نہیں ہوتا۔ وہ بھگوان کے مندر کو بھرشٹ کر دیتے ہیں۔"

"بھگوان ان سے نفرت کیوں کرتا ہے کیا وہ اس کے بنائے ہوئے نہیں؟"

"تم بہت بے وقوف ہو موہنی۔ بھگوان نے انہیں بنایا ہے لیکن وہ نیچ ذات ہیں۔"

"وہ نیچ ذات کیوں ہیں؟"

"کیونکہ بھگوان نے انہیں اپوتر مٹی سے بنایا ہے۔"

"بھگوان نے انہیں اپوتر مٹی سے کیوں بنایا؟"

"موہنی اب زیادہ بکواس کی تو زبان کھینچ ڈالوں گا۔ بھگوان کی مرضی میں ہم دخل نہیں دے سکتے وہ جسے چاہتا ہے اونچی ذات اور جسے چاہتا ہے نیچی ذات میں پیدا کرتا ہے۔ دنیا کی تمام چیزیں ایک جیسی نہیں ہوتیں چاند سورج سے چھوٹا اور ستارے اس سے چھوٹے ہیں۔ باغ میں کوئی درخت بڑا اور کوئی چھوٹا ہوتا ہے۔ کانٹے دار جھاڑیاں اور پھل دار درخت ایک ہی باغ میں اُگتے ہیں۔ لیکن ایک کو کاٹ کر جلایا جاتا ہے اور دوسرے کو سلامت رکھنے کے لیے پانی دیا جاتا ہے۔"

موہنی بظاہر مطمئن ہو کر خاموش ہو گئی لیکن وہ دل ہی دل میں ایسے بے انصاف بھگوان کو کوس رہی تھی جس نے شنکر جیسے بدوضع آدمی کو پوتر اور مادھو جیسے خوب صورت لڑکے کو اپوتر مٹی سے پیدا کیا تھا۔ اس بحث کے اختتام پر اس کے دماغ میں بھگوان کا تصور ایک زبردست مگر نا انصاف۔ ایک عظیم لیکن ہیبت ناک طاقت کا تھا اور اپنے انصاف پسند اور رحم دل بھگوان کا یہ نیا تصور اس کے معصوم دل پر ایک ناقابلِ برداشت بوجھ تھا۔ عام حالات میں موہنی کی عمر کی کوئی اور

لڑکی شاید اس مسئلہ پر زیادہ غور نہ کرتی لیکن وہ غیر معمولی طور پر ذہین تھی اور کسی واقعہ کو سطحی نظر سے دیکھنے کی عادی نہ تھی اس کے دماغ پر جو بھگوان کے بہترین تصورات سے روشن تھا نادانستہ طور پر اضطراب کی سیاہی آہستہ آہستہ قبضہ جمانے لگی۔

بھگوان کا اوتار

چار سال کی جسمانی اور ذہنی ترقی نے ان بچّوں کو چھوت اور اچھوت کے درمیان پیدائشی فرق کا اعتراف کرنے پر مجبور کر دیا۔ رندھیر اور موہنی کے ماحول نے انہیں یہ سکھا دیا تھا کہ وہ پچھلے جنم کی کسی نیکی کی بدولت اونچی ذات والوں کے گھر پیدا ہوئے ہیں۔ مادھو کو بھی اپنے متعلق یہ علم ہو چکا تھا کہ وہ ایک بدقسمت اچھوت ہے لیکن اسے اس سوال کا جواب دینے والا کوئی نہ تھا کہ وہ اچھوت کیوں ہے؟

اپنے جھونپڑے کے باہر اس کی پرواز صرف ان لوگوں کے گھروں تک محدود تھی جو اس کی طرح ہندو سماج کے خوب صورت اور مقدس شہر کی چار دیواری سے باہر اپنے بوسیدہ جھونپڑوں میں زندگی کے بُرے بھلے دن گزار رہے تھے اور یہ سوچنے کی ضرورت ہی نہ سمجھتے تھے کہ وہ اچھوت کیوں ہیں۔ انہیں اونچی ذات والوں کے اس عقیدہ کا بھی علم نہ تھا کہ وہ پچھلے جنم کے کسی ناقابلِ تلافی گناہ کی سزا بھگتنے کے لیے اچھوت بنا دیے گئے ہیں۔

معمولی حالات میں مادھو کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ ان مسائل پر زیادہ توجہ دیتا۔ لیکن موہنی اور رندھیر کی ملاقات پر یہ نیا انکشاف کہ تمام چیزیں بھگوان کی بنائی ہوئی ہیں اس کی سادہ اور مختصر سی کتابِ زندگی میں ایک نئے باب کا اضافہ کر چکا تھا۔ وہ صبح و شام ایک اونچے ٹیلے پر چڑھ کر کبھی شہر اور کبھی اچھوتوں کی بستی کی

طرف دیکھتا اسے ایک طرف مسرت رقص کرتی اور دوسری طرف بے کسی کے آنسو بہاتی نظر آتی۔ وہ جھونپڑوں کی غربت اور افلاس کے دل شکن مناظر سے آنکھیں پھیر لیتا اور شہر کے اونچے ایوانوں کی شان و شوکت اور ان میں بسنے والوں کی عظمت سے مرعوب ہو کر رہ جاتا۔ جب سورج غروب ہو جانے پر شہر کے قریب مندر کی گھنٹی بجتی اور فضا میں ناقوس کی آواز گونجتی تو اس کے خیالات اس عظیم الشان عمارت کے ارد گرد چکر لگانے جس میں دنیا کی ہر ادنیٰ اور اعلیٰ شے کا پیدا کرنے والا موجود تھا۔

مندر کے بھگوان کی خیالی تصویر اس کی آنکھوں کے سامنے آ جاتی اور وہ اپنی بدحالی اور بے کسی بھول کر کائنات کی اس زبردست قوت کی تعظیم کے لیے سر جھکا دیتا جس کے دم سے دریاؤں کی روانی، پہاڑوں کی رنگینی اور پھولوں کی تازگی قائم تھی جس کے اشاروں پر ہوائیں چلتیں۔ بادل دوڑتے اور بجلیاں کوندتی تھیں۔ جس نے سورج کو جاہ و جلال، چاند کو دل فریبی۔ ستاروں کو دل کشی اور پھولوں کو رعنائی عطا کی تھی۔ مادھو کو بھگوان کے روشن تصورات کے سامنے اپنے ماحول کی تاریکیاں سمٹتی نظر آتیں۔ زمین و آسمان پر بھگوان کی عظمت کا اعتراف کروانے کے لیے بہت کچھ تھا۔ اور اگر یہ دل کش مناظر نہ بھی ہوتے تو بھی مادھو اس بھگوان کو کیوں کر بُرا کہہ سکتا تھا جس نے رندھیر اور موہنی جیسی تصویریں بنائی تھیں۔

اگر مادھو اور ان بچّوں کے درمیان سماج کی ناقابلِ عبور دیوار حائل نہ ہوتی اور اگر ان سے ملنے کی تمام راہیں مسدود نہ ہوتیں تو یہ دنیا اس کے لیے کس قدر رنگین ہوتی؟ قدرت کے یہ مناظر اسے کس قدر حسین نظر آتے؟ رندھیر اسے یاد آتا تھا لیکن اس کی یاد میں وہ بے قراری نہ تھی جو موہنی کی یاد میں تھی۔ موہنی کے بغیر اسے بھگوان کی یہ دنیا ان تمام حسین مناظر کے باوجود غیر مکمل نظر آتی تھی۔

جب رات کی تاریکی اچھوتوں کے جھونپڑوں کو اور زیادہ بے رونق بنا دیتی

اور شہر کا ہر کوچہ چراغوں سے جگمگا اٹھتا تو مادھو کے معصوم دل میں اضطراب کی ایک لہر اٹھتی وہ اپنے دل میں کہتا رندھیر اور موہنی اونچی ذات کے بچوں کے ساتھ ان چراغوں کی روشنی میں کھیلتے ہوں گے۔ کاش! میں بھی ان میں سے ایک ہوتا۔ ان کے ساتھ کھیلتا۔ انہیں بنسری سناتا۔ ان کے ساتھ بھگوان کے خوبصورت مندروں کی سیر کرتا۔ وہ مجھے بھول چکے ہوں گے۔ نہیں! نہیں!! وہ مجھے نہیں بھولے ہوں گے۔ وہ کسی دن میری تلاش میں ضرور آئیں گے۔ میں رندھیر کو جھیل عبور کر کے دکھاؤں گا۔ موہنی کو گہرے پانی سے پھول لا کر دوں گا۔ وہ بہت خوش ہوگی لیکن نہیں — میں ایک اچھوت ہوں وہ میرے توڑے ہوئے پھولوں کو ہاتھ نہیں لگائے گی — وہ میری طرف دیکھ کر آنکھیں بند کر لے گی۔ میری آواز سن کر اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لے گی۔ . . . لیکن کیوں؟"

مادھو رات کے وقت سونے سے پہلے اکثر یہ ارادہ کرتا کہ صبح وہ جھیل کے دوسرے کنارے جا کر موہنی اور رندھیر کی راہ دیکھے گا لیکن رات کی تاریکی کے سہانے سپنوں کی دنیا صبح کی روشنی میں درہم برہم ہو جاتی وہ کبھی تو جھیل کے دوسرے کنارے جانے کا ارادہ بدل دیتا اور کبھی امید و بیم کے ملے جلے جذبات کے ساتھ بدھوا اور کنول سے آنکھ بچا کر اپنی منزلِ مقصود کا رُخ کرتا لیکن مندر تک پہنچتے پہنچتے مصلحتیں اس کی اٹھتی ہوئی امنگوں کو دبا لیتیں۔

اسے بار بار یہ خیالات پریشان کرتے۔ شہر والوں نے انہیں چھوت اور اچھوت کا فرق سمجھا دیا ہوگا۔ ممکن ہے کہ وہ میری طرف دیکھ کر حقارت سے منہ پھیر لیں لیکن اگر وہ بدل نہ بھی گئے ہوں تو بھی میرا ان سے ملنا ٹھیک نہیں ہے اگر شہر والوں کو اس بات کا علم ہو گیا تو ہمیں مار کر نکال دیں گے اور پھر ان سے ملنے کی امید ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گی۔ یہ سوچ کر مادھو واپس لوٹ آتا

لیکن عقل ہر وقت دل کا ساتھ نہ دیتی۔ بعض اوقات ارادے کا سیلاب مصلحتوں کے بند کو بہا لے جاتا۔ اور مادھو مندر کے راستے کے قریب کسی جھاڑی کے نیچے چھپ کر یا کسی درخت کے اوپر چڑھ کر موہنی کی راہ دیکھتا۔ چند مرتبہ اسے رندھیر اور موہنی کو مندر کی طرف جاتے ہوئے دیکھنے میں کامیابی بھی ہوئی لیکن وہ اکیلے نہ تھے۔ شہر کی چند لڑکیاں اور لڑکے ان کے ساتھ ہوتے اور مادھو کو ان کے سامنے جانے کی جرأت نہ ہوتی۔

---

(۲)

ایک دن وہ درخت پر چڑھ کر ان کا انتظار کر رہا تھا کہ رندھیر، موہنی اور گاؤں کے اور آٹھ دس بچے آئے اور جھیل کے کنارے کھیل کود میں مصروف ہو گئے۔ رندھیر کو دوسرے لڑکوں کے ساتھ تیرتا دیکھ کر مادھو کے دل میں کئی بار درخت سے اتر کر جھیل میں کودنے کا خیال آیا لیکن ایک شعور کا احساسِ کمتری اس کی راہ میں حائل رہا۔ موہنی اپنی سہیلیوں کے ساتھ اس درخت سے پندرہ بیس گز کے فاصلے پر جھیل کے کنارے کھڑی تھی۔ مادھو کے نزدیک دوسرے درخت پر ایک کوئل نے کُو ہُو، کُو ہُو کا ترانہ چھیڑا اور موہنی درخت کی طرف منہ پھیر کر کوئل سے کہیں زیادہ میٹھی آواز میں اس کے نغموں کا جواب دینے لگی۔ مادھو کو اس کا چہرہ اب اچھی طرح نظر آ رہا تھا۔ شہر کے دوسرے بچوں کے ساتھ وہ تاروں میں چاند معلوم ہوتی تھی۔

موہنی کُو ہُو، کُو ہُو کرتی ہوئی کوئل کو دیکھنے کے لیے درخت کی طرف بڑھی۔ مادھو کا دل دھڑکنے لگا۔ وہ موہنی کی نگاہوں سے بچتا درخت کی ٹہنیوں سے

لٹکتا ہوا ایک سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے درخت پر جا پہنچا اب وہ جھیل کے کنارے کھیلنے والے بچّوں کی نگاہوں کی رسائی سے باہر تھا۔ اسے صرف موہنی نظر آ رہی تھی۔ کوئل خاموش ہو چکی تھی اور موہنی درختوں کے درمیان کھڑی اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔ مادھو درخت سے نیچے اُترا اور موہنی کی طرف دیکھنے لگا اس کا دل مسرت کے سمندر میں غوطے کھا رہا تھا۔ موہنی کوئل کو دیکھنے سے مایوس ہو کر واپس لوٹنے لگی۔

مادھو نے محسوس کیا کہ قدرت کا ہاتھ اسے مسرت کے آسمان سے کھینچ کر زمین کی بھیانک گہرائیوں کی طرف لا رہا ہے۔ اتنی خواہشوں، التجاؤں اور دعاؤں کے بعد موہنی آئی اور اب جا رہی ہے۔ مادھو اسے برداشت نہ کر سکا۔ شودر کا احساس کہتری فنا ہو گیا۔ انسانیت کا دبا ہوا شعور جاگ اٹھا اور اس شعور کے بے پناہ سیلاب کے ایک ہی ریلے نے تمام وہ دیواریں جو چھوت اور اچھوت کے درمیان صدیوں میں تعمیر ہوئی تھیں توڑ ڈالیں۔ مادھو نے جلدی سے اپنی جیب سے بنسری نکالی اور موہنی کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے دھیمے سُروں میں ایک نغمہ چھیڑ دیا۔ یہ دھیمے سُر شودر کی دبی ہوئی آواز کے ترجمان تھے۔ موہنی بنسری کی آواز سن کر رُکی کچھ سوچ کر واپس مُڑی اور اضطراب، مسرت اور خوف کے ملے جلے جذبات کے ساتھ اِدھر اُدھر دیکھتی ہوئی مادھو کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ مادھو کے دل میں ایک طوفان سا اٹھا اور بنسری اس کے ہونٹوں سے جُدا ہو گئی۔

موہنی نے کہا: "کون؟ مادھو — مادھو . . . !

موہنی کی آواز میں نفرت یا حقارت کی بجائے شفقت، انس اور مُروّت پا کر مادھو نے مسکرانے کی کوشش کی۔ لیکن اس مسکراہٹ کے ساتھ احسانمندی کے آنسو اس کی آنکھوں میں چھلکنے لگے۔

"موہنی! تم آ گئیں! تم نے مجھے پہچان لیا؟" مادھو نے یہ کہتے ہوئے آنکھیں جھپکیں اور چمکتے ہوئے آنسوؤں کے قطرے اس کی آنکھوں سے ٹپک کر گالوں پر سے ہوتے ہوئے زمین پہ آ گرے۔

موہنی نے کہا: "میں اور رندھیر کئی بار جھیل پہ آئے لیکن تم کہیں نظر نہ آئے اتنی مدت کہاں رہے؟"

مادھو نے جواب دیا۔ "تو تم مجھے بھولے نہیں — میں یہیں رہتا تھا۔ ماتا نے جھیل پر آنے سے منع کر دیا تھا لیکن میں چھپ چھپ کر کئی بار یہاں آیا ہوں تمہیں بھی کئی بار دیکھ چکا ہوں لیکن تمہارے ساتھ دوسروں کو دیکھ کر میں تمہارے سامنے نہ آ سکا۔"

موہنی ایک گہری سوچ میں کچھ دیر مادھو کی طرف دیکھتی رہی وہ شہر کے تمام لڑکوں سے خوبصورت تھا اس کا جسم مندر کی سب سے زیادہ حسین مورتی سے زیادہ سڈول اور متناسب تھا لیکن پھر بھی وہ ایک شودر تھا اور موہنی حیران تھی کہ اسے اس سے نفرت کیوں نہیں ہوتی وہ اس کو دیکھ رہی تھی اس کی آواز سُن رہی تھی اس کے باوجود وہ اپنی جگہ سے نہ ہل سکی۔ شودر کے آنسو کچھ دیر اس کے وہاں ٹھہرنے کی قیمت ادا کر چکے تھے۔

اچانک رندھیر کی آواز آئی "موہنا! موہنا!! کہاں ہو؟ آؤ گھر چلیں۔"

موہنی نے خوف زدہ ہو کر کہا "میں جاتی ہوں۔"

مادھو نے سراپا التجا بن کر کہا "پھر آؤ گی؟"

"شاید . . . . مجھے معلوم نہیں" موہنی نے جھیل کی طرف بھاگتے ہوئے جواب دیا۔

مادھو کی زندگی کی روشنی درختوں کی آڑ میں غائب ہو گئی لیکن اس کے دل

کی مغموم فضا میں امید کے ہزاروں چراغ جگمگا اٹھے۔ وہ اچھلتا، کودتا اور بنسری بجاتا ہوا گھر پہنچا۔ کنول نے کھانا لا کر سامنے رکھا اس نے چند لقمے کھائے اور کہا "ماتا! مجھے بھوک نہیں۔"

"آج بہت خوش ہو بیٹا! کہاں گئے تھے؟"

"یہیں تھا ماتا! تمہیں بنسری سناتا ہوں۔"

مادھو یہ کہہ کر بنسری بجانے لگا۔ آس پاس کے شودروں کے بچے اس کی بنسری کی آواز سن کر اس کے گھر جمع ہو گئے۔

شام کے وقت حسبِ معمول مادھو نے ایک پہاڑی کا رُخ کیا۔ آج اسے اپنا جسم بہت ہلکا معلوم ہوتا تھا اور وہ چلنے کی بجائے بھاگ رہا تھا۔ پہاڑی کی چوٹی پر پہنچ کر اس نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ آج بھگوان کی دنیا اسے مکمل نظر آتی تھی۔ آج اسے بھگوان کی زبردست قوت کا اعتراف ہوا تھا۔ موہنی اسی کے اشارے سے جھیل پر پہنچی تھی اسے درخت کی طرف متوجہ کرنے کے لیے کوئل کو بھی اسی نے بھیجا تھا۔ اس کی بنسری کے سروں کو بھگوان ہی نے یہ تاثیر عطا کی تھی کہ موہنی چلتے چلتے واپس لوٹ آتی اور یہ بھی اسی کی دیا تھی کہ ایک اونچی ذات کی لڑکی نے اتنے سالوں کے بعد اسے دیکھتے ہی پہچان لیا اور اس کے ساتھ نفرت سے پیش نہ آئی۔

بھگوان کے اس خوش گوار تصور نے اس کی دبی ہوئی امنگوں کو اٹھتے ہوئے ولولوں میں تبدیل کر دیا وہ تصور میں اپنی بوسیدہ جھونپڑی سے نکل کر شہر کے خوبصورت مکانات کی سیر کر رہا تھا۔ وہ ایک ایسی دنیا کی تعمیر کا خواب دیکھ رہا تھا جس میں بسنے والے چھوت اور اچھوت کے الفاظ سے ناآشنا تھے۔ بھگوان کی زبردست طاقت پر اعتماد اور یقین کی بدولت زندگی کے ہر افق پر مایوسی

کی گھٹائیں اسے صبح کی آمد کا پیغام دینے لگیں۔ اس نے آسمان کی طرف دیکھا اور کہا:

"بھگوان! میں جانتا ہوں کہ میں ایک اچھوت ہوں۔ مجھے تیرے مندر میں پاؤں رکھنے کی اجازت نہیں ہے۔ میں ان کے شہر میں بھی نہیں جا سکتا لیکن تُو بھگوان ہے اور تیرے لیے یہ مشکل نہیں کہ دنیا سے چھوت اور اچھوت کا امتیاز مٹا دے۔" اس دعا کے بعد مادھو اونچی آواز میں وہ بھجن گانے لگا جو اس نے چند سال قبل رندھیر اور موہنی سے مندر میں سیکھا تھا۔

اگلے دن مادھو جھیل کے کنارے چکنی مٹی سے بھگوان کی عجیب و غریب مورتی بنا کر اسے خوش کرنے کے لیے بھجن گا رہا تھا۔

---

(۳)

دو سال اور گزر گئے۔ مادھو اس عرصہ میں مٹی کی مورتیاں بنانے میں کافی مہارت حاصل کر چکا تھا۔ کئی مورتیاں بنا بنا کر توڑنے کے بعد اس نے ایک ایسی مورتی بنائی جو باقی تمام مورتیوں کے مقابلے میں خوب صورت تھی۔ مادھو نے اسے جھیل کے کنارے ایک جھاڑی میں چھپا کر رکھ دیا۔

دو دن میں کم از کم ایک بار جھیل پر ضرور آتا اور بھگوان کی خود ساختہ مورتی کے سامنے موہنی اور رندھیر سے سیکھا ہوا بھجن گا کر واپس آ جاتا۔

ایک دن رندھیر اور موہنی مندر سے واپس آتے ہوئے جھیل کے قریب سے گزرے انہیں کچھ فاصلے پر بنسری کی دل کش آواز سنائی دی۔ موہنی نے چلتے چلتے رک کر کہا: "رندھیر! بھلا یہ بنسری بجانے والا کون ہو سکتا ہے؟"

رندھیر نے جواب دیا "میں نے پرسوں یہاں سے گزرتے ہوئے بھی یہ
آواز سنی تھی۔ کوئی خوب بجاتا ہے!"

"تم نے اسے کبھی دیکھا نہیں؟"

"کبھی نہیں۔"

"تم نے دیکھا ہے لیکن تم بھول گئے ہو۔"

"میں نے دیکھا ہے! کب؟"

موہنی نے کہا "تمہیں وہ دن یاد ہے جب ہمیں جھیل کے کنارے ایک لڑکا
ملا تھا اور ہم اسے مندر میں لے گئے تھے۔"

"ہاں وہ ......" رندھیر نے اپنے حافظہ پر زور دیتے ہوئے کہا: "جسے
شنکر نے مارا تھا۔ کیا نام تھا اس کا ..... مادھو؟"

موہنی نے اثبات میں سر ہلایا اور کہا "چلو اسے دیکھیں۔"

"لیکن وہ تو شاید اچھوت تھا۔"

موہنی کا دل بیٹھ گیا اس نے کہا "لیکن مجھے یقین نہیں آتا کہ وہ اچھوت
ہے۔ شاید تم بھی اسے دیکھ کر اچھوت نہ کہہ سکو۔"

رندھیر نے جواب دیا "اچھوت شکل سے تو ظاہر نہیں ہوتے۔"

موہنی نے کہا "رندھیر! بھلا ہم اچھوتوں سے نفرت کیوں کرتے ہیں؟"

رندھیر کو موہنی اور اس کے باپ کا مباحثہ یاد آ گیا۔ اس نے جواب دیا "میں
نے اس کے متعلق کبھی نہیں سوچا۔"

بنسری کا دل کش نغمہ ختم ہوا اور کسی کے گانے کی آواز سنائی دی۔ یہ
وہی بھجن تھا جسے مادھو بھیرویں کے دل کش سُروں میں گا رہا تھا۔

رندھیر نے چونک کر کہا "نہیں، یہ کوئی اچھوت نہیں ہو سکتا۔ یہ بھجن گا رہا

ہے اور اس کی آواز ہمارے شہر کے تمام بھجن گانے والوں سے میٹھی ہے۔ چلو
موہنی اسے دیکھیں!"

موہنی رندھیر کو بتانا چاہتی تھی کہ یہ وہی بھجن ہے جو مادھو نے ان سے مندر
میں سیکھا تھا۔ لیکن مادھو کو دیکھنے کی خواہش اس کی ہر خواہش پر غالب آ گئی اور وہ
کچھ کہے بغیر رندھیر کے ساتھ چل دی۔

کچھ دُور چلنے کے بعد موہنی اور رندھیر ایک جھاڑی کے قریب کھڑے مادھو
کو اپنے دل کش راگ کی گہرائیوں میں کھویا ہوا دیکھ رہے تھے۔ رندھیر اسے
پہچان نہ سکا۔

مادھو نے راگ ختم کر کے آنکھیں اوپر اٹھائیں اور رندھیر اور موہنی کو دیکھ کر
مبہوت سا ہو کر رہ گیا اس نے تھوڑی دیر کے بعد سنبھل کر کہا "تم آ گئے! بھگوان
نے تمہیں بھیج دیا۔"

اس سوال پر رندھیر نے موہنی اور موہنی نے رندھیر کی طرف دیکھا۔ بالآخر موہنی
نے جواب دیا "ہم تمہاری آواز سن کر آئے ہیں۔ تم بہت اچھا گاتے ہو۔"

"تمہیں میرا گانا پسند ہے؟"

"کیوں نہیں۔ رندھیر ابھی یہ کہہ رہا تھا کہ ہمارے شہر میں تم سے اچھا گانے
والا کوئی نہیں۔"

رندھیر نے پوچھا: "تم مادھو ہو؟"

"ہاں تم نے مجھے نہیں پہچانا؟"

"یہ بھجن تم نے کہاں سے سیکھا؟"

"تمہیں یاد نہیں۔ تم ہی نے تو سکھایا تھا مجھے۔"

"کہاں! کب؟"

"اس دن! مندر میں؟"

رندھیر کو بہت سی باتیں یاد آگئیں اس نے پھر پوچھا "لیکن یہ تو بہت مدت کی بات ہے تمہیں اب تک یہ بھجن کیسے یاد رہا؟"

"میں اسے ہر روز بھگوان کے سامنے گایا کرتا ہوں۔"

"تمہارا بھگوان؟ وہ کہاں ہے؟"

"اس جھاڑی میں۔ ٹھہرو میں تمہیں ابھی دکھاتا ہوں۔ مادھو نے جھک کر جھاڑی کے نیچے سے مٹی کی مورتی نکالی اور اس کے سامنے رکھ دی۔

رندھیر نے پوچھا: "یہ تم کہاں سے لائے؟"

مادھو نے جواب دیا "میں نے خود بنایا ہے۔ یہ تمہارے بھگوان سے بہت چھوٹا ہے میں اب ایک بڑا بھگوان بناؤں گا۔ بالکل تمہارے بھگوان جیسا۔ تم اسے دیکھنے کے لیے آؤ گے؟"

اس کے جواب میں رندھیر اور موہنی خاموش رہے۔

مادھو نے سراپا التجا بن کر آنکھوں میں آنسو بھرتے ہوئے کہا۔ ضرور آنا میں ہر روز پہاڑی پر چڑھ کر تمہارے خوبصورت شہر کو دیکھا کرتا ہوں۔ سال میں ایک رات وہاں بہت روشنی ہوا کرتی ہے۔ ہر مکان پر چراغوں کی قطاریں نظر آتی ہیں۔"

موہنی نے کہا "ہاں وہ دیوالی کی رات ہوتی ہے۔"

"دیوالی کیا ہوتی ہے؟"

اس دن رام چندر جی لنکا کو فتح کر کے گھر واپس آئے تھے اور شہر والوں نے ان کے آنے کی خوشی میں دیے جلائے تھے۔"

"رام چندر جی کون تھے؟"

"وہ بھگوان کے اوتار تھے۔"

"بھگوان کا اوتار کیا ہوتا ہے؟"

"ایک ایسا انسان جس میں بھگوان جیسی طاقت ہو۔"

"انسان میں بھگوان جیسی طاقت کیسے آسکتی ہے؟"

"اس کی پوجا کرنے سے۔"

"تو میں بھی بھگوان کی پوجا کیا کروں گا لیکن ماتا کہتی تھی کہ تم خواہ کچھ کرو، اونچی ذات والوں کی برابری نہیں کر سکتے۔ کیا میں بھگوان کی پوجا سے بھی تمہارے جیسا نہیں بن سکتا؟"

موہنی خاموش رہی۔ اس کی آنکھیں رندھیر سے اس سوال کا جواب پوچھ رہی تھیں۔

مادھو نے بیتاب ہو کر کہا: "بتاؤ! بھگوان کے لیے بتاؤ۔ کیا میں تمام عمر شودر رہوں گا؟"

موہنی نے جواب دیا۔ نہیں! نہیں!! بھگوان تمہاری مدد کریں گے۔"

کسی نے جھیل کی طرف سے آواز دی۔ "بھیا! بھیا!!"

مادھو نے شانتا کی آواز پہچان کر جلدی سے مورتی کو اٹھا کر جھاڑی میں چھپا دیا اور کہا "شانتا میں یہاں ہوں۔"

رندھیر اور موہنی جانا چاہتے تھے لیکن شانتا کو دیکھ کر رک گئے۔ شانتا نے درختوں کی آڑ سے نمودار ہوتے ہوئے کہا "میں ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک گئی۔ تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

مادھو نے جواب دیا: "کچھ نہیں۔ شانتا آؤ۔"

مادھو کے پاس رندھیر اور موہنی کو دیکھ کر شانتا لجاتی ہوئی آگے بڑھی۔

"یہ تمہاری بہن ہے؟" رندھیر نے سوال کیا۔

"ہاں! تم نے نہیں پہچانا اسے؟"

رندھیر نے مادھو کو کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے شانتا کو کئی بار سر سے پاؤں تک دیکھنے کے بعد اپنے دل میں کہا: "کیا یہ ممکن ہے کہ یہ دونوں بہن بھائی شودر ہوں۔ ہمارے شہر میں اُن جیسا کوئی برہمن ہے نہ کشتری۔ کیا بھگوان ایسی صورتیں بنا کر ان سے نفرت کر سکتا ہے؟"

رندھیر نے کہا "اچھا مادھو! اب ہم جاتے ہیں لیکن میں تم سے ایک بات کہتا ہوں:"

"کہو۔"

"وہ مورتی چھپا کر رکھنا اور آئندہ شہر کے کسی آدمی کے سامنے یہ بھجن نہ گانا۔"

"مورتی تو میں چچا کے ڈر سے چھپا کر رکھتا ہوں لیکن بھجن گانے میں کیا ہرج ہے؟"

"تم نہیں جانتے لیکن اس میں تمہاری بھلائی ہے۔ چلو موہنی!"

رندھیر اور موہنی چل دیے اور مادھو اور شانتا دیر تک کھڑے انہیں دیکھتے رہے۔

"یہ کون تھے؟" شانتا نے پوچھا۔

مادھو نے جواب دیا "بھگوان کے اوتار۔"

"وہ کیا ہوتے ہیں؟"

"تم نہ سمجھ سکو گی۔ چلو گھر چلیں۔"

شانتا نے منہ بناتے ہوئے کہا "واہ! تو میں تمہاری جیسی سمجھ بھی نہیں رکھتی تمہارا مطلب یہی تھا نا کہ یہ شہر والے ہیں؟"

مادھو ہنس پڑا۔

اب تک رندھیر کی زندگی کی تمام دلچسپیاں سیر و شکار۔ نیزہ بازی اور گھوڑے کی سواری تک محدود تھیں۔ اس کے لیے بھگوان دیوتا، چھوت اور اچھوت کے متعلق سنجیدگی سے سوچنے کا یہ پہلا موقع تھا۔ اس نے چلتے چلتے رک کر موہنی سے سوال کیا: "موہنی کیا یہ ہو سکتا ہے کہ بھگوان، شانتا اور مادھو جیسی صورتیں بنائے اور پھر ان سے نفرت کرے؟"

موہنی نے جواب دیا: "رندھیر! میرا تو یہ خیال ہے کہ بھگوان کسی سے بھی نفرت نہیں کرتا۔ جب ایک ماں اپنے خوبصورت اور بدصورت بچوں سے یکساں طور پر پیار کرتی ہے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ بھگوان! جس نے ہم سب کو پیدا کیا ہے سب کو ایک جیسی آنکھیں اور ایک جیسے ہاتھ پاؤں دیے ہیں۔ وہ ایک انسان کو پوتر اور دوسرے کو اپوتر سمجھتا ہو ---؟"

سنگ تراش

شام کے وقت آسمان پر بادل چھا رہے تھے۔ کنول، بدھو، شانتا اور مادھو کھانا کھانے کے بعد جھونپڑی سے باہر چارپائیوں پر لیٹ گئے۔ مغرب کی طرف بجلی چمکی اور بدھو اٹھ کر بیٹھ گیا۔

کنول نے کہا: "کیوں بھیا! تم تو کہتے تھے مجھے بہت نیند آرہی ہے۔"

بدھو نے چارپائی اٹھاتے ہوئے جواب دیا "یہ بادل برسے گا ضرور، اور میری نیند خراب ہوگی۔ میں اندر جاتا ہوں۔ آج گرمی تو ہے نہیں۔"

شانتا نے کہا "میں بھی اندر سوؤں گی۔ چلو بھیا! تم بھی اندر چلو۔"

مادھو، شانتا کی طرف متوجہ ہونے کے بجائے کنول سے مخاطب ہوکر بولا: "ماتا! اٹھو۔ تمہاری چارپائی اندر ڈال دوں۔ بارش آگئی تو رات کو تمہاری نیند خراب ہوگی۔"

کنول اٹھ کر جھونپڑی میں چلی گئی اور مادھو نے اس کی چارپائی اٹھا کر اندر پہنچا دی۔

کنول نے اپنی چارپائی پر لیٹتے ہوئے کہا: "بیٹا! تم بھی اپنی چارپائی اندر لے آؤ۔"

مادھو نے باہر نکلتے ہوئے جواب دیا: "مجھے ابھی نیند نہیں آئی ماتا! اندر کچھ گرمی ہے۔ میں ابھی آجاتا ہوں۔"

بدھو نے کہا "بارش آگئی تو ہمیں نہ جگانا۔"

"نہیں چچا! میں دبے پاؤں اندر آجاؤں گا۔"

مادھو باہر آکر اپنی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ دور سے مندر کی گھنٹی کی آواز آرہی تھی اور مادھو کا دل دھڑک رہا تھا۔

شانتا نے اندر سے آواز دی "بھیا! مجھے کہانی سناؤ۔"

مادھو نے جواب دیا "اری چپ! چچا کی نیند خراب ہوگی۔"

"شور نہ کرو شانتا!" بدھو نے کروٹ بدلتے ہوئے کہا۔

"تو میں باہر آجاتی ہوں۔"

شانتا دبے پاؤں باہر نکلی اور مادھو جلدی سے بستر پر لیٹ کر خراٹے لینے لگا۔

"ہوں مکار کہیں کا۔ ابھی باتیں کر رہا تھا اور اتنی جلدی سو بھی گیا ہے۔"

"دیکھو شانتا! مجھے تنگ نہ کرو ورنہ پیٹوں گا۔"

کنول نے اندر سے آواز دی "شانتا! کیوں تنگ کرتی ہو اسے۔ تمہیں رات کو بھی آرام نہیں آتا؟"

بدھو پھر ایک بار بڑبڑایا "شانتا کیا شور مچا رکھا ہے تم نے؟"

شانتا مایوس ہوکر اندر چلی گئی۔

مادھو بستر سے اٹھا اور دبے پاؤں جھونپڑی کے پیچھے سے ہوتا ہوا جھیل کی طرف چل دیا۔ تھوڑی دور جاکر وہ راستے کے درختوں اور جھاڑیوں سے بچتا ہوا پوری رفتار کے ساتھ مندر کی طرف بھاگنے لگا۔ جھیل کے کنارے مینڈکوں اور جھینگروں نے آسمان سر پر اٹھا رکھا تھا۔ لیکن مادھو کے کان صرف ایک آواز سن رہے تھے اور وہ مندر کی گھنٹی کی آواز تھی۔ گھنٹی پر ہر نئی ضرب اس کے دل کی دھڑکن اور قدموں کی رفتار میں اضافہ کر رہی تھی۔ وہ بھاگتے ہوئے بار بار

یہ فقرہ دُہرا رہا تھا "میں بھگوان کا اوتار بنوں گا .... میں بھگوان کا اوتار بنوں گا۔"

---

(۱۲)

مندر سے کچھ فاصلے پر مادھو رُکا اور تھوڑی دیر سانس لینے کے بعد اِدھر اُدھر دیکھتا ہُوا آہستہ آہستہ پاؤں اُٹھانے لگا۔ مندر کے دروازوں سے چراغوں کی روشنی نظر آتے ہی اس نے محسوس کیا کہ مندر کے نگہبانوں کی خوفناک آنکھیں اسے گھور رہی ہیں۔ آسمان پر بادل کی سیاہ چادر کہیں کہیں پھٹ چکی تھی اور تارے نظر آ رہے تھے۔ مادھو کھُلی فضا سے ہٹ کر درختوں کے تاریک سائے میں کھڑا ہو گیا۔ مندر کی گھنٹی بند ہو چکی تھی اور اندر کوئی بھجن گا رہا تھا۔ مادھو بھجن کے الفاظ اچھی طرح نہ سُن سکا۔ وہ جھجکتا ہُوا آگے بڑھا اور سب سے آخری درخت کے نیچے پہنچ گیا جو مندر کے برآمدے سے کوئی بیس قدم دُور تھا۔ بھجن کے الفاظ اب اسے صاف طور پر سنائی دینے لگے۔ مندر کے دروازے سے اسے چند آدمیوں کی ٹانگیں نظر آ رہی تھیں۔ اس نے جھک کر دیکھا چار آدمی پچھلی دیوار کی طرف منہ کیے ایک مورتی کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔ ان میں سے ایک بھجن گا رہا تھا، مادھو اس کے ساتھ ساتھ بھجن کے الفاظ دہراتا رہا۔ بھجن ختم ہُوا اور چاروں پجاری باہر نکل آئے۔ مادھو چراغوں کی دھیمی روشنی میں کسی کو نہ پہچان سکا تاہم دو آدمیوں کے متعلق اسے شک ہُوا کہ یہ مندر کے پرانے نگہبان ہیں۔

ایک نے کہا "پروہت جی! اندھیرا ہے میں آپ کو گھر چھوڑ آؤں؟"

پروہت نے جواب دیا "اور پھر تمہیں یہاں چھوڑنے کے لیے کون آئیگا؟"

دوسرا بولا "ٹھیک ہے پروہت جی! شنکر بھوتوں سے بہت ڈرتا ہے میں آپ کو چھوڑ آتا ہوں۔"

پروہت نے پھر جواب دیا "شنکر ڈرتا ہے لیکن میں نہیں ڈرتا، میں اکیلا جاؤں گا۔ تم دونوں جسونت جی کی سیوا میں رہو۔" پروہت یہ کہہ کر ایک پست قامت آدمی کی طرف متوجہ ہُوا۔ "آپ کو یہاں کوئی تکلیف تو نہیں۔"

پست قامت آدمی نے جواب دیا "نہیں! مجھے یہاں کوئی تکلیف نہیں۔"

"مورتی کب تک تیار ہو جائے گی؟"

"بس اب تھوڑا سا کام رہتا ہے کوئی دو ہفتے لگیں گے۔"

"اچھا! نمسکار۔" اس کے جواب میں نمسکار کی تین آوازیں آئیں۔

پروہت کو آم کے درخت کے قریب سے گزرتا دیکھ کر مادھو دم بخود سا ہو کر درخت کے ساتھ چمٹ گیا۔ باقی تینوں مندر کے صحن کی ایک طرف چارپائیوں پر لیٹ گئے۔

شنکر نے سوال کیا "آپ نے اب تک کتنی مورتیاں بنائی ہیں؟"

پست قد آدمی نے جواب دیا "کوئی دو سو۔"

"بھلا آپ کالی دیوی کی مورتی بھی بنا سکتے ہیں؟"

"رام نگر کے مندر میں کالی دیوی کی مورتی میں نے ہی تو بنائی تھی۔ راجہ نے مجھے ایک ہاتھی انعام دیا تھا۔"

"ہاتھی! اسے آپ کیا کرتے ہوں گے؟"

"کچھ بھی نہیں۔ مفت کی مصیبت تھی۔ میں نے پروہت کو دے دیا تھا۔"

گوپال نے کہا: "رام نگر میں کالی دیوی کا مندر بہت مشہور ہے۔ کہتے ہیں وہاں ہر سال کئی آدمیوں کا بلیدان دیا جاتا ہے۔"

"ہاں پہلے دن سات شودروں کا بلیدان دیا گیا تھا۔"

شنکر نے کہا "اب تک یہاں کالی دیوی کا مندر سُونا پڑا ہے اور شودروں کی نسل اس قدر بڑھ رہی ہے کہ اگر ہر ہر روز بلیدان دیا جائے تو بھی ختم نہ ہوں مُورتی کے سامنے کبھی کبھی پشو دان دیا جاتا ہے اور بس۔"

ٹھگنے قد کے آدمی نے کہا "میں نے سُنا ہے کہ تمہارا سردار شودروں پر بہت مہربان ہے؟"

شنکر نے جواب دیا "جیسا راجہ ویسا سردار۔ بڑے پروہت نے کئی بار راجہ سے اس کی شکایت کی ہے لیکن وہ سنتا ہی نہیں۔"

"تو پھر یہ راج دیر تک نہیں رہے گا۔"

"آپ کو کیا بتاؤں! یہاں تو اچھوت اس قدر سر چڑھ گئے ہیں کہ ہم تنگ آ گئے ہیں۔ وہ جھیلوں میں نہاتے ہیں۔ دریا میں مچھلیاں پکڑتے ہیں اور اگر راہ چلتے کہیں ان کا سامنا ہو جائے تو مجال کیا کہ راستہ چھوڑ کر ایک طرف ہو جائیں ہمیں خود ہٹنا پڑتا ہے۔"

گوپال نے کہا "جسونت جی! اس میں نہ راجہ کا قصور ہے اور نہ سردار کا۔ یہ علاقہ فتح کیے ہمیں زیادہ دیر نہیں ہوئی۔ شروع شروع میں ان کے ساتھ سختی کی گئی لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ دُور دُور کے پہاڑوں میں چھپ چھپ کر ہمارے ساتھ جنگ کرتے رہے۔ راجہ کی فوجوں کا بہت نقصان ہوا۔ پہلے سردار نے ان پر سختیاں کر کے وہ کامیابی حاصل نہیں کی جو رام داس نے نرمی سے حاصل کی ہے۔ انہوں نے شودروں کا سا سلوک کرنے سے پہلے انہیں شودر بنا لینا ضروری سمجھا۔ سردار رام داس کے سلوک سے یہ لوگ اب بھول چکے ہیں کہ یہ ہمارے غلام ہیں اور آہستہ آہستہ شودر بنتے جا رہے ہیں لیکن ابھی تک ان میں کسی حد

تک بغاوت کا جذبہ موجود ہے۔ اگر آج ہی ہم ان کے ساتھ سختی شروع کر دیں تو وہ ہمیں دشمن سمجھ کر اپنی کھوئی ہوئی آزادی حاصل کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوں گے۔ کیا دشمن کو جگا کر اس کے خلاف جنگ کرنے کی بجائے اسے سُلا کر اس کا گلا گھونٹ دینا آسان نہیں؟"

"تم درست کہتے ہو" پست قد کے آدمی نے جواب دیا۔

"شنکر! سو گئے؟" گوپال نے پوچھا۔

شنکر کو گوپال کی باتوں سے عام طور پر نیند آ جایا کرتی تھی۔ وہ خراٹے لے رہا تھا۔

اس گفتگو نے مادھو کی کتاب زندگی کا ایک نیا ورق الٹ دیا۔ دنیا اس کے سامنے ایک وسیع جھیل تھی۔ جہاں بڑی مچھلیاں چھوٹی مچھلیوں کو نگل رہی تھیں اس نے محسوس کیا کہ لوگ دنیا میں بھگوان کی مرضی پوری کرنے کی بجائے اس کے نام کی آڑ لے کر دنیا کے کمزور انسانوں پر ایک دائمی تسلط قائم کرنا چاہتے ہیں۔ سب کو بنانے والا بھگوان ایک پر مہربان اور دوسرے کا دشمن نہیں ہو سکتا۔ کیا اس کے بادل سب پر نہیں برستے۔ اس کی ہوائیں سب تک نہیں پہنچتیں کیا اس کا سورج سب کو روشنی نہیں پہنچاتا اور اس کی زمین سب کے لیے اناج اور پھل کے خفیہ خزانے نہیں اگلتی۔ بھگوان برا نہیں، وہ ہمارا دشمن نہیں۔ یہ لوگ تلواروں اور نیزوں کے علاوہ مکر و فریب کے خوفناک ہتھیاروں سے مسلح ہیں لیکن ہم کیا کر سکتے ہیں؟ ہم ان کے گھوڑوں اور ہاتھیوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے اور نہ ان کے سامنے ہاتھ پھیلا سکتے ہیں۔ میں بھگوان کی پوجا کروں گا۔ میں بھگوان کا اوتار بنوں گا:

مادھو دیر تک وہاں کھڑا رہا اور جب اسے اچھی طرح اطمینان ہو گیا کہ مندر کے نگہبان سو چکے ہیں۔ تو وہ زمین پر ہاتھ ٹیک کر ایک چوپائے کی طرح آہستہ آہستہ

چلتا ہوا مندر کی طرف بڑھا۔ برآمدے میں ایک پتھر کی نامکمل مورتی اور ان اوزاروں پر کوئی خاص توجہ نہ دی۔ اور مندر میں داخل ہو کر بھگوان کی مورتی کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ دبی زبان سے کہہ رہا تھا:

"بھگوان! میں تیرا اوتار بننا چاہتا ہوں۔ کیا تو شودروں سے نفرت کرتا ہے۔ کیا تو نے ہمیں نہیں بنایا؟ بھگوان! بھگوان!!

مادھو مورتی کے پاؤں پر گر کر سسکیاں لینے لگا۔

باہر درخت پر چمگادڑ کے پھڑپھڑانے کی آہٹ سن کر مادھو خوف زدہ ہو کر اُٹھا اور دروازے کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ مندر کے نگہبانوں کے خراٹے ان کی بے خبری کا پتہ دے رہے تھے۔ مادھو واپس مڑ کر پھر مورتی کی طرف متوجہ ہوا اور دبی زبان میں کہنے لگا: "بھگوان! تیرے مندر کے دروازے میرے لیے بند ہیں لیکن میں تیری پوجا کرنا چاہتا ہوں۔ تیرا اوتار بننا چاہتا ہوں۔ اگر تیرے پجاری میرا راستہ نہ روکتے تو میں ہر روز یہاں آتا۔ تجھے بنسری سناتا۔ تیرے لیے بھجن گاتا۔ جھیل کے صاف پانی سے کنول کے بڑے بڑے پھول لا کر تیرے پاؤں میں ڈھیر کرتا۔" یہاں تک کہہ کر مادھو کو ایک خیال آیا۔ اور اس کے دل میں مسرت کی لہریں اٹھنے لگیں۔ "تیرے ہاتھ چکنی مٹی کی مورتی بنا سکتے ہیں۔ کیا تو ایک پتھر کی مورتی نہیں تراش سکتا؟"

اس کی نگاہیں بھگوان کی مورتی کا طول و عرض ناپنے لگیں اور اس کے کانپتے ہوئے ہاتھ مورتی کے جسم پر پھرنے لگے۔

"لیکن سفید پتھر؟" اس نے اپنے دل سے سوال کیا اور تھوڑی دیر سوچنے کے بعد اس نے خود ہی یہ جواب دیا: "دریا پر بہت ہیں۔"

---

(۳)

صبح کے وقت مندر کے برآمدے میں نامکمل مورتی کے پاس پڑے ہوئے سنگ تراشی کے بہت سے اوزار غائب تھے۔ ٹھگنے سنگ تراش نے آسمان سر پر اٹھا رکھا تھا۔ "وہ ہتھوڑا میں نے دلی سے خریدا تھا۔ وہ تیشہ میں نے بنارس سے لیا تھا۔ اور فلاں فلاں اوزار میں نے فلاں فلاں جگہ سے لیے تھے اب مجھے پھر رام نگر جانا پڑے گا۔ دُہائی بھگوان کی! ارے بھگوان کے مندر میں چوری!!"

دوسری طرف شنکر، گوپال کو اور گوپال شنکر کو بُرا بھلا کہہ رہا تھا: "تم ایک گدھے کی نیند سوتے ہو؟"

"تمہارے خراٹوں سے مینڈک کی سی آواز نکلتی ہے۔"

بالآخر دونوں نے فیصلہ کیا کہ "رات کے وقت یہاں کوئی نہیں آیا۔"

ٹھگنے سنگ تراش نے غصے سے ایڑیاں اوپر اٹھاتے، دانت پیستے اور اپنے سر پر دوہتڑ لگاتے ہوئے کہا: "ضرور آیا ہے۔ شام تک میرے اوزار یہیں تھے اگر کوئی نہیں آیا تو میرے چور تم ہو۔ میں پروہت کے پاس جاؤں گا۔ میں سردار کے پاس جاؤں گا۔ میں راجہ کے پاس جاؤں گا .... میں ... میں ....؟"

گوپال اور شنکر حیران تھے کہ یہ وہی ہے جو دوسروں کو ہاتھی وان کیا کرتا ہے!"

دوپہر کے وقت شہر میں سردار رام داس کے سامنے پروہت، شنکر، گوپال اور سنگ تراش اپنی بدحواسیوں کا مظاہرہ کر رہے تھے۔

سنگ تراش اپنی کھوئی ہوئی دولت حاصل کرنا چاہتا تھا۔ شنکر شودروں کے خلاف حکومت کی طرف سے سخت کارروائی کا مطالبہ کر رہا تھا۔

پروہت اپنے مندر کے پجاریوں کو بچانا چاہتا تھا۔ رام داس کو حکومت

کی بدنامی کا خوف تھا وہ شودروں کے متعلق شنکر کی باتوں سے پیدا ہونے والے شکوک رفع کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

گوپال اب تک خاموش کھڑا تھا۔ رام داس نے پوچھا "کیوں گوپال! تمہارا کیا خیال ہے؟"

گوپال اس واقعہ پر شنکر اور پروہت کی طرح پریشان نہ تھا۔ مندر میں چوری بے شک ایک بُرا فعل تھا لیکن گوپال کو اس بات کی خوشی تھی کہ سنگ تراش کو ہاتھی دان کرنے کے متعلق گپیں ہانکنے کی سزا ملی ہے اب اس کے لیے سنگ تراش سے تمام گالیوں کا بدلہ لینے کا موقع تھا اس نے جواب دیا: "بھگوان نے جو عقل آپ کو دی ہے ہم اُس تک نہیں پہنچ سکتے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ یہ جو کچھ ہوا بھگوان کی مرضی سے ہوا۔ بھگوان چور بھی بھیج سکتا ہے اور دھرتی ماتا کو بھی اس کے اوزار غائب کرنے کا حکم دے سکتا ہے۔ میرا خیال ہے اس کے اوزار دھرتی ماتا نے غائب کیے ہیں شاید اس لیے کہ جو مورتی یہ بنانا چاہتا ہے وہ بھگوان کو پسند نہ تھی اور یا شاید اس لیے کہ اس نے بھگوان کے مندر میں ہم سے بہت جھوٹ بولا تھا اور اسے اس جھوٹ کی سزا ملی ہے۔"

سنگ تراش نے آپے سے باہر ہوتے ہوئے کہا: "جھوٹ! جھوٹ!! اے پاپی! میں نے تم سے کیا جھوٹ بولا ہے؟"

گوپال نے جواب دیا: "ٹھہرو! میں بتاتا ہوں۔ ہاں پروہت جی! میں آپ سے ایک بات پوچھتا ہوں اس کی عمر کیا ہوگی؟"

پروہت نے سنگ تراش کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے جواب دیا: "کوئی ساٹھ برس۔"

سنگ تراش نے بگڑ کر کہا: "ساٹھ نہیں پچاس بلکہ دو مہینے کم۔"

گوپال نے پروہت سے دوسرا سوال کیا: "کیوں پروہت جی! رام نگر میں کالی دیوی کا مندر کب بنا تھا؟"

پروہت نے جواب دیا "اسے صدیاں ہو گئیں۔"

"اور مورتی کو؟"

"وہ بھی بہت پرانی ہے۔"

"یہ کہتا ہے کہ کالی دیوی کی مورتی میں نے بنائی ہے اور اسے ایک ہاتھی انعام ملا تھا۔"

"یہ بکتا ہے، یہ بکتا ہے۔" سنگ تراش نے آپے سے باہر ہوتے ہوئے کہا۔

گوپال نے کہا "مہاراج! آپ شنکر سے پوچھ لیجیے۔"

رام داس نے پوچھا "کیوں شنکر؟"

عام حالات میں شنکر گوپال کی تائید میں کبھی گواہی نہ دیتا۔ لیکن اس کے دل پر سنگ تراش کی گالیوں کے زخم ابھی تازہ تھے۔ اس نے جواب دیا "صرف رام نگر کی کالی دیوی ہی نہیں سرکار، یہ تو کہتا تھا کہ ہندوستان کے تمام بڑے بڑے مندروں کی مورتیاں میں نے بنائی ہیں اور راجوں اور مہاراجوں نے مجھے اتنے ہاتھی دیے ہیں کہ میرے گھر انہیں باندھنے کی جگہ نہیں اور میں نے انہیں ہندوستان کے تمام بڑے بڑے پروہتوں کو دان کر دیا ہے۔"

اب پروہت کی باری تھی اس نے ہنستے ہوئے کہا "مجھے تو اس نے بکری کا بچہ بھی نہیں دیا۔"

سنگ تراش کی ایڑیاں زمین سے اُٹھ چکی تھیں اور اس کا جسم غصے سے کانپ رہا تھا اس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا "یہ پاپ ہے! ـــ یہ اندھیر ہے!! میرے اوزار ان بدمعاشوں نے ہی چرائے ہیں میں ان سے بدلہ لوں گا میں راجہ

کے پاس جاؤں گا۔"

رام داس نے اپنی جیب سے سونے کے تین سکے نکالتے ہوئے سنگ تراش کے سامنے پھینک دیے اور کہا: "یہ لو! اور بھاگو یہاں سے۔ ہمیں تمہاری بنائی ہوئی مورتی کی بھی ضرورت نہیں۔"

سنگ تراش نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے سکے اٹھائے اور باہر نکل آیا۔

پروہت، شنکر اور گوپال کے سر سے گویا بلا ٹل گئی۔

مندر کی طرف واپس جاتے ہوئے گوپال نے شنکر سے کہا "شاباش بیٹا! جھوٹ بولنا تمہارا ہی حصہ ہے۔ خوب گت بنائی اس الو کی!"

شام کے وقت رام داس نے گوپال کو بلا بھیجا۔ جب وہ شہر سے واپس آیا تو اس کے ساتھ ایک گائے تھی اس نے شنکر کو دور سے آواز دی "بیٹا شنکر! سردار نے مجھے دان کیا ہے۔ تم دودھ اور مکھن میں میرے حصہ دار ہو۔ صرف گھاس لانا پڑے گی۔"

شنکر کلیجہ مسوس کر رہ گیا۔

---

(۴)

شام کے وقت ارجن نے کھانا کھاتے ہوئے ساوتری سے کہا "تم نے سنا۔ گزشتہ رات کسی نے مندر سے سنگ تراش کے اوزار چرا لیے ہیں!"

ساوتری نے حیران ہو کر کہا "بھگوان کے مندر میں چوری! بھلا ایسا پاپ کون کر سکتا ہے؟"

"یہ کسی شودر کا کام ہو سکتا ہے۔"

موہنی کا ماتھا ٹھنکا وہ ارجن کے قریب آ کر کھڑی ہو گئی اور کہنے لگی: "پتا جی چور کا کچھ پتہ نہیں لگا؟"

"بیٹی تلاش ہو رہی ہے اگر چور پکڑا گیا تو بہت بڑی سزا دی جائے گی اسے۔"

"کیسی سزا پتا جی؟"

"میرے خیال میں اس کا بلیدان دیا جائے گا۔"

"اگر کوئی اونچی ذات کا ہوا تو بھی؟"

"پگلی کہیں کی۔ بھلا اونچی ذات کا آدمی مندر میں چوری کر سکتا ہے؟ یہ کسی شودر کا کام ہے۔"

موہنی خاموش ہو گئی اور ارجن اور ساوتری کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد سو گئے۔ موہنی دیر تک جاگتی رہی اسے بار بار مادھو کا خیال آ رہا تھا اور وہ بار بار اپنے دل کو یہ کہہ کر تسلی دے رہی تھی کہ مادھو ایسا نہیں کر سکتا۔ وہ ہرگز ایسا نہیں کر سکتا۔ بھگوان کرے کہ اس نے ایسا نہ کیا ہو۔ آدھی رات کے بعد نیند نے اس کے خیالات سپنوں میں تبدیل کر دیے ـــــ وہ جھیل کے کنارے مادھو سے باتیں کر رہی تھی۔

وہ کہہ رہا تھا: "موہنی میں ایک بہت بڑا بھگوان بنا رہا ہوں۔ بالکل تمہارے بھگوان جیسا۔ مجھے پتھر تراشنے کے اوزار مل گئے ہیں۔"

اور وہ کہہ رہی تھی: "مادھو! یہ اوزار چھپا دو۔ وہ تمہیں پکڑ کر لے جائیں گے اور تمہارا بلیدان دیا جائے گا۔"

جھاڑیوں میں سے سردار کے سپاہی نمودار ہوئے۔ اور مادھو کو پکڑ کر لے گئے۔ موہنی ان کی منتیں کر رہی تھی: "اسے چھوڑ دو اس کا کوئی قصور نہیں۔" وہ

اسے کالی دیوی کی مورتی کے سامنے لے گئے۔ کالی دیوی کی خوفناک شکل دیکھ کر موہنی کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔

ساوتری گھبرا کر اٹھی اور اس نے آواز دی "کیا ہے موہنی؟"

موہنی نے خوف سے کانپتے ہوئے جواب دیا "کچھ نہیں ماتا!"

"بیٹی ڈر لگتا ہے تو آکر میرے پاس لیٹ جاؤ۔"

موہنی نے جواب دیا نہیں ماتا۔ اب صبح ہو رہی ہے۔ میں بھگوان کی پوجا کروں گی۔"

ارجن کے مکان کا ایک کمرہ پوجا پاٹ کے لیے وقف تھا۔ موہنی اٹھی اور ہاتھ منہ دھو کر سنگ مرمر کی ایک مورتی کے سامنے ہاتھ باندھ کر بیٹھ گئی۔ اس نے میٹھی آواز میں چند بھجن گائے اور پھر درد بھرے دل سے دعا کی "بھگوان تو جانتا ہے کہ وہ بے قصور ہے۔ اسے تیرا نام بھی معلوم نہ تھا۔ یہ سب کچھ ہم نے اسے بتایا ہم نے اسے مندر کا راستہ دکھایا۔ بھگوان! وہ سچے دل سے تجھ سے پریم کرتا ہے اور تجھ سے پریم کرنا پاپ نہیں۔ کیا تو نے اسے پیدا نہیں کیا؟ وہ جس دماغ سے تیرے متعلق سوچتا ہے جن ہاتھوں سے تیری مورتیاں بناتا ہے۔ جس زبان سے تیرے لیے بھجن گاتا ہے اور جس دل سے تجھے پریم کرتا ہے سب تیرے بنائے ہوئے ہیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تو اپنے بنائے ہوئے انسانوں کے پریم کا جواب نفرت سے دے اور پھر اس کی صورت بھی تو ایسی نہیں کہ اسے بنانے والا اس سے نفرت کر سکے۔"

موہنی کی آنکھوں میں مادھو کی صورت پھرنے لگی۔ اس نے صبح کی دھندلی روشنی میں مورتی کی طرف دیکھا اور مادھو کے سامنے اس کا مقابلہ کرنے لگی۔ سنگ مرمر کی بے جان مورتی میں ایک پراسرار ہیبت کے سوا کچھ نہ تھا اس کے مقابلے

میں مادھو کے خدوخال کی رعنائی اور دلفریبی کہیں زیادہ تھی۔ مورتی کی بے حس اور پرسکون آنکھوں کے مقابلے میں اسے مادھو کی سیاہ اور چمکدار آنکھوں کی گہرائی میں زندگی کی ایک خوشگوار جھلک نظر آئی۔ بار بار التجاؤں کے جواب میں مورتی کی پراسرار خاموشی پر اس کا دل بیٹھ چکا تھا۔ اس کی گرم اور تیز سانس ٹھنڈی آہوں میں تبدیل ہو چکی تھی لیکن مادھو کے تصور نے اس کی مردہ رگوں میں ایک ارتعاش پیدا کر دیا۔

وہ اس مقدس مورتی کے چرنوں سے دور ان دلفریب فضاؤں میں پرواز کر رہی تھی جہاں پانی میں لہریں اٹھتی تھیں۔ پھول کھلتے تھے، درخت جھومتے تھے اور بنسری کے سروں سے تانیں نکلتی تھیں جہاں زندگی اپنی تمام رنگینیوں کے ساتھ موجود تھی۔ جہاں ہر سطح کے نیچے ایک گہرائی تھی۔ وہ گہرائی جس میں غوطہ لگانے والے کبھی نہیں تھکتے۔ یہ مورتی اپنی عظمت اور تقدیس کے باوجود ایک چمکتی ہوئی سفید سطح کے سوا کچھ نہ تھی۔ اپنی پجارن کی آنکھوں میں تشنگی، اس کی آواز میں سوز اور اس کے دل میں تڑپ پیدا کرنے سے معذور تھی۔ موہنی نے بارہا اپنے منتشر خیالات کو سمیٹ کر بھگوان کی مقدس مورتی کو اپنی توجہ کا مرکز بنانے کی کوشش کی لیکن اسے اپنی بے بسی کا اعتراف کرنا پڑا اس نے بھگوان کی مورتی کے پاؤں میں سر رکھتے ہوئے کہا۔

"بھگوان! میری رکھشا کرو۔ وہ ایک شودر ہے مجھے اس سے کوئی ہمدردی نہیں۔ میں اس سے دور رہنا چاہتی ہوں۔ میں جھیل پر کبھی نہ جاؤں گی۔ اسے سزا ملنے پر مجھے کبھی دکھ نہ ہوگا۔"

مادھو کی صورت پھر اس کی آنکھوں میں پھرنے لگی۔ اس کی بنسری کی تانیں پھر اس کے کانوں میں گونجنے لگیں وہ پوچھ رہا تھا "موہنی تمہیں سچ مچ میرے ساتھ

کوئی ہمدردی نہیں اگر میرا بلیدان دیا گیا تو؟"

موہنی نے گھبرا کر سر اٹھایا اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ اس نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا: "بھگوان! میں نے جھوٹ بولا۔ میں نے جھوٹ بولا میں بے بس ہوں اور وہ بے قصور ہے۔ وہ صرف تیری پوجا کرنا چاہتا ہے۔ اگر تو سچ مچ بھگوان ہے تو اس کی مدد کر۔"

یہاں تک کہنے کے بعد موہنی اچانک گھبرا اٹھی۔ اس کے دل نے احتجاج کیا۔ سچ مچ بھگوان! یہ کیا کہہ رہی ہے تو۔" کیا تجھے اس کے بھگوان ہونے میں شک ہے؟"

موہنی فوراً اس سوال کا جواب نہ دے سکی وہ ٹکٹکی باندھ کر مورتی کی طرف دیکھنے لگی صبح کی بڑھتی ہوئی روشنی میں اس کے چہرے کی ہیبت کم ہو رہی تھی۔

کیا یہ مورتی۔ یہ تراشا ہوا پتھر بھگوان ہو سکتا ہے ــــ کیا یہ تمہاری آواز سن سکتا ہے؟ تمہارے دل کے بھید جان سکتا ہے؟ . . . . کیا اسی نے ساری دنیا کو بنایا ہے؟

موہنی ان سوالات کا جواب سوچنے سے گھبراتی تھی۔ وہ انتہائی پریشانی کی حالت میں کمرے سے باہر نکلی۔ صحن میں آم کے درخت پر ایک کوئل "کوہو کوہو" کے نغمے الاپ رہی تھی۔ ارجن باہر جا چکا تھا اور ساوتری گائے کا دودھ دوہ رہی تھی۔

موہنی دیر تک خاموش کھڑی کوئل کے نغمے سنتی رہی اور اس کے خیالات پھر ایک بار جھیل کے کنارے گھنے درختوں میں چکر لگانے لگے اور وہ خود فراموشی کی حالت میں آہستہ آہستہ کوئل کی کوہو کا جواب دینے لگی۔

ساوتری نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور کہا "آج تجھے بھگوان کی پوجا کرتے دیکھ

کر تیرے پتا جی بہت خوش ہوئے۔ تیرا سر بھگوان کے قدموں میں دیکھ کر انہوں نے کہا۔ میری بیٹی! اب سیانی ہو گئی ہے۔ بیٹی رات کیا خواب دیکھا تھا تو نے؟"

"ماتا! مجھے یاد نہیں مجھے کسی بات سے ڈر لگا تھا۔"

باہر کے دروازہ سے رندھیر نے دو تین مرتبہ اندر جھانکا لیکن جب موہنی اس کی طرف متوجہ نہ ہوئی تو وہ اندر چلا آیا۔ اس نے کہا "موہنی چیتے کا بچہ دیکھو گی؟"

"کہاں؟"

"ہمارے گھر ایک شکاری رات کو پکڑ لایا تھا۔"

ساوتری نے کہا "بیٹی! دودھ پی کر جانا۔"

موہنی رندھیر سے تنہائی میں کچھ کہنے کے لیے بے قرار تھی وہ بولی "میں ابھی آتی ہوں ماتا!"

مکان سے باہر نکل کر موہنی نے رندھیر کی طرف مغموم نگاہوں سے دیکھا رندھیر موہنی کے چہرے سے اس کے تاثرات کا اندازہ لگانے کا عادی تھا۔ اس نے پوچھا۔ موہنا تم کچھ اداس سی ہو کیا بات ہے؟"

"رندھیر میں تم سے ایک بات کہنا چاہتی ہوں خفا تو نہ ہو جاؤ گے؟"

"میں اور تم سے خفا! کہو کیا ہے؟"

"تم نے مندر کی چوری کے متعلق سنا؟"

"جب پجاری اور پروہت شکایت لے کر آئے میں گھر پر تھا۔"

"رندھیر اگر چور پکڑا گیا تو کیا تمہارے پتا اسے سزا دیں گے؟"

"ضرور دیں گے۔ مندر کے چور کو کون معاف کر سکتا ہے؟"

موہنی نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا "رندھیر! اگر یہ اوزار کسی نے بھگوان کی مورتی تراش کر اس کی پوجا کرنے کے لیے چرائے ہوں تو بھی اسے سزا ملے گی۔"

رندھیر نے حیران ہو کر کہا: "موہنا! تم کیا کہنا چاہتی ہو؟"

موہنی بولی: "رندھیر تمہیں یاد ہے مادھو کو بھگوان کی مورتی بنانے کا شوق تھا!"

رندھیر گہری سوچ میں موہنی کی طرف دیکھنے لگا۔ موہنی پھر بولی: "رندھیر! اگر ہم اسے اس دن مندر میں نہ لے جاتے تو یہ بات یہاں تک نہ پہنچتی۔ اب اسے بچانا ہمارا فرض ہے۔ اگر اس کے پاس کسی نے یہ اوزار دیکھ لیے تو وہ پکڑا جائیگا لیکن تم اسے بچا سکتے ہو۔ تم جھیل کی طرف جاؤ اس سے پوچھو اگر اس نے یہ اوزار چرائے ہیں تو اس سے کہو کہ انہیں کہیں چھپا دے۔"

اگر رندھیر کو ایک شودر کے ساتھ ہمدردی نہ بھی ہوتی تو بھی موہنی کا اشارہ اس کے لیے حکم تھا اس نے موہنی کو تسلی دیتے ہوئے کہا: "میں ابھی جاتا ہوں مگر گھوڑا لے آؤں۔ چلو تم وہاں چیتا دیکھو میں ابھی واپس آجاؤں گا۔"

موہنی نے جواب دیا: "نہیں جب جھیل سے واپس آؤ گے تو مجھے اپنے ساتھ لے جانا۔"

---

(۵)

شانتا جھیل کے کنارے ایک پتھر پر بیٹھی کنول کے پھول کی پتیاں توڑ توڑ کر پانی میں پھینک رہی تھی اس کے آس پاس بھیڑ بکریاں چر رہی تھیں درختوں کے پیچھے سے بھاگتے ہوئے گھوڑے کی ٹاپ سن کر بکریاں بدحواس ہو کر اس طرف دیکھنے اور بھیڑیں اپنی مادری زبان میں ایک دوسرے کو کچھ سمجھانے لگیں۔ شانتا اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ رندھیر کا گھوڑا درختوں کی آڑ سے نمودار ہوا اور بکریاں

اور بھیڑیں خوف زدہ ہو کر ادھر اُدھر منتشر ہو گئیں۔ سوار نے پوری طاقت سے گھوڑے کی لگام کھینچی۔ لیکن سرکش گھوڑا رکتے رکتے پانی کے کنارے پہنچ گیا۔ شانتا خوف زدہ ہو کر پیچھے ہٹی۔ پتھر سے پاؤں ٹکرایا اور وہ لڑکھڑاتی ہوئی پیٹھ کے بل پانی میں جا گری۔

رندھیر نے گھوڑے سے اتر کر پانی میں چھلانگ لگا دی اور شانتا کا بازو پکڑ کر اوپر اٹھاتے ہوئے کہا: "مجھے بہت افسوس ہے کہ یہ گھوڑا بہت سرکش ہے میں پہلی بار اس پر سوار ہوا تھا تمہیں چوٹ تو نہیں آئی؟"

شانتا نے رندھیر جیسے خوش وضع نوجوان کو تصور میں بھی اپنے اس قدر قریب نہ دیکھا تھا۔ اس کے سرخ و سفید چہرے کے کئی رنگ بدلے۔ رندھیر کی طرف اس کی نگاہیں جھک جھک کر اٹھیں اور اٹھ اٹھ کر جھکیں۔ دل کی دھڑکن اور سانس کی رفتار کبھی کم اور کبھی زیادہ ہوئی۔ پانی سے باہر نکل کر رندھیر نے اس کا بازو چھوڑ دیا اور پھر تسلی دیتے ہوئے کہا: "تمہیں چوٹ تو نہیں آئی؟"

شانتا نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوتے جواب دیا "نہیں، آپ خواہ مخواہ پانی میں کود پڑے۔"

رندھیر ایک اچھوت کو چھو چکا تھا۔ اس کا مسکراتا ہوا نہ بھولنے والا چہرہ دیکھ چکا تھا۔ اس کی آواز کانوں کے پردے چیرتی ہوئی اس کے دل کی آخری گہرائیوں تک پہنچ چکی تھی۔ تاہم ندامت سے زیادہ وہ اپنے دل کی دھڑکن کو محسوس کر رہا تھا۔

"شانتا!" جواب دینے کی بجائے اس کی طرف دیکھتی رہی۔ اسے پہلی بار اپنے نام میں کوئی خوبی نظر آئی۔ وہ بار بار رندھیر کے منہ سے اپنا نام سننا چاہتی تھی۔

رندھیر نے پھر کہا: "شانتا! تمہارا نام شانتا ہے نا؟"

شانتا نے اثبات میں سر ہلایا۔

"دیکھو شانتا! میں ایک ضروری کام کے لیے آیا ہوں تمہارا بھائی کہاں ہے؟"
شانتا نے جواب دیا "وہ . . . لیکن اس نے کہا تھا میں کسی کو اس کا پتہ نہ بتاؤں۔"

شانتا یہ کہنے کے بعد غیر ارادی طور پر اپنے دائیں طرف گھنے درختوں کو دیکھنے لگی۔

"اس نے تم سے یہ بھی کہا تھا کہ اگر میں آؤں تو بھی اس کا پتہ نہ بتانا؟"

"نہیں! آپ کو اور موہنی کو تو وہ بہت یاد کرتا ہے۔"

"تو پھر تم مجھے اس کا پتہ نہ بتاؤ گی؟"

شانتا سوچ میں پڑ گئی۔

رندھیر نے مسکراتے ہوئے کہا "اچھا نہ بتاؤ مجھے معلوم ہے وہ کہاں ہے۔"

"نہیں! تم نہیں جانتے۔" شانتا مسکراتے ہوئے پھر گھنے درختوں کی طرف دیکھنے لگی۔

رندھیر نے کہا "وہ ان درختوں میں چھپا ہوا ہے۔"

شانتا کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"اور تم یہاں کیا کر رہی ہو؟"

"چچا مادھو شکار کے لیے گیا ہوا ہے اور آج میں اور بھیا بکریاں چرا رہے ہیں۔ آپ کسی کو بتائیں نہیں۔ بھیا ان درختوں میں چھپ کر پتھر کاٹ رہا ہے میں اسے بلاتی ہوں۔"

"نہیں، میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔"

رندھیر نے ایک درخت کے ساتھ گھوڑا باندھا اور شانتا کے ساتھ مادھو کی تلاش میں چل دیا۔ گھنے درختوں کی آپس میں پھنسی ہوئی ٹہنیوں اور

ان کے نیچے جنگلی بیلوں کی وجہ سے آگے بڑھنے کا راستہ ذرا دشوار تھا۔ رندھیر اور شانتا نے سخت جدوجہد کے بعد کچھ فاصلہ طے کیا۔ رندھیر نے پوچھا "ہمیں کتنی دور اور آگے جانا پڑے گا؟"

"بس جتنا ہم آگئے ہیں اس سے ذرا زیادہ۔"

"یہاں تو سانپ بھی ہوتے ہوں گے؟"

شانتا نے جواب دیا "سانپ بہت ہیں یہاں۔ آج ہی بھیا نے ایک کالا سانپ مارا تھا ابھی آگے چل کر آپ کو دکھاتی ہوں۔ میں نے خود کئی سانپ مارے ہیں۔"

رندھیر فطرتاً بہت بہادر تھا لیکن سماج کی تربیت اس کے دل میں سانپ کی دشمنی سے زیادہ اس کا خوف و احترام پیدا کر چکی تھی۔ وہ قدرے خوف زدہ ہو کر شانتا کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ تھوڑی دور چل کر اس نے ایک درخت کی ٹہنی توڑ کر ہاتھ میں پکڑ لی اور کہا: "چلو! اب کوئی خطرہ نہیں۔"

شانتا نے کہا "میں تو سانپ کو ہاتھ سے پکڑ کر مار دیا کرتی ہوں۔" یہ ایک جھوٹ تھا لیکن شانتا کو یقین تھا کہ اگر آج سانپ نکل آئے تو وہ رندھیر کو اپنی بہادری دکھانے یا اس کی حفاظت کے لیے ایسے اقدام سے جھجک محسوس نہ کرے گی۔ ایک جگہ چند پتھروں کے درمیان ایک مردہ سانپ دیکھ کر یہ تھوڑی دیر کے لیے رک گئے اور انہیں پتھر پر تیشے کی ضربوں کی آہٹ سنائی دینے لگی

شانتا نے کہا "بس اب ہم پہنچ گئے۔"

تھوڑی دور اور آگے چلنے پر تیشے کی ٹھکا ٹھک یک لخت بند ہو گئی شانتا نے رندھیر کی طرف مڑ کر دیکھا اور کہا۔ "بھیا کو ڈرائیں۔ تم شور نہ کرو۔"

شانتا احتیاط سے درختوں کی ٹہنیاں ادھر ادھر ہٹاتی ہوئی آگے بڑھی

اور رندھیر اس کی سادگی پر مسکراتا ہوا پیچھے ہو لیا۔

ایک تناور درخت کے نیچے پہنچ کر شانتا حیران سی ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگی کسی نے درخت کے نیچے بیل اور گھاس کاٹ کر تھوڑی سی جگہ بیٹھنے کے قابل بنا رکھی تھی۔ تراشے ہوئے پتھر کے چند ٹکڑے وہاں بکھرے ہوئے تھے۔ شانتا نے بدحواس ہو کر رندھیر اور رندھیر نے پریشان سا ہو کر شانتا کی طرف دیکھا۔

بالآخر شانتا بولی۔ وہ یہیں تھا یہ کہہ کر شانتا زور سے آوازیں دینے لگی: "بھیا! بھیا!! کہاں چلے گئے تم؟"

درخت کے اوپر سے ایک پُرزور قہقہے کی آواز آئی۔ اور مادھو درخت کی ٹہنیوں سے کود کر ان کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

"موہنی بھی آئی ہے۔" اس نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

مادھو کے منہ سے موہنی کا نام رندھیر کو پسند نہ آیا۔ اس نے جواب دیا "موہنی یہاں آ کر کیا کرتی؟"

مادھو نے کہا: "آپ نے یہاں آ کر بڑی دیا کی مجھے یہ امید نہ تھی کہ آپ ایسی جگہ مجھے تلاش کریں گے۔"

رندھیر نے کہا "مادھو! میں تم سے ایک ضروری بات کہنے آیا تھا۔"

"کہیے!"

"تم ابھی یہاں کیا کر رہے تھے؟"

مادھو نے پریشان ہو کر شانتا کی طرف دیکھا اس کی سہمی ہوئی نگاہیں یہ بتا رہی تھیں کہ وہ اس کا بھید رندھیر پر ظاہر کر چکی ہے۔

رندھیر نے تسلی دیتے ہوئے جواب دیا "ڈرو نہیں! تم جو کچھ کر رہے تھے، مجھے معلوم ہے۔۔۔۔ تم مورتی تراش رہے تھے اور پتھر تراشنے کے اوزار تم

نے مندر سے لیے ہیں!"

مادھو نے جواب دیا "رندھیر! میں تم سے جھوٹ نہیں بولوں گا لیکن مجھے ڈر ہے کہ تم خفا ہو جاؤ گے۔"

رندھیر نے کہا "میں تمہیں صرف یہ بتانے کے لیے آیا تھا کہ تمہاری جان ہر وقت خطرے میں ہے۔"

"مجھے معلوم ہے اور اسی لیے میں یہاں چھپ کر یہ کام کر رہا ہوں۔"

مادھو نے درخت کے قریب ایک بیل اٹھا کر ایک طرف کی اور بولا "یہ دیکھو: میں نے تمہارے پاؤں کی آہٹ پاتے ہی یہ سب کچھ چھپا دیا تھا۔"

رندھیر نے بیل کے نیچے ایک پتھر اور سنگ تراشی کے اوزار دیکھ کر کہا: "تم بہت ہوشیار ہو موہنی کو تمہاری بہت فکر تھی اسی نے مجھے بھیجا تھا۔"

مادھو نے کہا "رندھیر! میں حیران ہوں کہ تم اور موہنی شہر کے لوگوں سے کس قدر مختلف ہو میں تمہارے احسان کا بدلہ کبھی نہ دے سکوں گا۔"

رندھیر نے جواب دیا: "مادھو! ہم بھی حیران ہیں کہ تم دونوں شکل و صورت سے اچھوت نظر نہیں آتے۔"

رندھیر کے ان الفاظ سے مادھو نے غمگین ہو کر سر جھکا لیا لیکن شانتا کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔

رندھیر نے کہا: "اچھا! اب میں جاتا ہوں مجھے دیر ہو رہی ہے۔"

"چلو، میں تمہیں جھیل تک چھوڑ آؤں۔" مادھو نے پتھر اور اوزار پھر بیل کے نیچے چھپا دیے اور رندھیر اور شانتا کے آگے آگے چل دیا۔

جھیل کے کنارے گھوڑا دیکھ کر مادھو نے پوچھا "یہ کون چھوڑ گیا؟"

"یہ میرا ہے۔" رندھیر نے جواب دیا۔

ماد ھو نے کہا "رندھیر! جھیل میں نہاؤ گے نہیں؟"

رندھیر کو گھر پہنچنے کی جلدی تھی لیکن شانتا کی موجودگی نے ماد ھو کی درخواست کو قابلِ قبول بنا دیا۔ تھوڑی دیر بعد چھوت اور اچھوت ایک ہی جھیل کے پانی میں نہا رہے تھے۔ شہر کا بہترین تیراک ہونے کے باوجود رندھیر کو ماد ھو قابلِ رشک نظر آ رہا تھا۔

جھیل سے نکلتے وقت دونوں نے کنول کے پھول توڑے۔ رندھیر نے اپنے پھول شانتا کو پیش کیے۔ ماد ھو نے اپنے پھول رندھیر کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "تم یہ لے جاؤ۔ موہنی کو دے دینا۔ اسے کنول کے پھول بہت پسند ہیں۔"

ماد ھو کے منہ سے پھر ایک بار موہنی کا نام سن کر رندھیر نے ایک تلخی سی محسوس کی لیکن شانتا کے سامنے وہ اس کے پھول لینے سے انکار نہ کر سکا۔

---

(۷)

رندھیر گھوڑا بھگاتا ہوا شہر میں داخل ہوا۔ موہنی اپنے مکان سے باہر ایک درخت کے نیچے کھڑی اس کا انتظار کر رہی تھی وہ اس کے قریب پہنچ کر گھوڑے سے اترا اور موہنی کو چھیڑنے کی نیت سے مغموم سا ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ موہنی کا چہرہ یکایک زرد پڑ گیا۔

"کیا ہوا رندھیر؟" اس نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"موہنی غضب ہو گیا وہ پکڑا گیا؟"

موہنی دل پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئی "رندھیر! اسے بچاؤ۔ بھگوان کے لیے اسے

بچاؤ وہ بے قصور ہے۔"

موہنی کی آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگے۔

رندھیر کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ موہنی سراپا التجا بن کر رندھیر کے سامنے کھڑی ہو گئی اور کہنے لگی،

"رندھیر! بھگوان کے لیے مذاق نہ کرو۔ مجھے سچ سچ بتاؤ تم نے اسے دیکھا؟"

"ہاں! تم اس کی فکر نہ کرو۔ اسے کوئی خطرہ نہیں۔ چلو گھر چلیں۔"

"بتاؤ تو سہی کیا ہوا وہاں؟"

رندھیر نے جھیل کے تمام واقعات یکے بعد دیگرے بیان کرنے کے بعد کہا "لو یہ پھول۔"

موہنی نے اس کے ہاتھ سے پھول لے لیے تو اس نے شرارت آمیز مسکراہٹ سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "موہنی! تم بھرشٹ ہو گئی ہو۔ یہ پھول ماد ھو نے توڑے تھے۔"

موہنی نے مسکرا کر جواب دیا "مجھے کیا معلوم کس نے توڑے ہیں۔ اگر اس نے توڑے ہیں تو بھی پاپ لا کر دینے والے کے سر ہو گا۔"

بدھو اور شنکر

قریباً چار مہینے کنول اور بدھو کو مادھو کی دل چسپیوں کا علم نہ ہُوا۔ سردی کے موسم میں جھیل کے اِس پار دلچسپی کا کوئی سامان نہ تھا۔ کنارے پر گھاس سُوکھ چکی تھی۔ درختوں کے پتّے جھڑ چکے تھے اور کنول کے پھول جیسے کبھی تھے ہی نہیں لیکن مادھو دن میں ایک بار جھیل کی طرف ضرور جاتا۔

بدھو کو اپنی سادگی، ایثار اور خلوص کی بدولت آس پاس کی بستیوں کے لوگوں میں کافی عزت حاصل ہو چکی تھی۔ وہ ان کے ساتھ شکار کے لیے جاتا تو وہ اسے حتی الوسع دریا کے ٹھنڈے پانی میں اترنے سے منع کرتے اور اپنا شکار تقسیم کرتے وقت اس کا حصہ دوسروں سے زیادہ رکھتے۔ اُن کے جھگڑوں میں بدھو کا فیصلہ آخری سمجھا جاتا۔

شکار کے موقعوں پر بدھو کی غیر حاضری میں بھیڑوں کی نگہداشت شانتا اور مادھو کے سپرد ہوتی اور مادھو کو سنگ تراشی کے لیے سارا دن مل جاتا لیکن کبھی کبھی بدھو اسے بھیڑیں چرانے اور مچھلیاں پکڑنے کے لیے اپنے ساتھ لے جاتا۔ بدھو کو اپنی زندگی میں مادھو کے سر کوئی ذمہ داری تھوپنا گوارا نہ تھا لیکن وہ اُسے ایک اچھا چرواہا اور بہترین شکاری دیکھنا چاہتا تھا اس کے نزدیک ایک نوجوان کی سب سے بڑی خوبیاں یہی تھیں۔ بنسری بجانے کے فن میں بدھو اُس کے کمال کا اعتراف کر چکا تھا لیکن اسے یہ شکایت تھی کہ مادھو مچھلی کے

شکار اور بھیڑیں چرانے سے بہت جلد اُکتا کر بھاگ جاتا ہے۔

ایک شام اس نے کنول سے کہا "بہن! مادھو کا جی باہر بالکل نہیں لگتا۔ آخر وُہ گھر میں سارا دن کیا کرتا رہتا ہے؟"

کنول نے حیران ہو کر جواب دیا "گھر میں تو وہ شام سے پہلے کبھی نہیں آتا جس دن تم گھر چھوڑ جاتے ہو اس دن بھی وہ صبح سے شام تک کہیں غائب رہتا ہے۔"

"آخر کہاں جاتا ہے وُہ؟"

"میں اُسے ہمیشہ جھیل کی طرف آتے جاتے دیکھتی ہُوں کبھی کبھی شانتا بھی اس کے ساتھ غائب ہو جاتی ہے۔ کیوں شانتا! کہاں جایا کرتے ہو تم دونو؟"

شانتا نے جواب دیا "کہیں بھی نہیں۔ جھیل پر راج ہنس کا ایک جوڑا رہتا ہے ہم انہیں دیکھا کرتے ہیں۔"

اتنے میں مادھو آ پہنچا اور اسے دیکھتے ہی بدھو نے کہا "کیوں بیٹا! دیکھ آئے ہنس کا جوڑا؟"

مادھو نے پریشان ہو کر جواب دیا "ہنس کا جوڑا؟ وہ کہاں ہے؟"

"تم کہاں سے آئے ہو؟"

"میں ... میں جھیل ... جھیل پر گیا تھا چچا!"

"جھیل پر تمہارا کیا کام تھا؟"

"چچا! میں وہاں بنسری بجا رہا تھا۔ میں نے ایک نیا سُر نکالا ہے۔ سناؤں تمہیں؟"

شانتا نے جلدی سے کہا "سناؤ بھیا!"

مادھو نے بنسری ہونٹوں سے لگائی اور ایک دردناک راگ نے بدھو

تا غصہ پیار میں تبدیل کر دیا۔ تاہم اس کا دل گواہی دے رہا تھا کہ مادھو اس سے کوئی بات چھپا رہا ہے۔ رات کو سوتے وقت اس نے مادھو سے کہا:۔

"مادھو! میں علی الصباح شکار کے لیے جا رہا ہوں تم بھیڑیں سنبھالنا۔"

صبح کے وقت بدھو کا بستر خالی دیکھ کر مادھو کو بہت خوشی ہوئی۔ اس نے شانتا کو جگا کر کہا: "شانتا! ماتا دودھ دوہ لیں تو بکریاں اور بھیڑیں لے کر جھیل پر آ جانا۔ میں وہیں ہوں گا۔"

شانتا نے رازدارانہ انداز میں سر ہلایا اور مادھو خوشی خوشی جھیل کی طرف روانہ ہو گیا۔ گہری دھند میں چند قدم سے آگے کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ جھیل کے کنارے پہنچ کر مادھو نے چاروں طرف دیکھا اور اطمینان کا سانس لے کر گھنے درختوں میں گھس گیا۔ سردیوں میں اس کی منزلِ مقصود کا راستہ اس قدر دشوار گزار نہ تھا۔ سوکھی ہوئی گھاس اور مرجھاتی ہوئی ٹہنیوں کی مزاحمت بہت حد تک کم ہو چکی تھی۔ مادھو نے چلتے چلتے اپنے پیچھے کچھ کھٹکا محسوس کیا اور بدحواس ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ جب اسے کوئی متحرک شے نظر نہ آئی تو وہ اپنے وہم پر ہنستا ہوا آگے چل دیا۔

درخت کے نیچے پہنچ کر اس نے سوکھی ہوئی بیل کو ایک طرف ہٹایا اور پتھر کی مورتی کے سامنے بیٹھ گیا۔ نوجوان سنگ تراش کی یہ کوشش کامیاب تھی مورتی مکمل ہو چکی تھی۔ صرف کہیں کہیں کھردری سطح کی صفائی کا کام باقی تھا۔

چھوٹے سے چہرے کے نقوش انسانی خدوخال کا بہترین نمونہ تھے۔ آنکھوں میں ایک پُراسرار ہیبت کی بجائے رحم، محبت اور عفو کی ایک غیر فانی جھلک تھی۔

مادھو نے ایک اوزار اٹھایا اور کھردرے حصوں کو کھرچ کر صاف کرنے میں مصروف ہو گیا۔

درخت کی ٹہنیوں سے شبنم کے قطرے گرنے لگے لیکن مادھو اپنے گرد و پیش سے بے خبر اپنے کام میں محو تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ مندر سے سیکھا ہوا بھجن گانے لگا۔ اُس کے ہلکے سُر بتدریج بلند ہوتے گئے۔

اچانک مادھو! مادھو!! کی آواز سن کر اس نے آنکھیں اوپر اٹھائیں اور مبہوت سا ہو کر رہ گیا۔ سامنے بدھو کھڑا تھا۔

"چچا!" اس نے سہمی ہوئی آواز میں کہا "تم شکار کے لیے نہیں گئے؟"

بدھو کسی اور دنیا میں تھا اس کے دل و دماغ کی تمام حسیات سمٹ کر آنکھوں میں آ چکی تھیں اور وہ مورتی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

مادھو مرعوب ہو کر پھر بولا: "چچا! یہ بھگوان کی مورتی ہے۔ اسے میں نے بنایا ہے..... چچا تم خفا ہو گئے ہو؟"

بدھو پر ان الفاظ کا کوئی اثر نہ ہوا وہ ایک ایسی چٹان کی طرح اپنی جگہ کھڑا تھا جس کے پاس پانی کی بے قرار موجوں کے تھپیڑوں کا جواب ایک حقارت آمیز خاموشی کے سوا کچھ نہ تھا مادھو اٹھ کر آگے بڑھا اور بدھو کا بازو پکڑ کر اس کی طرف ملتجیانہ نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

"چچا! میں اسے تم سے چھپانا نہیں چاہتا تھا صرف اسے مکمل کر کے تمہیں دکھانا چاہتا تھا تم نے اسے پسند نہیں کیا؟"

بدھو نے ہاتھ جھٹک کر مادھو کو ایک طرف ہٹا دیا اور بجلی کی سی تیزی کے ساتھ آگے بڑھا اور مورتی کے قریب پڑا ہوا تیشہ اٹھا کر اسے توڑنے کی کوشش کی لیکن مادھو نے "چچا! چچا!!" کہتے ہوئے ایک ہاتھ سے اس کی کلائی اور دوسرے ہاتھ سے تیشہ پکڑ لیا۔

چند لمحات کی کشمکش کے بعد مادھو نے بدھو کے ہاتھ سے تیشہ چھین کر

اسے پیچھے دھکیل دیا۔ بدھو کو پہلی بار اپنے بڑھاپے اور مادھو کی جوانی کا احساس ہوا
کبھی مادھو اور کبھی مورتی کی طرف دیکھتے ہوئے وہ محسوس کر رہا تھا کہ دونوں اس کی
ہنسی اُڑا رہے ہیں وہ جیتے جی اعترافِ شکست کرنے والوں میں سے نہ تھا لیکن
اس کا مدِمقابل وہ نوجوان تھا جس کی رگوں میں سکھدیو کا خون تھا اور یہ خون ایسا
نہ تھا جو بدھو کے دل میں سُلگتی ہوئی آگ کے لیے پانی کا کام نہ دے سکتا۔ اس کی
آنکھوں میں آگ کے انگارے آنسوؤں میں تبدیل ہونے لگے اور اس نے بھرائی
ہوئی آواز میں کہا۔ بیٹا! اب تم مجھ سے طاقتور ہو گئے ہو تمہیں سمجھانا اب میرے
بس میں نہیں۔" ان الفاظ کے ساتھ بدھو کی آنکھوں سے وہ آنسو جنہیں وہ چھپانے
کی ناکام کوشش کر رہا تھا، بہہ نکلے۔

مادھو کا دل پہلے ہی ندامت سے پسیجا جا رہا تھا وہ اس منظر کی تاب نہ لا سکا
بے اختیار آگے بڑھا اور بدھو کے قدموں پر گر پڑا۔ چچا! مجھے معاف کر دو، مجھے
معاف کر دو!"

بدھو کو گویا پھر ایک بار کھوئی ہوئی بادشاہت مل گئی۔ اس نے مادھو کو اٹھا
کر گلے لگا لیا: میرے بیٹے! میرے مادھو! میں آج بہت خوش ہوں کہ تمہارے
بازو اس قدر مضبوط ہیں تمہیں وہ دن یاد ہیں جب تم اپنے ننھے ہاتھوں سے میرے
منہ پر طمانچے لگایا کرتے تھے اور میں تمہارے ہاتھ چوما کرتا تھا۔ میرے لیے تم آج
بھی وہی مادھو ہو۔"

بدھو یہ کہہ کر مادھو کے بازو ٹٹولنے لگا۔ مادھو نے پُرنم آنکھیں اوپر اٹھائیں
بدھو کے لیے اس کے چہرے پر غم کے ہلکے سے آثار بھی بارِ خاطر تھے۔ اس نے
چہرے پر مغموم مسکراہٹ لانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا:
"بیٹا! تم خیال کرتے ہو گے کہ میں تمہارا دشمن ہوں لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے

کہ میں سکھدیو کے بیٹے کو آگ میں کودتا دیکھوں اور خاموش رہوں۔"
"چچا! میں نے کوئی برا کام نہیں کیا میں نے مورتی بنائی ہے۔ اس بھگوان
کی مورتی جس نے ہم سب کو پیدا کیا ہے جس نے زمین اور آسمان بنائے ہیں۔"
بدھو بولا۔" وہ رامو بھی ایسی باتیں کیا کرتا تھا اس نے بھی ایک مورتی بنائی
تھی لیکن اسے حکومت کی ہوس تھی۔ وہ مٹی کی مورتی کو پھندا بنا کر آدمیوں کا شکار کھیلنا
چاہتا تھا لوگوں کو مورتی کا خوف دلا کر انہیں اپنا غلام بنانا چاہتا تھا۔ وہ دیوتاؤں
سے وہی کام لینا چاہتا تھا جو اونچی ذات والے نیچ ذات والوں کے حقوق چھیننے
کے لیے لیا کرتے ہیں اس کا پہلا شکار تمہارا باپ تھا لیکن مادھو! میں تمہیں رامو نہیں
بننے دوں گا۔"

مادھو نے پریشان ہو کر جواب دیا۔ لیکن چچا! میں کسی کو غلام نہیں بنانا چاہتا
میرا بھگوان اونچی ذات والوں کا بھگوان نہیں جو کسی سے نفرت اور کسی سے محبت
کرتا ہے۔ میں بھگوان اُسے کہتا ہوں جو سب کو ایک آنکھ سے دیکھتا ہے۔ جس
کے بنائے ہوئے چاند اور سورج کی روشنی ہر گھر میں پہنچتی ہے جس کے بھیجے
ہوئے بادل ہر کھیت پر برستے ہیں جس کے حکم سے چلنے والی ہواؤں میں ہم سب
یکساں طور پر سانس لیتے ہیں جس کی زمین ہر ایک کے لیے اناج اور پھل پیدا کرتی
ہے جو ہر ایک سے محبت اور ہر ایک سے انصاف کرتا ہے کیا ہمارا فرض نہیں کہ
ایسے بھگوان کی مورتی بنائیں اور اس کی پوجا کریں!"

"لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ پتھر کا یہ بے جان ٹکڑا جسے کل تک یہ بھی معلوم
نہ تھا کہ کہاں پڑا ہوا ہے۔ آج تمہارے تیشے کی ضربوں سے کیوں کر اس قابل بن
گیا ہے کہ ہم اس کی پوجا کریں۔ تم خود کہہ رہے ہو کہ بھگوان وہ ہے جس نے سورج
اور چاند کو بنایا ہے۔ اب تم ہی بتاؤ کہ جس نے ایسی چیزیں بنائی ہیں وہ خود کیسا

ہوگا۔ کیا اس تراشے ہوئے پتھر کو اس کے ساتھ کوئی نسبت ہو سکتی ہے؟"

مادھو نے جواب دیا "چچا! یہ تو اس کی مورتی ہے۔ میں کب کہتا ہوں کہ یہ بھگوان ہے جب تک اس کی کوئی صورت ہمارے سامنے نہ ہو۔ ہم اس کی پوجا کیسے کر سکتے ہیں؟"

"بیٹا! یہی تو میں کہتا ہوں کہ یہ صورت جو تم نے بنائی ہے بھگوان کی صورت نہیں ہو سکتی تمہاری اپنی صورت اس سے اچھی ہے۔ اور پھر اگر یہ ضروری ہے کہ پوجا کا شوق پیدا کرنے کے لیے تمہاری آنکھوں کے سامنے کوئی صورت موجود ہو تو کیا یہ مقصد صرف تراشے ہوئے پتھر ہی پورا کر سکتے ہیں۔ کیا چاند اور سورج کو دیکھ کر تمہارے دل میں بھگوان کی پوجا کا شوق پیدا نہیں ہوتا۔ کیا دنیا کے تمام سنگ تراش مل کر چاند اور سورج جیسی کوئی شے بنا سکتے ہیں؟

چاند اور سورج تو اس زمین سے دور ہیں۔ تم ہر روز مشرق کے اونچے اونچے پہاڑوں کو دیکھتے ہو جن کی چوٹیوں پر بارہ مہینے برف چمکتی ہے جن کے دامن میں سدا آبشاریں اور ندیاں بہتی ہیں۔ ان پہاڑوں سے پرے اور پہاڑ ہیں جن کی چوٹیاں آسمان سے ملی ہوتی ہیں اگر تم وہاں پہنچ جاؤ تو یہ محسوس کرو گے کہ تراشے ہوئے پتھروں کو بھگوان کی مورتیاں سمجھنے والے اس کا مذاق اڑاتے ہیں اگر تمہارا خیال ہے کہ بھگوان کسی ایسی طاقت کا نام ہے جس نے دنیا کی ہر شے کو بنایا ہے تو شوق سے اس کی پوجا کرو کوئی تمہیں منع نہیں کر سکتا۔ تمہارا پتا خود ایک زبردست اور انصاف پسند طاقت کو مانتا تھا لیکن میں کہتا ہوں کہ اگر یہ رنگ رنگ کی چیزیں دیکھ کر تمہارے دل میں بھگوان کی پوجا کا شوق پیدا نہیں ہوتا تو اپنے ہاتھوں کی تراشی ہوئی مورتیاں تمہیں کیا دے سکتی ہیں؟"

---

(۲)

بدھو کی اس تقریر کے بعد مادھو نے محسوس کیا کہ وہ ایک گہرے خواب سے بیدار ہوا ہے۔ سادہ دل چرواہے کا ہر لفظ اس کے دل پر تیر و نشتر کا کام کر رہا تھا۔ مورتی کے تراشے ہوئے نقوش اس کی آنکھوں سے محو ہو رہے تھے اور وہ تصور میں دریا کے کنارے پڑے ہوئے ایک پتھر کو دیکھ رہا تھا جو صدیوں سے بھگوان کی مقدس مورتی کی شکل میں تبدیل ہونے کے لیے کسی سنگ تراش کی نظرِ کرم کا محتاج تھا۔ مادھو نے اپنے دل سے سوال کیا "کیا تم طاقت کا تصور کر سکتے ہو جو زمین اور آسمان پر حکمران ہے؟ کیا ان تراشے ہوئے پتھروں کو اُس عظیم طاقت سے کوئی نسبت ہو سکتی ہے جس نے تمہیں پیدا کیا ہے؟"

یہ بات بدھو کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ اس کی تقریر کا ہر لفظ مادھو کے تصورات کی حسین دنیا کو درہم برہم کر رہا ہے۔ وہ مادھو کی خاموشی کو ہٹ دھرمی اور ضد سے تعبیر کر رہا ہے۔ اس نے بددل سا ہو کر کہا:

"مادھو بیٹا! میں جانتا ہوں کہ تم پر میری باتوں کا کوئی اثر نہیں ہوگا میں تمہیں منع نہیں کروں گا لیکن تم یہ کام یہاں رہ کر نہیں کر سکتے۔ ہمیں بہت جلد یہ ملک چھوڑنا پڑے گا۔ شاید تمہیں معلوم نہیں کہ اونچی ذات والے نیچ ذات والوں کو ایسے کام کرنے کی اجازت نہیں دیتے۔ اگر کسی کو معلوم ہو گیا تو تمہاری سزا موت ہوگی۔"

مادھو نے جواب دیا "چچا! مجھے معلوم نہ تھا کہ تم بھگوان کے متعلق اتنا کچھ جانتے ہو لیکن میں کسی کو دھوکا دینا نہیں چاہتا تھا بلکہ خود ایک دھوکے میں گرفتار تھا تم نے میری آنکھیں کھول دی ہیں۔ پتھر کی مورتی مجھے صرف اس وقت تک بھگوان نظر آ سکتی تھی جب تک یہ آنکھیں بند تھیں۔ آج آنکھیں کھلنے پر میں محسوس کر رہا ہوں۔

کہ وہ ان نگاہوں کی رسائی سے بہت دُور ہے۔ ہم صرف اس کی بنائی ہوئی چیزوں سے اس کی عظمت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ اپنے ہاتھوں کے تراشے ہوئے پتھروں کو اس کی صورت میں تبدیل نہیں کر سکتے۔ وہ ہر خوبصورت شے میں موجود ہے۔"

بدھو کا دل مسرت سے اُچھل رہا تھا اس نے ایک بار پھر آگے بڑھ کر مادھو کو گلے لگاتے ہوئے کہا:

"بیٹا! آج میں نے تمہیں کھو کر پایا ہے۔"

"لیکن چچا! سچ بتانا تم بھگوان کو مانتے ہو؟"

بدھو نے جواب دیا "میں ایک ایسی طاقت کو مانتا ہوں جس نے آسمان اور زمین کی ہر شے بنائی ہے۔ جس کی مرضی کے بغیر کوئی کام نہیں ہوتا جو ہمیں ایک دوسرے سے محبت کا سبق دیتی ہے۔ رہے دیوتا، مورتیاں اور بھگوان، مجھے ان سے کوئی سروکار نہیں۔ یہ ہمارے دشمنوں کی زبان کے الفاظ ہیں جو ان کی آڑ لے کر ہمارا شکار کھیلتے ہیں۔ اگر سچ پوچھو تو مجھے ان سے نفرت ہے۔"

مادھو نے مسکراتے ہوئے کہا "چچا! مجھے معلوم نہ تھا کہ تم اتنی باتیں جانتے ہو"——

بدھو بولا "سکھدیو بھی مجھے بے وقوف کہا کرتا تھا لیکن اس کی زندگی میں مجھے عقلمند بننے کی ضرورت نہ تھی جب میری راہ کا ہر کانٹا وہ دیکھا کرتا تھا مجھے کانٹوں پر چلنے میں لطف آتا تھا اور اتنا بوجھ اٹھا کر میں ہر الٹی سیدھی راہ پر بے دھڑک جا سکتا تھا لیکن اب مجھے اپنے لیے نہیں بلکہ تمہارے لیے ہر راستے پر پھونک پھونک کر قدم اٹھانا پڑتا ہے۔ میں بے سمجھ تھا لیکن سکھدیو کی موت نے مجھے سوچنا سکھا دیا۔ میں نڈر تھا لیکن تمہاری حفاظت کے خیال نے مجھے ڈرپوک بنا دیا۔ کاش! آج سکھدیو زندہ ہوتا اور اس بے سمجھ بدھو کو بھیڑیں چرانے، درختوں پر چڑھ کر

بنسری بجانے اور دریاؤں میں کودنے کے سوا کوئی کام نہ ہوتا۔"

بدھو کی آنکھوں میں پھر آنسو چمکنے لگے۔

مادھو نے زمین پر پڑا ہوا تیشہ اٹھایا اور بدھو کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "چچا! یہ لو اس مورتی کو اپنے ہاتھ سے توڑ ڈالو۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ تمہاری مرضی کے خلاف کچھ نہ کروں گا۔"

بدھو نے تیشہ پکڑ لیا۔ کچھ سوچنے کے بعد مورتی کی طرف بڑھا اس نے مورتی توڑنے کی نیت سے دو دفعہ تیشہ بلند کیا۔ لیکن مورتی تک پہنچتے پہنچتے اس کا ہاتھ خود بخود رک گیا اس نے مادھو کی طرف دیکھا اور کہا "مادھو! تم نے اس کے تراشنے میں کئی دن لگائے ہوں گے؟"

"ہاں چچا" اس نے جواب دیا۔

"میں اسے نہیں توڑ سکتا۔ چلو اسے کہیں پھینک دیں۔"

"کہاں پھینکیں؟"

"جھیل میں۔ لیکن اس وقت انہیں کوئی دیکھ لے گا۔"

"چچا میں اسے شام کو پھینک دوں گا۔ چلو! اب گھر چلیں۔"

مادھو نے مورتی کو اٹھا کر سوکھی بیل کے نیچے چھپا دیا اور دونوں گھر کی طرف چل دیے۔

---

(۱۳)

اگلے روز شنکر علی الصباح اپنی کوٹھڑی سے باہر نکلا تو مندر کے دروازے کے سامنے ایک خوبصورت مورتی دکھائی دی۔ وہ دوسری کوٹھڑی میں جا کر گوپال

کو جگانے کی بجائے بھگوان کی جے! بھگوان کی جے!!" کے نعرے لگاتا ہُوا سیدھا کلفہ کی طرف بھاگا۔ گوپال ذرا دیر سے اُٹھنے کا عادی تھا لیکن شنکر کو خطرہ تھا کہ اگر آج وہ معمول سے ذرا پہلے اُٹھ بیٹھا تو شہر والوں تک یہ عجیب و غریب خبر پہنچانے میں خواہ مخواہ کا حصہ دار بن جائے گا اس لیے وہ ہر دس پندرہ قدم پر پیچھے دیکھتا اور اپنی رفتار تیز کر دیتا۔ شہر تک پہنچتے پہنچتے اُسے سخت سردی کے باوجود پسینہ آ رہا تھا۔

شہر سے باہر نکلنے والے چند آدمیوں نے اسے روک کر اس بدحواسی کی وجہ پوچھنا چاہی لیکن وہ یہ قیمتی چیز سب سے پہلے شہر کے سردار کے کانوں تک پہنچانا چاہتا تھا اس لیے وہ ہر پوچھنے والے کو کوئی تسلی بخش جواب دیے بغیر آگے نکل گیا۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ کئی آدمی اس کے پیچھے بھاگتے ہوئے کہہ رہے تھے "شنکر ٹھہرو! شنکر کیا ہُوا ہے؟"۔

شہر میں داخل ہوتے ہی اسے سامنے سے رندھیر آتا ہُوا دکھائی دیا۔ لوگوں کی چیخ پکار اسے شنکر کی طرف متوجہ کر چکی تھی اس نے بھی آواز دی۔ "شنکر ٹھہرو!" لیکن شنکر نے کترا کر دوسری گلی سے نکلنے کی کوشش کی۔ رندھیر کو اس کی اس حرکت پر ہنسی بھی آئی اور غصہ بھی اور اس نے بھاگ کر شنکر کو بازو سے پکڑ لیا اور جھنجھوڑتے ہوئے پوچھا:

"ارے تمہاری یہ حالت! آخر ہُوا کیا؟ کہیں چوری تو نہیں کی۔ آدھا شہر تمہارے پیچھے لگا ہُوا ہے؟"

شنکر بُری طرح ہانپ رہا تھا۔ کچھ دیر اس کے منہ سے کوئی بات نہ نکلی۔ بالآخر اس نے کہا:

"بھگوان کے لیے مجھے چھوڑ دو میں تمہارے پتا جی کے پاس جا رہا ہُوں۔"

رندھیر نے جواب دیا "جب تک مجھے نہیں بتاؤ گے میں تمہیں نہیں چھوڑوں گا۔" اتنے میں بہت سے لوگ شنکر کے اردگرد جمع ہو کر رندھیر کے مطالبہ کی تائید کر رہے تھے۔

شنکر نے سراسیمہ ہو کر چاروں طرف دیکھا اور مایوس ہو کر جواب دیا "میں نے مندر میں بھگوان کی نئی مورتی دیکھی ہے جسے دیوتا خود بنا کر رات کے وقت وہاں رکھ گئے ہیں۔"

رندھیر نے شنکر کا بازو چھوڑ دیا لیکن اب دوسروں کی باری تھی۔ رندھیر کے ہاتھوں سے آزاد ہو کر اب وہ کئی ہاتھوں کی گرفت میں تھا اور کئی زبانیں اس سے مختلف سوالات پوچھ رہی تھیں۔

"ہاں شنکر! وہ مورتی کیسی ہے۔ پتھر کی ہے یا تانبے کا۔ سونے کی ہو گی کتنی بڑی ہے۔ کب دیکھی تم نے؟"

شنکر نے مختصر سے جوابات سے انہیں ٹالنا چاہا لیکن اسے جلد ہی معلوم ہو گیا کہ لوگوں کی تسلی کیے بغیر چھٹکارا ممکن نہیں۔ شنکر سے اپنے سوالات کا جواب پوچھنے والے مندر کا رُخ کرنے لگے لیکن ان سے زیادہ تعداد میں اور آ موجود ہوئے۔ چنانچہ شنکر کو اپنا بیان کئی مرتبہ دہرانا پڑا۔ اتنے میں اسے گوپال سرپٹ بھاگتا ہُوا نظر آیا۔ اس نے لوگوں کی گرفت سے آزاد ہونے کی آخری کوشش کی لیکن بے سُود۔

گوپال قریب پہنچا تو لوگوں نے اسے بھی ٹھہرانے کی کوشش کی، لیکن وہ اپنے مضبوط بازوؤں سے لوگوں کو اِدھر اُدھر ہٹاتا ہُوا آگے گزر گیا۔

شنکر ہجوم کی گرفت سے اس وقت آزاد ہُوا جب کہ تمام لوگ ایک ایک کر کے مندر کی طرف روانہ ہو چکے تھے۔ مردوں کے بعد عورتیں [illegible] رہی تھی

لیکن عورتیں ایسے معاملات کی تفصیل میں نہیں جاتیں۔ اس لیے وہ زیادہ دیر شنکر کا راستہ نہ روک سکیں۔

سردار اور پروہت کے مکانات پر جا کر شنکر کو معلوم ہوا کہ گوپال ان کے کانوں تک یہ خبر پہنچا چکا ہے اور وہ مندر کی طرف روانہ ہو چکے ہیں۔

شنکر دل برداشتہ ہو کر واپس مڑا۔ اب وہ یہ چاہتا تھا کہ مندر کی طرف جانے والے مرد اور عورتیں پھر اس کے گرد جمع ہو جائیں اور اسی بے قراری کے ساتھ اس سے سوالات پوچھیں لیکن اسے جلد ہی معلوم ہو گیا کہ اب وہ کسی کی معلومات میں اضافہ نہیں کر سکتا۔ کسی نے یہ اعتراف بھی نہ کیا کہ شہر میں سب سے پہلے یہ خبر لانے والا شنکر تھا۔ ہر شخص شنکر پر یہ ظاہر کرنے کی کوشش کرتا تھا کہ وہ نئی مورتی کے متعلق اس سے زیادہ جانتا ہے۔

تھوڑی دور آگے چل کر اسے ایک بڑی ٹولی میں رام داس، پروہت اور گوپال نظر آئے وہ تھکی ہوئی ٹانگوں کے احتجاج کے باوجود بھاگ کر اس ٹولی میں آ شامل ہوا لیکن اسے دیکھتے ہی رام داس نے سوال کیا: "کیوں شنکر! تم نے بھی وہ مورتی دیکھی ہے؟"

شنکر کے سوال پر گویا کسی نے ٹھنڈے پانی کا مٹکا الٹ دیا۔ اس نے مغموم لہجے میں جواب دیا۔ "سرکار! میں نے سورج نکلنے سے بہت دیر پہلے یہ مورتی دیکھی تھی۔ دیوتا اسے مندر کے دروازے کے سامنے رکھ گئے ہیں ——"

شنکر کی مظلومیت میں اضافہ کرنے کے لیے گوپال بول اٹھا: "مہاراج! میں نے مورتی مندر کے اندر دیکھی تھی اب شاید باہر آ گئی ہو۔"

پروہت نے کہا: "مجھے شنکر کا اعتبار نہیں۔ یہ ہمیشہ جھوٹ بولتا ہے۔"

شنکر نے محسوس کیا کہ اس کی ٹانگوں پر جو بوجھ پہلے تھا وہ اب دس گنا زیادہ ہو گیا ہے تاہم وہ حیران تھا کہ مورتی مندر کے اندر کیسے چلی گئی۔

مندر میں داخل ہو کر شنکر کو معلوم ہوا کہ گوپال اس کے ساتھ بہت بڑی شرارت کر چکا ہے۔ نئی مورتی جسے اس نے دروازے سے باہر دیکھا تھا مندر کے اندر پہنچ چکی تھی۔

لوگوں نے نئی مورتی پر کھلے دل سے دولت نچھاور کی۔ پروہت نے بھجن گائے لیکن اس کارروائی کے دوران میں شنکر دل ہی دل میں رندھیر کو کوس رہا تھا اسے یقین ہو چکا تھا کہ دان کی تقسیم میں وہ گوپال کے ساتھ برابر کا حصہ دار نہیں ہو گا۔

موہنی بھی مندر میں پہنچ چکی تھی اس نے مورتی کے قریب جا کر اسے دیکھا اور پھر لوگوں کی نگاہوں سے بچتی ہوئی رندھیر کے قریب جا کھڑی ہوئی۔

رندھیر نے مسکراتے ہوئے سوال کیا "موہنی! میں تمہیں ایک عجیب بات بتانا چاہتا ہوں۔"

"بتاؤ۔"

"یہاں نہیں۔ میں جھیل کے کنارے درختوں کے نیچے تمہارا انتظار کروں گا اگر مادھو کے متعلق کچھ جاننا چاہتی ہو تو ضرور آنا۔ آؤ گی نا!"

موہنی کے چہرے پر حیا کی سرخی چھا گئی اس نے رندھیر کی نگاہوں سے بچنے کے لیے دوسری طرف منہ پھیرتے ہوئے کہا "آؤں گی۔"

دوپہر کے وقت جب لوگ اپنے اپنے گھروں کی طرف جا رہے تھے موہنی اپنی ماں اور سہیلیوں سے آنکھ بچا کر جھیل کے کنارے پہنچی۔ رندھیر پہلے ہی وہاں موجود تھا۔ موہنی نے اسے دیکھتے ہی کہا: "دیکھو رندھیر! ہمارا اس طرح پھرنا

ٹھیک نہیں۔ جلدی کہو، کیا بات ہے؟"

رندھیر نے کہا: "میں تمہیں کچھ بتانے سے پہلے اپنی تسلی کر لینا چاہتا تھا۔"

"آخر کچھ بتاؤ گے بھی۔"

رندھیر نے کہا "موہنی! وہ مورتی شاید مادھو نے بنائی ہے۔"

موہنی نے بدحواس ہو کر کہا "مادھو نے؟ میں نہیں مانتی۔ وہ ایسی مورتی نہیں بنا سکتا۔"

"چلو تمہیں کچھ دکھاؤں۔"

"کیا دکھاؤ گے؟"

کوئی ایسی چیز جو میرے دعویٰ کو ثابت کر سکے۔ آؤ نا گھبراتی کیوں ہو؟"

موہنی تھوڑی دیر پس و پیش کے بعد رندھیر کے ساتھ چل پڑی۔

جھیل کے دوسرے کنارے پہنچ کر یہ دونوں گھنے درختوں کے جھنڈ میں داخل ہوئے اور رندھیر اس جگہ پہنچ کر رکا۔ جہاں مادھو پتھر تراشا کرتا تھا۔

رندھیر نے زمین پر بکھرے ہوئے سنگ ریزوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "موہنی! کیا یہ اسی پتھر کے ٹکڑے نہیں جسے تراش کر وہ مورتی بنائی گئی ہے؟"

موہنی نے ایک ٹکڑا اٹھا کر غور سے دیکھتے ہوئے جواب دیا "پتھر کا رنگ تو وہی ہے۔"

رندھیر نے کہا۔ "مادھو کو میں نے یہ مورتی تراشتے ہوئے اس وقت دیکھا تھا جب یہ بالکل نکمی تھی۔ میں نے تم سے ذکر بھی کیا تھا لیکن مجھے یہ خیال نہ تھا کہ وہ ایسی مورتی تراش سکے گا۔"

"لیکن اس مورتی کو مندر میں کس نے پہنچایا؟"

"یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی پہلے اس نے پھول دے کر بھگوان کی پجارن

کو بھرشٹ کیا تھا اور اب اسی نے بھگوان کے مندر پر دھاوا بول دیا ہے۔ اگر شہر والوں کو معلوم ہو جائے کہ یہ مورتی جس پر وہ دھن دولت نچھاور کر رہے ہیں ایک اچھوت کی بنائی ہوئی ہے تو؟"

موہنی نے کہا "رندھیر! اگر مورتی اس نے مندر میں رکھی ہے تو بہت برا کیا ہے ـــ!"

رندھیر بولا: "میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ یہ مورتی اس نے بنائی ہے۔ تاہم میرا یہ خیال ہے کہ اسے مندر میں لے آنے والا کوئی اور ہے۔ ممکن ہے کہ یہ گوپال یا شنکر کا کام ہو۔"

موہنی نے کہا "تو پھر انہیں اس بات کا علم ضرور ہوگا کہ وہ مادھو کی بنائی ہوئی ہے۔"

"یہی تو میں سوچ رہا ہوں موہنی! اس کی جان خطرے میں ہے۔"

"تم اس سے پوچھ نہیں سکتے؟"

"میں ان سے پوچھنے سے پہلے مادھو سے پوچھنا ضروری سمجھتا ہوں۔"

"وہ کہاں ہوگا؟"

"یہیں پاس ہی اس کا گھر ہے۔ چلو! وہاں چلیں۔"

"نہیں! مجھے نہ لے جاؤ کوئی دیکھ لے گا تو کیا کہے گا؟"

"تم دور ٹھہرنا میں اس سے پوچھ آؤں گا ممکن ہے کہ وہ راستے میں کہیں پھرتا پھراتا نظر آ جائے۔" گنجان درختوں سے باہر نکل کر انہیں ایک طرف سے بانسری کی آواز سنائی دی اور موہنی کا دل دھڑکنے لگا۔

رندھیر نے کہا "یہ وہی ہے چلو!"

موہنی اور رندھیر ایک ٹیلے پر سے گزرتے ہوئے ایک کھلے میدان میں پہنچے

مادھو سوکھی گھاس کے ایک ڈھیر پر بیٹھا بنسری بجا رہا تھا۔ آس پاس بکریاں اور بھیڑیں چر رہی تھیں۔ موہنی نے رک کر کہا: "رندھیر! تم پوچھ آؤ۔ میں یہیں ٹھہرتی ہوں۔"

"تم ڈرتی ہو اس سے۔" "آؤ!"

مادھو کے قریب پہنچ کر دونوں کچھ دیر کھڑے رہے۔ وہ اپنی دھن میں مگن تھا بالآخر رندھیر نے آہستہ سے آواز دی: "مادھو!"

مادھو گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا: "تم آگئے!" اس نے یکے بعد دیگرے دونوں کی طرف دیکھا اور بالآخر اس کی نگاہیں موہنی پر مرکوز ہو کر رہ گئیں۔

موہنی ان نگاہوں کی تاب نہ لا سکی اس نے آنکھیں جھکا لیں۔

رندھیر نے کہا: "مادھو! میں تم سے ایک بات پوچھنے آیا ہوں۔"

مادھو نے چونک کر رندھیر کی طرف دیکھا اور جلدی سے گھاس کا ڈھیر زمین پر بچھاتے ہوئے کہا: "آؤ، بیٹھ جاؤ!"

رندھیر نے کہا نہیں ہمیں جلدی ہے۔ میں تم سے صرف ایک سوال کا جواب پوچھنا چاہتا ہوں۔

"وہ مورتی جو تم بنا رہے تھے، کہاں ہے؟"

مادھو نے بدحواس ہو کر پہلے رندھیر اور پھر موہنی کی طرف دیکھا اور دونوں کے چہروں پر غصے کی بجائے ہمدردی کے آثار پا کر کہا: "بیٹھ جاؤ میں بتاتا ہوں۔"

رندھیر اور موہنی ادھر اُدھر دیکھ کر گھاس پر بیٹھ گئے اور مادھو نے ان سے ذرا ایک طرف ہٹ کر بیٹھتے ہوئے کہا: "تم مندر سے ہو کر آئے ہو؟"

"ہاں!" رندھیر نے جواب دیا۔

"تو پھر مجھ سے کیا پوچھتے ہو؟"

رندھیر نے کہا: "میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ یہ مورتی تم نے وہاں پہنچائی

ہے یا ۔ ۔ ۔ ۔ !"

"ہاں میں نے۔"

"کیوں؟"

"مورتیوں سے صرف مندروں والے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ وہ میرے کسی کام کی نہ تھی۔"

"لیکن تم تو بھگوان کا اوتار بننا چاہتے تھے؟"

"میں اب بھی بھگوان کا اوتار بننا چاہتا ہوں لیکن اس خواہش کو پورا کرنے کے لیے مورتی میری کوئی مدد نہیں کر سکتی۔ بھگوان کی راہ دکھانے کے لیے دنیا میں بہت کچھ ہے۔ چاند، سورج، ستاروں، دریاؤں اور پہاڑوں کے ہوتے ہوئے ہمیں بھگوان کی محبت کے لیے اپنے ہاتھ کی بنائی ہوئی مورتیوں کی ضرورت نہیں ہے۔"

رندھیر نے لاجواب سا ہو کر کہا: "اگر لوگوں کو یہ سب باتیں معلوم ہو جائیں تو تم جانتے ہو کہ تمہاری سزا کیا ہو گی؟"

"اگر تم سزا دینا چاہو تو میں حاضر ہوں۔ ورنہ لوگوں کو یہ بات معلوم نہیں ہو سکتی۔"

شانتا مادھو کا کھانا لے کر آ رہی تھی۔ اس کی آمد سے گفتگو کا یہ سلسلہ تھوڑی دیر کے لیے منقطع ہو گیا۔ شانتا نے لسی کا کٹورا زمین پر رکھ کر اس کے اوپر ایک میلے کپڑے میں لپٹی ہوئی روٹیاں رکھ دیں اور حیرانی اور مسرت کے ملے جلے جذبات کے ساتھ رندھیر اور موہنی کی طرف دیکھنے لگی۔ باغِ ہستی کا یہ حسین غنچہ اب مہکتا ہوا پھول بن چکا تھا۔

رندھیر گزشتہ چند مہینوں میں شانتا کو دوبارہ دیکھنے کی کئی تدبیریں سوچ چکا

تھا آج بھی اس کے تحت الشعور میں اگر حُسن اور معصومیت کے اس پیکرِ مجسّم کی جستجو کارفرما نہ ہوتی تو وہ موہنی کو مادھو کی تلاش کے لیے اس قدر مجبور نہ کرتا۔ اس کے خوابوں کی دیوی اس کے سامنے تھی وہ کوشش کے باوجود شانتا سے بے تعلقی ظاہر نہ کر سکا۔ اس نے کہا: "موہنی! تم اسے جانتی ہو؟"

"یہ شانتا ہے، مادھو کی بہن۔ بیٹھ جاؤ شانتا!"

شانتا نے مادھو کی طرف اجازت طلب نگاہوں سے دیکھا اور اُس کا اشارہ پا کر اس کے قریب بیٹھ گئی۔

موہنی کی نسوانی حِس کو رندھیر اور شانتا کی نگاہوں کے سوال و جواب سمجھنے میں دیر نہ لگی اس نے کہا: "جب ہم نے شانتا کو دیکھا تھا یہ بہت چھوٹی تھی"۔

"ہاں۔ لیکن میں نے اسے اس دن بھی دیکھا تھا۔"

"کب؟"

"جب مادھو کی تلاش کے لیے آیا تھا۔"

رندھیر اور موہنی بچپن کے ساتھی تھے اور انہیں عمر بھر کے ساتھی بنانے کے متعلق دونوں کے والدین کی طرف سے مبہم سے اشارے بھی ہو چکے تھے یہی وجہ تھی کہ مادھو کے جذبات سے باخبر ہونے کے باوجود موہنی اسے اپنے دل میں جگہ دینے کا فیصلہ نہ کر سکی۔ اب تک مادھو کے ساتھ اس کا اُنس فقط ہمدردی تک محدود تھا۔ وہ رندھیر کے ہوتے ہوئے اپنے دل میں کسی کا خیال تک لانا ایک پاپ سمجھتی تھی۔ وہ یہ بھی محسوس کرتی تھی کہ اگر رندھیر نہ ہوتا تو وہ مادھو کو اس قدر قریب سے دیکھنے پر متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکتی۔ اگر وہ بھی رندھیر کی طرح ایک کھشتری ہوتا تو وہ شاید تمام عمر یہ فیصلہ نہ کر سکتی کہ اپنی دائمی محبت کے لیے کسی کو منتخب کرے اور اگر یہ دونوں اس کے بچپن کے ساتھی ہوتے

تو جوانی تک پہنچتے پہنچتے اس کے دل پر صرف مادھو کا قبضہ رہ جاتا۔ اب وہ رندھیر سے محبت کرتی تھی لیکن مادھو سے ڈرتی تھی۔ کیونکہ وہ حسین ہونے کے باوجود ایک اچھوت تھا۔

رندھیر کو انتہائی محویت کے ساتھ شانتا کی طرف متوجہ پا کر اس نے مادھو کی طرف دیکھا وہ بے قرار اور تیز نگاہیں اس کی آنکھوں سے گزرتی ہوئی دل کی گہرائیوں تک جا پہنچیں اور اس نے محسوس کیا کہ اس کے دل میں اس اچھوت کے لیے صرف ہمدردی کے جذبات ہی نہیں، بلکہ وہ اس کے دل کے ساز کے ان سوئے ہوئے تاروں کو چھیڑ سکتا ہے جن تک رندھیر یا کسی اور کی نگاہوں کی رسائی نہیں ہو سکتی۔ وہ سوچنے لگی۔ کاش! مادھو رندھیر ہوتا لیکن اسے فوراً اس خیال پر شرم سی محسوس ہونے لگی۔ وہ اٹھ کر بولی۔

"چلو رندھیر دیر ہو رہی ہے۔ ماتا جی میرا انتظار کرتی ہوں گی۔"

رندھیر بادلِ نخواستہ اٹھ کھڑا ہوا۔ مادھو اور شانتا بھی اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

رندھیر نے کہا: "مادھو! موہنی کو تمہاری بہت فکر تھی۔"

موہنی کو رندھیر کی یہ طنز بری معلوم ہوئی۔ وہ اس کے جواب میں شانتا کو رندھیر کے متعلق کچھ بتانا چاہتی تھی۔ تاہم وہ خاموش رہی۔

رندھیر نے پھر کہا "اچھا مادھو چلتے ہیں ہم نے تمہیں بہت پریشان کیا۔"

"کاش! تم مجھے ہر روز پریشان کرتے رہو" یہ کہہ کر مادھو موہنی کی طرف دیکھنے لگا۔

"بھیا! میں بھی گھر جاتی ہوں" شانتا نے کہا۔

"اچھا جاؤ۔"

شانتا، موہنی اور رندھیر کے پیچھے پیچھے چل دی۔ رندھیر نے مڑ کر پوچھا "شانتا! تمہارا بھائی اب بھی پتھر تراشا کرتا ہے یا نہیں؟"

"اسے چچا بدھو نے منع کر دیا ہے۔ وہ مورتی جو اس نے بنائی تھی وہ بھی کہیں پھینک آیا ہے۔"

موہنی نے پوچھا "تمہاری ماں کیسی ہے؟"

"اچھی ہے تم اس سے ملو گی؟ چلو وہ بہت خوش ہو گی۔"

رندھیر نے کہا "ہاں موہنی دیکھو گی اس کی ماں کو؟"

"نہیں! اب ہمیں دیر ہو رہی ہے۔ پھر سہی۔"

تھوڑی دور چل کر ان کے راستے علیحدہ ہو گئے۔

---

(۴)

موہنی اور رندھیر کو رخصت کرنے کے بعد مادھو کچھ دیر بے حس و حرکت اپنی جگہ پر کھڑا رہا لیکن وہ جونہی ٹیلے کی آڑ میں غائب ہوئے اس کے دل میں اک طوفان سا اٹھا اور وہ کچھ سوچے بغیر ان کے پیچھے بھاگا اور آن کی آن میں ٹیلے کی چوٹی پر جا پہنچا۔ رندھیر اور موہنی اتنی دیر میں ٹیلے سے نیچے اتر کر جھیل کے کنارے درختوں کے قریب پہنچ چکے تھے۔ مادھو کی بے قرار نگاہیں کچھ دیر ان کا تعاقب کرتی رہیں لیکن تھوڑی دیر میں وہ گھنے درختوں میں چھپ گئے اور مادھو کو فضا میں ہر طرف اداسی نظر آنے لگی۔ اس نے سوچا۔ شاید میں موہنی کو دوبارہ نہ دیکھ سکوں۔ وہ آنے والی زندگی میں مایوسی، تنہائی اور بے بسی کے تصور سے کانپ اٹھا۔ مندر اور مورتیاں چھوت اور اچھوت کی حدِ فاصل کے درمیان اب تک ایک پل کا کام دے رہے

تھے لیکن اب یہ پل منہدم ہو چکا تھا۔ اس کے دل میں موہنی نے بھگوان کی مورتی کے لیے جگہ خالی کی تھی لیکن بدھو کی بے وقت مداخلت نے ایک اچھوت کے دل کو زیادہ عرصہ بھگوان کی مورتی کا مندر نہ بننے دیا۔

تاہم مورتی سے رشتہ توڑنے کے بعد مادھو کو احساس ہوا کہ اس کے دل کی بستی ایک ایسے وجود کے تصور سے آباد ہو چکی ہے جو دنیا کے حسین مناظر کی طرح ایک زندہ حقیقت ہے...... یہ زندہ حقیقت موہنی تھی... موہنی جس نے اس کے شعور میں داخل ہو کر اس کے دل میں مندر، مورتیاں اور دیوتاؤں سے لگاؤ پیدا کیا تھا... موہنی جو اس کا منتہائے مقصود تھی.... جس تک پہنچنے کے لیے وہ بھگوان کی مورتی کی رہنمائی اور مدد چاہتا تھا۔ بھگوان یا کائنات کی ایک عظیم طاقت کا اسے اب بھی اعتراف تھا لیکن اس کی پرواز کا رخ بھگوان کی طرف نہ تھا بلکہ وہ اس زبردست طاقت سے قوتِ پرواز حاصل کر کے اس خلیج کو عبور کرنا چاہتا تھا جو موہنی اور اس کے درمیان حائل تھی۔

ٹیلے پر کھڑا کچھ دیر وہ آگے بڑھنے یا پیچھے لوٹنے کا فیصلہ نہ کر سکا لیکن اچانک ایک خیال سے اس کے جسم میں بجلی کی لہریں دوڑنے لگیں "کیا موہنی کو یہاں لانے میں اس زبردست قوت کا ہاتھ نہیں۔ کیا اس کا یہاں آنا یہ ظاہر نہیں کرتا کہ اسے میرے ساتھ انس ہے؟ لیکن میں انتہائی کوشش کے باوجود اسے دل کی بات نہ بتا سکا۔ اسے خوش کرنے کی بجائے میں نے اونچی ذات والوں کو برا بھلا کہہ کر شاید اسے ناراض کر دیا ہو۔ کیا یہ ضروری نہ تھا کہ میں اپنا دل کھول کر اس کے سامنے رکھ دیتا؟"

یہ خیال آتے ہی اس نے محسوس کیا کہ وہ زبردست قوت ایک تازہ اقدام کے لیے اس کی تائید کر رہی ہے۔ وہ جھاڑیوں سے بچتا اور پتھروں پر کودتا ہوا

ٹیلے سے نیچے اُترا اور پوری رفتار سے بھاگنے لگا۔

درختوں سے نکل کر رندھیر اور موہنی کو دیکھتے ہی اس کی رفتار سُست پڑ گئی۔ اس نے اپنے دل سے سوال کیا "اگر رندھیر بُرا مان گیا تو؟" اور پھر خود ہی یہ کہہ کر دل کو تسلی دینے لگا۔ نہیں رندھیر! ایسا نہیں۔ وہ اونچی ذات کے دوسرے انسانوں سے مختلف ہے اسے میرے ساتھ ہمدردی ہے۔ اور اگر وہ خفا بھی ہو جائے تو بھی مجھے اس کی پرواہ نہیں۔ محبت پاپ نہیں۔ موہنی یقیناً میری باتوں سے خفا نہ ہو گی۔ اور اگر خفا ہو بھی گئی تو کم از کم میرے دل سے تمام عمر کی خلش دور ہو جائے گی۔ اس کی رفتار پھر تیز ہونے لگی۔

رندھیر اور موہنی اس کے پاؤں کی آہٹ سے پیچھے مڑ کر دیکھنے لگے۔ اُن کی جواب طلب نگاہیں پھر اس کے پاؤں کی زنجیر بن گئیں اور وہ رک کر ایک لمحہ کے توقف کے بعد آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہُوا ان کے سامنے جا کھڑا ہُوا۔

رندھیر نے پوچھا: "کیوں مادھو! خیر تو ہے؟" رندھیر کے لہجے میں ہمدردی بھی تھی اور حیرانی بھی۔ تاہم مادھو کچھ دیر اس کے سوال کا جواب نہ دے سکا۔ بالآخر اس نے بڑی کوشش کے بعد کہا: "میں ۔ ۔ ۔ ۔ میں۔ موہنی دیوی سے کچھ کہنا چاہتا تھا۔"

موہنی پریشان ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ رندھیر نے کہا: "کہو! کیا کہنا چاہتے ہو موہنی سے؟"

مادھو کے دماغ میں اب کوئی موضوع تھا نہ الفاظ۔ اس نے بڑی مشکل سے کہا: "موہنی دیوی! ابھی جو کچھ میں نے مورتی کے متعلق کہا تھا۔ آپ اس سے خفا تو نہیں ہو گئیں؟"

موہنی اس سوال کا جواب دینے کی بجائے سراسیمگی کے عالم میں اُس کی

طرف دیکھنے لگی۔ مادھو پھر بولا: "میرا یہ ارادہ نہ تھا کہ میں آپ کا دل دُکھاؤں۔"

موہنی نے مادھو کو ٹالنے کی نیت سے کہا: "میں تم سے خفا نہیں۔ مجھے تم پر خفا یا خوش ہونے کا حق ہی نہیں۔"

مادھو کہنا چاہتا تھا کہ یہ حق میں آپ کو دے چکا ہوں لیکن اسے جرأت نہ ہوئی۔ اپنے مافی الضمیر کے اظہار کے لیے اسے موہنی کی بجائے رندھیر سے مخاطب ہونا نسبتاً آسان نظر آیا۔ وہ بولا:

"رندھیر! میں دیوتاؤں سے محبت نہ کر سکا۔ لیکن میرے دل میں تمہارا پریم اس پریم سے کہیں زیادہ ہے جو تمہارے دل میں دیوتاؤں کے لیے ہے۔ میں اس زبردست طاقت کو مانتا ہوں جسے تم بھگوان کہتے ہو لیکن میں اپنے ہاتھوں کی بنائی ہوئی مورتیوں کی بجائے بھگوان کے بنائے ہُوئے دیوتاؤں سے پریم کرنا بہتر سمجھتا ہوں اور میرے لیے تم بھگوان کے بنائے ہوئے دیوتا ہو۔"

اس تم کا اشارہ رندھیر سے زیادہ موہنی کی طرف تھا اور وہ اس کی مٹھاس محسوس کیے بغیر نہ رہ سکی۔ ایک لمحہ کے لیے وہ ایک عورت تھی اور اس کے سامنے وہ ایک مرد تھا جس کی آنکھوں میں شب کی سیاہی اور ناہید کا نور تھا۔ جس کی ہر نگاہ چھوت اور اچھوت کے درمیان صدیوں سے تعمیر ہونے والی ناقابلِ تسخیر دیواروں کو مسمار کر رہی تھی۔

اس نے اضطراری حالت میں کہا: "مادھو ہم تم سے ناراض نہیں۔" سماج کی مقدس بیٹی کا غرور ملائمت میں تبدیل ہو چکا تھا لیکن ان الفاظ کے بعد جب اس نے رندھیر کی طرف دیکھا تو یہ ملائمت حیا میں تبدیل ہونے لگی۔ اس نے کہا "چلو رندھیر!"

مادھو نے پوچھا "پھر آؤ گے؟"

رندھیر نے جواب دیا "شاید!"

اس شاید سے رندھیر کا مطلب ضرور تھا لیکن موہنی اپنے خیال کے مطابق ہمیشہ کے لیے جُدا ہو رہی تھی۔

---

(۵)

اس ملاقات کے بعد مادھو کی زندگی کی تمام دلچسپیاں سمٹ کر موہنی کے تصور میں سما گئیں۔ اسے دنیا کی ہر حسین شے اور ہر دل کش منظر میں موہنی کی جھلک نظر آنے لگی۔ موہنی جس نے اس کے تحت الشعور میں داخل ہو کر اسے بھگوان کی طرف مائل کیا تھا جس نے اپنے خالق کی مورتیاں بنانے پر آمادہ کیا تھا۔ اب اس کے دل و دماغ کی تمام صلاحیتوں کو اپنی طرف متوجہ کر رہی تھی۔

بھگوان کی مورتی کو مندر میں چھوڑ آنے کے بعد مادھو نے محسوس کیا کہ وہ زنجیر جس کی مدد سے وہ موہنی کے ساتھ منسلک ہونا چاہتا تھا، ٹوٹ چکی ہے۔ وہ پُل جو اچھوت کے ایک جھونپڑے کو چھوت کے محل سے ملانے کا کام دے سکتا تھا ایک غیر متوقع سیلاب کی نذر ہو چکا ہے۔

کئی مہینے مُورتی تراشنے میں منہمک رہ کر وہ کئی ہوائی قلعے تعمیر کر چکا تھا مُورتی کے سامنے ہاتھ باندھ کر ہر التجا کے بعد اسے محسوس ہوتا کہ وہ آج نہیں تو کل، کل نہیں تو پرسوں بھگوان کا اوتار بن جائے گا۔ بھگوان اپنی بے جان مورتی کو جینے کی قوت عطا کرے گا۔ اور وہ کہے گی کہ "مادھو! ہم تم سے بہت خوش ہیں، مانگو کیا مانگتے ہو؟" اور وُہ جوشِ عبودیت میں مُورتی کے پاؤں پر سر رکھ کر اس کے مقدس چرنوں کو اپنے آنسوؤں سے دھونے کے بعد کہے گا کہ "بھگوان! میں تجھ سے

موہنی کو مانگتا ہوں۔" اور بھگوان یہ کہے گا کہ ہم تیری یہ خواہش پوری کرتے ہیں۔

پھر بھگوان اپنی نامعلوم قوتوں کے ساتھ اونچی ذات والے ہر شخص کے دل میں داخل ہو کر کہے گا: "دیکھو! مادھو ہمارا اوتار ہے تمہیں اس سے نفرت کرنے کا حق نہیں۔" اور اس کے زبردست ہاتھ موہنی کو سماج کی زنجیروں سے چھڑا کر اس کے پاس لے آئیں گے اور پھر وہ اور موہنی مل کر ایسی دنیا تعمیر کریں گے جس میں ہر انسان۔ انسان سمجھا جائے گا جس میں چھوت اور اچھوت کے درمیان نفرت اور حقارت کی دیواریں نہیں ہوں گی۔"

لیکن بدھو نے یہ تمام ہوائی قلعے مسمار کر دیے حسین سپنوں کی سہانی رات دن کی تلخ حقیقتوں میں تبدیل ہو گئی۔ اور وہ بار بار اپنے دل میں یہ کہہ رہا تھا۔ کہ کاش! میں تمام عمر ان سپنوں کے فریب میں مبتلا رہتا۔

صبح کے وقت اس نے بدھو کے ساتھ بھیڑیں لے جاتے ہوئے ٹیلے پر چڑھ کر شہر کی طرف دیکھا وہ پگ ڈنڈیاں جو باہر کی دنیا کو شہر سے ملاتی تھیں اسے ناقابلِ گزر اور حوصلہ شکن نظر آنے لگیں اس نے مندر کی طرف نگاہ دوڑائی اور محسوس کیا کہ وہ مُورتی جسے وہ خود تراش کر مندر میں رکھ آیا تھا۔ موہنی اور اس کی قوم کے تمام انسانوں کو مادھو اور اس کی قوم کے تمام انسانوں کے ساتھ نفرت اور عداوت کا سبق دے رہی ہے۔ اور یہ کہ وہ بھگوان کا اوتار بننے کے لیے نہیں بلکہ اچھوت رہنے اور اچھوت کو ملانے کے لیے پیدا ہُوا ہے۔

لیکن دوپہر کے وقت رندھیر کے ساتھ موہنی کی غیر متوقع آمد کے بعد اس پر یہ حقیقت کھُلی کہ وہ سماج کے مندروں اور مورتیوں کا باغی ہونے کے باوجود موہنی کی نظروں میں قابلِ نفرت نہیں اس انکشاف کے بعد زندگی کی تلخ حقیقتیں پھر

حسین سپنوں میں تبدیل ہونے لگیں۔ ہوائی قلعے پھر تعمیر ہونے لگے۔ اس کے من مندر میں بھگوان کی مورتی کی خالی جگہ موہنی کی جیتی جاگتی تصویر نے لے لی۔ مُورتی کے وسیلہ سے بھگوان تک پہنچنے کی بجائے اسے موہنی کا وسیلہ بنا کر بھگوان تک پہنچنا زیادہ آسان اور خوش کُن نظر آنے لگا۔

مادھو کو اپنی دنیا کے ہر افق پر موہنی اور صرف موہنی نظر آنے لگی۔ وہ بنسری کے ہر نغمے میں اس کی آواز کی مٹھاس پیدا کرنا چاہتا تھا اور رُوئے زمین کے ہر پتھر کو تراش کر موہنی کی شکل میں تبدیل کرنا چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ سماج والوں کے ہر مندر سے بھگوان کی خیالی تصویریں اٹھا کر ان کی جگہ موہنی کی تصویریں رکھ دے۔ مندر کی مورتیاں بھگوان کے متعلق سنگ تراشوں کے پست تصورات کی آئینہ دار تھیں لیکن موہنی بھگوان کی اپنی قوتِ تخلیق کا مظہر تھی اس کی صناعی کا بہترین نمونہ۔

موہنی کے لیے بڑھتے ہوئے شوق کے ساتھ ہی گردوپیش کی دلچسپیاں کم ہونے لگیں۔ چند دنوں کے بعد اس نے محسوس کیا کہ بھیڑیں چرانے اور مچھلیاں پکڑنے کا مشغلہ ایسا نہیں جو اس کے دل کی بڑھتی ہوئی بے قراری کا مداوا ہو سکے اسے انتظار کے لیے لمبے دن اور تنہائی کی طویل راتیں صبر آزما نظر آنے لگیں۔ اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے اسے کسی ہمراز، کسی رفیق اور کسی دوست کی ضرورت محسوس ہوئی لیکن آس پاس کی بستیوں کے اچھوتوں میں کوئی ایسا نہ تھا۔ جو اس کی اس ضرورت کو پورا کر سکتا۔ احساسِ کمتری میں پسے ہوئے انسانوں میں کوئی ایسا نہ تھا جو اس کی بڑھتی ہوئی امنگوں اور اُٹھتے ہوئے حوصلوں کی تائید کرتا —

قریباً دو ہفتے انتہائی پریشانی کی حالت میں گزارنے کے بعد وہ جھیل کے کنارے ایک جگہ زمین میں دفن کیے ہوئے اوزار نکال کر گھر لے آیا۔ دوپہر

کے وقت اس نے دریا کے کنارے پڑے ہوئے پتھروں میں سے ایک سفید رنگ کا بھاری پتھر منتخب کیا اور اسے بھی اٹھا کر گھر لے آیا۔

لوگوں کی نگاہوں سے بچ کر ایسا مشغلہ جاری رکھنے کے لیے جھیل کے آس پاس کئی محفوظ مقامات تھے لیکن مادھو اس معاملہ میں کسی کی مداخلت برداشت کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ سماج والوں کی طرف سے اسے اطمینان تھا کہ اُن کی نگاہوں سے اور جگہوں کی نسبت اس کی جھونپڑی زیادہ محفوظ ہے۔ اپنے گھر میں اسے سب سے زیادہ بدھو کی مخالفت کا ڈر تھا لیکن اسے یہ تسلی تھی کہ بدھو کو فقط دیوتاؤں کی مورتیوں سے نفرت ہے۔ جب اسے یہ علم ہوگا کہ وہ بھگوان یا دیوتا کی بجائے کسی انسان کی مُورتی بنا رہا ہے تو شاید وہ معترض نہ ہو۔

چنانچہ جب بدھو شام کے وقت مچھلی کے شکار سے واپس آیا تو مادھو سنگ تراشی میں مصروف تھا۔ اس نے آتے ہی کنول اور شانتا سے جو باہر کھڑی تھیں، پوچھا "مادھو کہاں ہے؟"

کنول نے سادگی سے جواب دیا "اندر پتھر توڑ رہا ہے۔ کہتا ہے شانتا کے لیے پتھر کی گڑیا بناؤں گا۔ اور اسے دیکھو یہ اتنی بڑی ہو کر گڑیا سے کھیلے گی؟"

شانتا اپنی ماں کے اس جواب پر بدھو کے بدلتے ہوئے تیور دیکھ کر گھبرا گئی اور جلدی سے بولی: "ہاں چچا! بھیا بہت اچھی گڑیا بناتا ہے۔"

جھونپڑی کے اندر تیشے کی ٹھک ٹھک اچانک بند ہو گئی اور مادھو جھجکتا ہُوا باہر نکلا اور بدھو کی طرف سے کسی سوال کا انتظار کیے بغیر بولا "چچا میں شانتا کے لیے گڑیا تراش رہا ہوں۔"

بدھو کچھ کہے بغیر جھونپڑی کے اندر داخل ہُوا اور پتھر کی ضخامت سے

قدرے پریشان ہو کر مادھو کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کی نگاہیں طرح طرح کے شکوک کا اظہار کر رہی تھیں۔

مادھو پھر بولا "چچا! شانتی کہتی تھی کہ مجھے گڑیا بنا دو اور میں بھی بہت اداس تھا چند دن جی لگا رہے گا۔"

"شانتا اب جوان ہے اسے گڑیا سے کیا کام؟ مادھو مجھے ڈر ہے کہ تمہارے خیالات ابھی تک درست نہیں ہوئے۔"

"چچا تمہارا خیال ہے کہ میں پھر بھگوان کی مورتی بنا رہا ہوں؟ نہیں نہیں میں جھوٹ نہیں بولتا۔ میں ایک ایسی گڑیا بناؤں گا جسے آپ بھی پسند کریں گے۔"

مادھو کا جواب بدھو کو مطمئن نہ کر سکا۔ تاہم وہ خوش تھا کہ مادھو نے یہ بات اس سے چھپانے کی کوشش نہیں کی۔

چند دنوں کے بعد سنگ تراشی میں مادھو کا بڑھتا ہوا انہماک دیکھ کر بدھو اور کنول پریشان ہونے لگے۔ طلوعِ آفتاب سے غروبِ آفتاب تک جھونپڑی سے ٹھک ٹھک کی آواز آتی رہتی اور جب تیشہ چلاتے چلاتے مادھو کے ہاتھ تھک جاتے تو وہ تھوڑی دیر کے لیے بنسری اٹھا لیتا اور جھونپڑی میں کبھی پُرسُرور اور کبھی دردناک نغمے گونجنے لگتے۔ شانتا بھی اپنی گڑیا کے لیے مادھو کی اس درجہ محنت پر حیران تھی۔

کبھی کبھی بدھو اسے بھیڑیں چرانے یا شکار کے لیے اپنے ساتھ لے جاتا لیکن مادھو سے کام کی تکمیل کا شوق اسے زیادہ دیر باہر نہ ٹھہرنے دیتا۔ چند دنوں کے بعد شانتا اپنے گھر میں ایک خوبصورت گڑیا دیکھ کر خوشی سے پھولی نہ سماتی تھی لیکن مادھو اپنی کاوش پر مطمئن نہ تھا۔ شانتا نے اس کے کان میں کہا: بھیا! یہ تو موہنی معلوم ہوتی ہے۔" اس نے جواب دیا۔ نہیں نہیں!! یہ موہنی جیسی نہیں میں اور بناؤں گا اس سے بھی زیادہ خوبصورت۔"

[illegible]

رندھیر اور شانتا

رندھیر نے موہنی کے متعلق اپنے خیالات کا کبھی تجزیہ نہیں کیا تھا۔ وہ بچپن سے ایک ساتھ رہے۔ ایک ہی پنڈت سے تعلیم پائی۔ ایک دوسرے کے متعلق نہیں تنہائی میں سوچنے کا موقع ہی نہ ملا اور جوانی کی ابتدائی منزل میں قدم رکھنے کے بعد بھی ان دونوں کو مستقبل میں جدائی کا کوئی خطرہ نہ تھا۔ اس لیے وہ جذبات جو جدائی کے خدشات میں ابھرتے ہیں۔ ایک دائمی قربت کی وجہ سے دبے رہے۔ موہنی الدین کے بعد رندھیر کو اپنا نگران اور محافظ خیال کرتی تھی اور وہ اسے اپنی زندگی کی ایک بہت بڑی دلچسپی سمجھتا تھا۔

شانتا اور مادھو سے آخری ملاقات کے بعد دونوں کو اپنے مستقبل کے متعلق سوچنے کا موقع ملا۔ رندھیر ایک ناپختہ ذہن نوجوان کی طرح زندگی کے چند دن حالات کے سیلاب کے ساتھ بہنا چاہتا تھا لیکن موہنی ایک عورت کی فطرت سے مجبور ہو کر آنے والے طوفان سے بچنے کے لیے کسی جائے پناہ کی تلاش میں تھی۔

رندھیر جب بھی صبح کے وقت شکار اور شام کے وقت سیر کے بہانے سے نکلتا اس کی پہلی اور بعض اوقات آخری منزل جھیل کے آس پاس کی چراگاہیں ہوتیں کبھی مادھو سے ملنے کے بہانے شانتا سے ملاقات ہو جاتی اور کبھی اسے مایوس لوٹنا پڑتا۔

شانتا کے ساتھ ابتدائی دو تین ملاقاتیں مادھو کی موجودگی میں ہوئیں۔ اس

بیے اس سے کچھ کہنے اور سننے کی خواہش پوری نہ ہو سکی۔ ایک دن چراگاہ میں مادھو کے ساتھ بدھو سے بھی ملاقات ہوئی۔ بدھوا اونچی ذات والوں کے متعلق اپنی رائے بدلنے کے لیے تیار نہ تھا لیکن رندھیر کے ساتھ وہ بہت جلد مانوس ہو گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ رندھیر اس کے ساتھ نہایت انکسار سے پیش آیا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ رندھیر کا لباس قریباً وہی تھا جس میں اس نے پہلی بار سکھدیو کو دیکھا تھا۔ سکھدیو کی طرح اس کی کمر میں بھی تلوار لٹک رہی تھی۔ اس کی انگلی میں سونے کی ایک انگوٹھی بھی تھی سکھدیو کی انگوٹھی کنول کے پاس تھی اور تلوار اب تک بدھو نے سنبھال کر رکھ چھوڑی تھی۔

بدھو نے پوچھا: "تم راجہ کے سیناپتی ہو؟"

رندھیر بدھو کے منہ سے سیناپتی کا لفظ سن کر حیران ہوا۔ اس نے جواب دیا "نہیں! ابھی سیناپتی نہیں۔ میرا باپ سیناپتی تھا لیکن اب وہ شہر کا سردار ہے۔"

بدھو نے کہا۔ "تمہارے پتاجی تو ہم لوگوں سے ضرور نفرت کرتے ہوں گے۔"

"نہیں وہ ہر ایک سے انصاف کرتے ہیں۔"

"میں نے سنا ہے تمہارا ایک سیناپتی اچھوتوں کا بہت بڑا دشمن تھا شاید گنگارام تھا نام اس کا!"

"گنگارام کو مرے ہوئے بہت مدت ہوئی میں اس وقت پیدا بھی نہیں ہوا تھا۔"

"گنگارام کو کسی اچھوت نے مارا تھا؟"

"نہیں اسے ایک کشتری نے مارا تھا وہ میرے پتا کا دوست تھا۔"

"کیا نام تھا اس کا؟"

"سکھدیو۔"

سکھدیو کا نام سن کر مادھو چونکا ہوا لیکن وہ یہ سمجھ کر خاموش ہو رہا کہ یہ کسی

نام کا کوئی دوسرا شخص ہو گا۔

بدھو نے مادھو کی موجودگی میں یہ سلسلۂ کلام جاری رکھنا مناسب نہ سمجھا اس نے کہا: "مادھو! مجھے پیاس لگ رہی ہے۔ جاؤ گھر سے لسی لے آؤ۔"

مادھو گھر کی طرف چل دیا اور بدھو نے رندھیر سے پوچھا "تمہارے باپ کا نام رام داس تو نہیں؟"

"ہاں! ان کا نام یہی ہے، لیکن تم کیسے جانتے ہو؟"

"میں نے کسی سے سنا ہے۔"

بدھو، سکھدیو سے اس کی سرگزشت کئی بار سن چکا تھا۔ اب یہ معلوم کر کے کہ رندھیر رام داس کا بیٹا ہے اس کے رہے سہے شکوک جاتے رہے ورنہ اونچی ذات کے کسی شخص کے ساتھ مادھو کا میل جول اس کے لیے یقیناً تکلیف دہ ہوتا۔ اس کے جی میں آئی کہ اسے سکھدیو کے متعلق کچھ بتائے، لیکن وہ مصلحتاً خاموش رہا۔

رندھیر کی آنکھیں جھونپڑی کی طرف لگی ہوئی تھیں لیکن اس کی توقع کے خلاف جب مادھو لسی لے کر اکیلا واپس مڑا تو وہ دل پر ایک بوجھ سا لے کر رخصت ہوا راستے میں جھیل کے قریب پہنچ کر اس کا دل مسرت سے اچھلنے لگا۔ شانتا پانی کا گھڑا سر پر اٹھائے آ رہی تھی وہ رندھیر کو دیکھ کر ایک درخت کے نیچے کھڑی ہو گئی۔

"شانتا!" اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

شانتا نے آنکھیں اوپر اٹھائیں اور اس کے مرمریں چہرے پر حیا کی سرخی چھا گئی۔

"شانتا! میں تمہارے بھائی کے پاس بیٹھا تمہارا انتظار کر رہا تھا۔"

شانتا نے جھجکتے ہوئے گھڑا نیچے رکھ دیا اور پوچھا "موہنی دیوی کیسی ہے؟"

"اچھی ہے، تمہیں بہت یاد کرتی ہے۔"

"وہ آپ کی کیا ہوتی ہے؟"

"وہ میرے پتا کے دوست کی بیٹی ہے۔"

دونوں کچھ دیر خاموش کھڑے رہے۔ رندھیر اس سکوت کو توڑنے کے لیے کچھ کہنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ ایک طرف سے کسی چوپائے کے بھاگنے کی آہٹ اور کسی انسان کی گالیاں سنائی دیں۔ درختوں میں سے ایک بدحواس گائے نمودار ہوئی اس کے پیچھے شنکر گالیاں بکتا ایک ہاتھ سے گائے کی دُم پکڑے اور دوسرے ہاتھ سے ڈنڈے برساتا چلا آ رہا تھا لیکن گائے تھی کہ مُڑنے کا نام نہ لیتی تھی اور ہانپتے ہوئے شنکر کا پارہ اس لیے بھی تیز ہو رہا تھا کہ یہ گائے گوپال کی تھی۔ رندھیر نے جلدی سے کہا: "اچھا شانتا! تم جاؤ پھر ملیں گے۔"

شانتا گھڑا اٹھانے لگی اور رندھیر ہٹ کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ شنکر نے ان دونوں کو دیکھ کر گائے کی دُم چھوڑ دی اور رندھیر کے قریب آ کر کہا۔ "بڑی خراب ہے جی یہ گائے!"

رندھیر نے جواب دیا "گائے خراب نہیں، چرواہا بے وقوف ہے!"

شنکر رندھیر کی طنز کو پی گیا اور بولا: "آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟"

رندھیر نے جواب دیا "میں شکار کے لیے آیا تھا۔ اب تمہارا منہ دیکھ لیا ہے اس لیے گھر جاتا ہوں۔"

شنکر نے کہا "شکار تو جا رہا ہے۔"

"کون سا شکار؟"

شانتا کچھ دور جا چکی تھی۔ شنکر نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "وہ! ——"

رندھیر نے کڑک کر کہا: "دیکھو شنکر! ہوش سے بات کرو۔ تم ایک برہمن ہو۔"

شنکر نے کھسیانا ہو کر کہا: "معاف کرنا میں مذاق کر رہا تھا۔"

"مذاق کرنے کے لیے عقل کی ضرورت ہے اور وہ بھگوان نے بدقسمتی سے تمہیں نہیں دی۔"

شنکر بڑبڑاتا ہوا گائے کے پیچھے اور رندھیر اسے دل ہی دل میں کوستا ہوا شہر کی طرف چل دیا۔

---

(۲)

اساڑھ کے آخری دن تھے۔ مغرب کی طرف نصف آسمان پر سیاہ، سفید اور مٹیالے رنگ کے بادل چھا رہے تھے۔ ہوا ساکن تھی اور فضا میں حبس تھا۔ دوپہر کے وقت سورج بادلوں کے لحاف میں چھپ گیا اور ابر کا سایہ تیز رفتاری سے مشرق کے ٹیلوں اور پہاڑوں پر دوڑنے لگا۔

شانتا اور کنول اپنی جھونپڑی کے سامنے ایک درخت کے نیچے بیٹھی ہوئی تھیں۔ اچانک شانتا کو جھونپڑی کے پیچھے گھوڑے کی ٹاپ سنائی دی اس کا دل خوشی سے دھڑکنے لگا اور وہ اٹھ کر جھونپڑی کی دوسری طرف پہنچی۔ چند قدم پر رندھیر گھوڑے کی لگام تھامے متجسس نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ شانتا کی نگاہوں نے اسے سمجھا دیا کہ یہاں باتیں کرنا مناسب نہیں اور رندھیر نے ہاتھ کے اشارے سے اسے بتا دیا کہ وہ جھیل کی طرف جا رہا ہے۔ رندھیر کا گھوڑا گھنے درختوں میں غائب ہو گیا اور شانتا اپنی ماں کے پاس آ بیٹھی۔

کنول نے پوچھا "کون تھا شانتا؟"

اس نے جواب دیا "خبر نہیں کون تھا۔" اور پھر تھوڑی دیر کے بعد بولی:

"ماتا! آج بہت گرمی ہے میں ذرا جھیل پر نہا آؤں۔"

"ابھی تو وہاں سے آئی ہو۔ اچھا جاؤ۔"

شانتا اپنی ماں کی حدِ نظر تک تو معمولی رفتار سے چلتی رہی لیکن جھاڑیوں کے عقب میں پہنچتے ہی وہ ایک وحشی ہرنی کی طرح بھاگنے لگی۔

رندھیر کا گھوڑا ایک درخت سے بندھا ہوا تھا اور وہ پانی میں غوطہ لگانے کے بعد کپڑے بدل رہا تھا۔ رندھیر کو دیکھتے ہی شانتا کی رفتار سست پڑ گئی اور وہ اس کے قریب جانے کی بجائے کنارے سے کچھ فاصلے پر ایک درخت کے نیچے کھڑی ہو گئی۔ رندھیر نے اس کے قریب پہنچ کر کہا "شانتا! تم آگئیں؟"

شانتا نے رندھیر کو جواب دینے کی بجائے ایک ہاتھ سے درخت کی ایک جھکی ہوئی شاخ پکڑ کر نیچے کھینچی اور دوسرے ہاتھ سے ایک پتا توڑ کر نیچے پھینک دیا۔

رندھیر نے پھر سوال کیا "شانتا! مادھو کہاں ہے؟"

شانتا نے دوسرا پتا توڑتے ہوئے جواب دیا "وہ سارا دن گھر پر رہتا ہے آج چچا بدھو اسے زبردستی بھیڑیں چرانے لے گیا ہے۔"

"سارا دن گھر پر کیا کرتا ہے وہ؟"

"مورتیاں بنایا کرتا ہے۔"

"مورتیاں؟ وہ کیسی؟"

"اس نے تین مورتیاں بنائی ہیں بالکل موہنی جیسی۔ لیکن تیسری سب سے خوب صورت ہے۔"

رندھیر گہری سوچ میں پڑ گیا۔ موہنی کی مورتی بنانا ایک اچھوت کا ایسا جرم نہ تھا جسے وہ آسانی سے معاف کر سکتا۔ اسے تھوڑی دیر کے لیے اپنی تمام گزشتہ حرکات

پر شرم و ندامت محسوس ہونے لگی۔ مادھو اسے قابلِ نفرت نظر آنے لگا لیکن اس کے ساتھ ہی اسے خیال آیا کہ موہنی اور مادھو کے درمیان اگر میں ایک زنجیر کا کام نہ دیتا تو مادھو کو یہ جسارت نہ ہوتی۔ اور اب یہ معاملہ ایک خطرناک حد تک پہنچ چکا ہے۔ موہنی کو بدنامی سے بچانا میرا فرض ہے۔ میں مادھو کو سمجھا سکتا ہوں اور اگر موہنی کو اس کے ساتھ کوئی دلچسپی ہے تو وہ ہمدردی تک محدود ہے۔ اسے سمجھانے کی ضرورت نہیں۔ اگر اسے معلوم ہو جائے کہ ایک اچھوت اس کی مورتیاں بنا رہا ہے تو وہ اسے عمر بھر معاف نہیں کرے گی ــــ لیکن میں بھی تو مادھو سے مختلف نہیں میں نے بھی تو آج تک یہ نہیں سوچا کہ میرے اور ایک اچھوت لڑکی کے درمیان ایک ایسی خلیج حائل ہے جسے پاٹا نہیں جا سکتا۔ اس کے باوجود میں مستقبل کے نتائج سے بے پروا اس کے پیچھے بھاگا پھرتا ہوں۔ کیا مجھ میں اتنی طاقت ہے کہ سماج کی بیڑیاں توڑ سکوں؟ اس لڑکی کے لیے چنڈال کہلانا گوارا کر لوں گا؟ ان سوالات کے جواب میں اس کا ضمیر پکار اٹھا: "نہیں رندھیر! نہیں! تم مادھو کی طرح خود فریبی میں مبتلا ہو۔ تم شانتا کو ایک کھیل، ایک عارضی دلچسپی سمجھتے ہو۔ تم صرف اس مہکتے ہوئے پھول سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہو لیکن تمہارے دل پر اس کی محبت سے کہیں زیادہ سماج کا احترام اور اگر احترام نہیں تو خوف سوار ہے۔ تم جن پاؤں چل کر اس طرف آئے ہو انہیں پاؤں واپس چلے جاؤ گے اور پھر اس لڑکی کا کیا ہوگا۔ کیا تمہارا پریم اس کے لیے ایک زہر کا پیالہ نہ ہوگا؟"

رندھیر نے مغموم نگاہوں سے شانتا کی طرف دیکھا۔ وہ فکر مند سی ہو کر بولی۔ "آپ مورتی کے متعلق سوچ رہے ہیں؟"

اس نے جواب دیا "ہاں مورتی کے متعلق۔ میں سوچ رہا تھا کہ . . . . شانتا فرض کرو کہ میں یہاں دوبارہ نہ آسکوں تو . . . . تم کیا محسوس کرو گی؟"

شاناکی تمام حسیات سمٹ کر اس کی آنکھوں میں آگئیں۔ وہ چہرہ جو ایک لمحہ پیشتر کائنات کی مسرتوں کا گہوارہ تھا حزن و ملال کی تصویر بن گیا۔ دھڑکتے ہوئے دل کی اُمنگیں، حوصلے اور ولولے، التجائیں بن کر رہ گئیں۔ اور یہ التجائیں کانپتی ہوئی آواز بن کر زبان تک پہنچیں۔ ہونٹ تھرتھرائے، کانپے اور ایک دوسرے سے پیوست ہو کر رہ گئے۔ شانا کچھ کہہ نہ سکی۔ اور التجائیں آنکھوں میں آنسو بن کر چھلکنے لگیں۔

شانا نے سر جھکا لیا۔ اور میلے دوپٹے کے ساتھ آنسو پونچھ کر نیچے دیکھنے لگی۔

اچانک اسے گھاس میں کوئی متحرک شے نظر آئی اور اس کے جسم میں خون کا ہر قطرہ منجمد ہو گیا۔ آنکھوں سے حزن و ملال کی بجائے خوف و ہراس ٹپکنے لگا۔ ایک افعی، گھاس سے اوپر سر نکالے رندھیر کی ٹانگ کے بالکل قریب آچکا تھا۔ شور مچانے کا موقع نہ تھا۔ شانا بجلی کی سی تیزی کے ساتھ آگے بڑھی اور رندھیر کو دھکا دے کر ایک طرف ہٹا دیا۔ لیکن ساتھ ہی اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکلی اور وہ جھک کر اپنے پاؤں کی طرف دیکھنے لگی۔ جس وقت رندھیر کی نظر سانپ پر پڑی۔ وہ پاس ہی ایک جھاڑی میں چھپ رہا تھا۔

رندھیر، شانا کی طرف متوجہ ہوا۔ "کیا ہوا؟" اس نے پوچھا۔

شانا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "کچھ نہیں۔"

رندھیر بولا "اُف بڑا خطرناک سانپ تھا۔ اگر تم دھکا نہ دیتیں تو ضرور مجھے ڈس جاتا۔"

شانا نے کہا "میں نے سنا ہے کہ اس سانپ کے کاٹے ہوئے مر جاتے ہیں؟"

"ہاں! یہ بہت زہریلا ہے۔"

"مرتے وقت تکلیف تو نہیں ہوتی؟"

"نہیں! کہتے ہیں کہ سانپ کے زہر سے نیند سی آجاتی ہے۔"

شانا نے کہا "آپ کہتے تھے کہ آپ پھر یہاں نہیں آئیں گے؟"

"ہاں! لیکن مجھے معلوم نہ تھا کہ تمہارا دل دُکھے گا۔"

شانا نے ہونٹوں پر غمگین مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا "اب میرا دل نہیں دُکھے گا۔ اب اگر آپ آئے بھی تو مجھے نہیں دیکھیں گے۔"

"کیوں شانا! تم کہیں جا رہی ہو؟"

شانا نے کچھ دیر توقف کے بعد غنودگی کی حالت میں آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا "شاید مجھے نیند آ رہی ہے۔۔۔ اس نیند سے شاید میری آنکھیں پھر نہ کھلیں۔"

رندھیر بدحواس ہو کر چلایا "شانا! تمہیں سانپ۔۔۔؟"

"ہاں! مجھے سانپ ڈس گیا ہے لیکن میں خوش ہوں کہ آپ کے کسی کام آ سکی" شانا یہ کہہ کر بیٹھ گئی اور اپنے ٹخنے کی طرف دیکھنے لگی۔

رندھیر ایک لمحہ کے لیے بھونچکا سا ہو کر رہ گیا اور پھر "شانا! شانا!" کہتا ہوا آگے بڑھا اور اس کے منہ کے سامنے بیٹھ گیا۔ اس کے کانپتے ہوئے ہاتھ شانا کے پاؤں کو ٹٹولنے لگے۔ اس نے بے قرار سا ہو کر کہا "کہاں۔ شانا کہاں؟"

شانا نے ٹخنے پر انگلی رکھتے ہوئے کہا "یہاں۔ یہ دیکھو!"

رندھیر کو ٹخنے پر سرخ نشان کے درمیان ایک چھوٹا سا آبلہ دکھائی دیا۔

اس نے درد بھری آواز میں کہا "شانا! تم نے میرے لیے اپنی جان خطرے میں کیوں ڈالی؟"

شانا نے فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ رندھیر کی طرف دیکھا اور جواب دیا "سانپ آپ سے بہت قریب تھا۔ اگر میں آپ کو پرے نہ ہٹا دیتی تو۔۔۔!"

رندھیر کے دل میں اونچی ذات والوں کی نخوت کے قلعے کی مضبوط دیواریں جو پہلے ہی کھوکھلی ہو چکی تھیں۔ اب نابود ہو کر رہ گئیں۔ اچھوت لڑکی اسے پہلی بار ایک

عورت دکھائی دی۔ وہ عورت جو اس کے لیے اپنی جان پر کھیل سکتی تھی، جو موت کی بھیانک صورت دیکھنے کے باوجود مسکرا سکتی تھی۔ اس کا دل کہہ رہا تھا "رندھیر! تم اس محبت اور اس ایثار کے حق دار نہ تھے۔ تم کچھ دیر پہلے سماج سے خوف زدہ ہو کر اس سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہونے کا ارادہ کر رہے تھے۔ تم بزدل ہو۔ محبت اور خوف کبھی ایک جگہ اکٹھے نہیں ہوتے۔ محبت، نفع اور نقصان نہیں دیکھتی اس لڑکی کو دیکھو جو سانپ کے ڈسنے کے باوجود مسکرا رہی ہے۔ کاش! تم بھی اسی قدر بہادر ہوتے۔ لیکن اب کیا ہو گا؟ شانتا کی موت کے تصور سے اس کے جسم پر کپکپی طاری ہو گئی۔ اس نے رنج و کرب میں ڈوبی ہوئی آواز میں کہا "شانتا! چلو۔ تمہیں گھر چھوڑ آؤں۔ یہاں سے آٹھ کوس کے فاصلے پر ایک سپیرا رہتا ہے میں ابھی اسے لاتا ہوں۔"

شانتا نے مغموم آواز میں کہا "سپیرا! وہ کیا کرے گا؟"

"وہ زہریلے سے زہریلے سانپ کے کاٹے ہوئے کا زہر چوس لیتا ہے۔"

"لیکن میں نے سنا ہے کالے سانپ کے کاٹے کا کوئی علاج نہیں۔"

"نہیں! اس کے پاس ہر سانپ کا علاج ہے۔ شانتا! تم بچ جاؤ گی!"

"لیکن آپ کہہ رہے تھے کہ آپ پھر یہاں نہیں آئیں گے۔"

"نہیں! میں جھوٹ کہتا تھا میں ہر روز یہاں آؤں گا۔ میں تمہارے لیے تمام دنیا چھوڑ دوں گا۔ میں تمہارا ہوں۔ ہمیشہ تمہارا۔"

رندھیر کے ہر لفظ کے ساتھ شانتا کی سانس تیز ہو رہی تھی۔ ایک ساعت پیشتر رندھیر سے مایوس ہو کر اسے اس دنیا سے ہمیشہ کے لیے کنارہ کش ہونے پر کوئی ملال نہ تھا۔ بلکہ سانپ کے ڈس جانے کے بعد اسے اس بات کی خوشی تھی کہ اس نے رندھیر پر آخری فتح حاصل کی ہے۔ لیکن اب رندھیر کی زبان سے

محبت کے اعتراف کے بعد اس کے لیے اس دنیا کا ہر کانٹا ایک مہکتا ہوا پھول بن گیا۔ رندھیر اس کا تھا اور وہ موت کے زبردست ہاتھوں سے چھٹکارا حاصل کر کے اس کی دنیا میں رہنا چاہتی تھی۔ پہلے رندھیر کی محبت سے مایوس ہو کر اس کے لیے جینا دشوار تھا لیکن اب رندھیر کی محبت کے یقین کے ساتھ اس کے لیے مرنا مشکل تھا۔ زندگی کی آرزو نے موت کا چہرہ بے حد بھیانک بنا دیا۔ اس نے آنکھوں میں آنسو بھرتے ہوئے پوچھا "وہ سپیرا آ جائے گا؟"

"میں اسے ضرور لاؤں گا لیکن جلدی چلو۔"

شانتا اٹھی اور رندھیر اس کا بازو پکڑ کر اس کے ساتھ چل دیا۔ چند قدم چلنے کے بعد اس نے کہا "میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا رہا ہے۔ ذرا آہستہ چلو۔"

"نہیں شانتا! ہمیں جلدی پہنچنا چاہیئے۔ شانتا نے کچھ دور اور اس کی تیز رفتاری کا ساتھ دیا لیکن اس کے پاؤں ڈگمگا رہے تھے۔ دو تین بار اس کے پاؤں کو پتھروں کی ٹھوکریں لگیں اور رندھیر اسے اپنے بازوؤں میں اٹھا کر جھونپڑی کی طرف بھاگنے لگا۔

---

(۲۳)

شانتا کو اس حالت میں دیکھ کر کنول کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور رندھیر کی طرف دیکھنے لگی اس میں زبان ہلانے یا آگے بڑھنے کی ہمت نہ تھی لیکن ممتا بدحواسی پر جلد ہی غالب آ گئی۔ اس نے کہا "تم کون ہو؟ شانتا کو کیا ہوا؟"

رندھیر نے شانتا کو چارپائی پر لٹاتے ہوئے جواب دیا "اسے سانپ نے

ڈس لیا ہے!"

کنول یہ سن کر میری بیٹی! میری شانتا!! کہتی ہوئی شانتا کی طرف بڑھی اور اسے ہوش میں لانے کے لیے جھنجھوڑنے لگی۔

شانتا نے آنکھیں کھولتے ہوئے کہا "ماتا! مجھے سونے دو۔"

"بیٹی بتاؤ! کہاں کاٹا سانپ نے؟"

شانتا نے لیٹے لیٹے ٹانگ سکیڑ کر ہاتھ کی انگلی ٹخنے پر رکھ دی اور کہا "یہاں"۔

ٹخنے پر چھوٹا سا آبلہ اب کافی اُبھر آیا تھا۔

رندھیر نے تسلی دیتے ہوئے کہا "آپ فکر نہ کریں۔ میں ابھی سپیرے کو لاتا ہوں۔"

کنول نے کہا: "یہ آبلہ کاٹ دیا جائے تو اچھا ہوگا۔"

"او ہو مجھے معلوم نہ تھا۔ لائیے کوئی تیز چیز! میں آج اپنے ساتھ خنجر بھی نہیں لایا۔"

کنول نے پریشان ہو کر کہا "کلہاڑیاں بدھوا اور مادھو لے گئے ہیں اور کوئی تیز چیز گھر پر نہیں۔ ہاں ایک چیز ہے۔ اس کی نوک کافی تیز ہے۔ کنول بھاگتی ہوئی جھونپڑی میں گئی اور نیام سمیت ایک تلوار اٹھا لائی۔ نیام اگرچہ بہت پرانا تھا، لیکن کنول نے جب تلوار نکالی تو وہ چمک رہی تھی۔

کنول نے رندھیر کے ہاتھ میں تلوار دیتے ہوئے کہا "مجھ سے کاٹا نہیں جائے گا تم کاٹ دو۔ جلدی کرو۔"

رندھیر نے جلدی سے تلوار کی نوک سے آبلہ چیر دیا۔ تلوار نیام میں ڈالتے وقت اسے دستے پر اپنے باپ کے نام کے حروف دکھائی دیئے۔ اس نے حیران سا ہو کر

کنول کی طرف دیکھا۔ اور اس سے کچھ پوچھنا چاہا لیکن وقت کی نزاکت کے احساس سے خاموش رہا۔ اس نے کہا "اچھا اب میں جاتا ہوں۔ بہت جلد آؤں گا۔"

کنول نے پوچھا "کہاں رہتا ہے سپیرا؟"

"یہاں سے آٹھ کوس دُور۔"

"آٹھ کوس؟ پھر تو بہت دیر ہو جائے گی۔"

"لیکن میرے پاس گھوڑا ہے۔ میں اسے جھیل پر چھوڑ آیا ہوں۔"

رندھیر جھونپڑی سے نکلا اور پوری رفتار سے جھیل کی طرف بھاگا۔ بادل تمام آسمان پر قبضہ جما چکے تھے۔ جھیل پر پہنچ کر اس نے دیکھا کہ گھوڑا اپنی جگہ موجود نہیں۔ وہ گھوڑے کے غائب ہونے کی مختلف وجوہات سوچتا ہوا گھر سے دوسرا گھوڑا لینے کے ارادے سے شہر کی طرف بھاگا لیکن درختوں کے جھنڈ سے باہر نکلتے ہی اس نے دیکھا کہ شنکر گھوڑے کی لگام پکڑے شہر کی طرف جا رہا ہے۔ سرکش گھوڑا ہر قدم پر سیخ پا ہو رہا تھا اور شنکر خوف زدہ ہو کر ایک ہاتھ سے اس کی لگام پکڑے دوسرے ہاتھ سے چھڑی ہلا ہلا کر اسے دُور رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

آج پھر شہر میں فوراً پہنچنا شنکر کے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ تھا۔ آج وہ بہت کچھ دیکھ چکا تھا۔ رندھیر رام داس کا بیٹا ایک اچھوت لڑکی کے پاؤں چھو رہا تھا اور اسے دیوانوں کی طرح اٹھا کر سینے سے لگائے پھرتا تھا۔ اے کاش! رندھیر تھوڑی دیر اور جھونپڑی میں رہے۔ لیکن یہ سرکش گھوڑا، یہ بدمعاش! یہ ضدی! یہ بیوقوف جانور! جو ایک انسان کا بوجھ اٹھا کر ہوا کی طرح بھاگ سکتا تھا۔ شنکر کی بدقسمتی سے آج آگے بڑھنے کی بجائے الٹے پاؤں چلنے کی مشق کر رہا تھا۔ یہ گھوڑا اس نے اس نیت سے اپنے ساتھ لیا تھا کہ رندھیر اس سے پہلے گھر نہ پہنچ جائے۔ اسے یہ بھی خیال تھا کہ گھوڑے کو بطور ثبوت پیش کرنے کے بعد وہ رام داس کو باقی تمام باتیں

سننے پر آمادہ کر سکے گا لیکن یہ گھوڑا؟ کاش اس کا منہ آج دُم کی طرف لگ جائے۔

رندھیر کی آواز آئی "شنکر ٹھہرو! شنکر ٹھہرو!!" اور شنکر کے سر پر بجلی گر پڑی۔ اور پیٹ میں ناچنے والے چوہے دبک کر رہ گئے۔

گھوڑا رندھیر کی آواز سُن کر ہنہنایا اور پچھلی ٹانگوں پر کھڑا ہو گیا۔

رندھیر کی دوسری آواز آئی "کہاں لے جا رہے ہو اسے؟ ارے کہیں چھوڑ نہ دینا اسے اس کی لگام اوپر سے پکڑو۔"

شنکر بڑبڑایا "جی ہاں! جیسے اس کے منہ میں دانت ہی نہیں۔"

رندھیر نے قریب پہنچ کر گھوڑے کی لگام پکڑی اور غصے سے بولا "بہت بے وقوف ہو تم۔ آخر تم نے وہاں سے اسے کھولا کیوں؟"

شنکر نے طنزیہ لہجے میں جواب دیا "جی میں سمجھتا تھا کہ آپ شاید اس اچھوت لڑکی کے پریم میں اس بیچارے کو بھول گئے ہیں۔"

رندھیر نے بگڑ کر کہا "دیکھو شنکر! مندر سے باہر تمہارا کوئی کام نہیں اگر تمہارے منہ سے ایک لفظ بھی نکلا تو پھر مجھے یہ خیال نہ ہوگا کہ تم برہمن ہو۔"

رندھیر کود کر گھوڑے پر سوار ہوا اور آن کی آن میں شنکر کی نظروں سے غائب ہو گیا۔

سپیرا

آسمان پر مختلف رنگوں کے بادلوں کی تہیں ہموار ہو کر ایک دھندلے رنگ کے پردے میں تبدیل ہو چکی تھیں۔ کوئی پانچ کوس فاصلہ طے کرنے کے بعد رندھیر کو موسلا دھار بارش نے آ لیا۔ ٹیلوں اور چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کے نشیب و فراز سے گزرنے کے بعد اس کے سامنے کسی حد تک ہموار میدان تھا۔ آخری کوس میں اُسے کئی چھوٹی چھوٹی ندیاں عبور کرنی پڑیں۔ وہ کیچڑ اور پانی سے لت پت شودروں کی ایک چھوٹی سی بستی میں جو ایک ٹیلے پر آباد تھی، داخل ہوا، اور ایک جھونپڑی کے قریب پہنچ کر آوازیں دینے لگا "ارے کوئی ہے۔ کوئی ہے؟"

ایک عورت نے دروازے سے منہ نکال کر باہر جھانکا اور پیشتر اس کے کہ رندھیر اس سے کوئی بات کرتا وہ اُلٹے پاؤں واپس چلی گئی۔ عورت کے جاتے ہی ایک نوجوان نمودار ہوا اور گھوڑے کے قد و قامت سے اس سوار کی اہمیت کا اندازہ لگا کر جھونپڑی سے باہر نکل آیا۔

رندھیر نے سوال کیا "یہاں کوئی سپیرا رہتا ہے؟"

"جی مہاراج! اس کی جھونپڑی اس طرف بڑ کے درخت کے سامنے ہے۔"

لیکن آج وہ یہاں نہیں۔ اگر آپ بارش میں آرام کرنا چاہیں تو ہماری جھونپڑی حاضر ہے۔ لیکن ہم اچھوت ہیں۔ شاید آپ!

رندھیر نے کہا "مجھے تمہاری جھونپڑی سے نفرت نہیں۔ لیکن میں آج ہی سپیرے

کو تلاش کرنا چاہتا ہوں وہ کہاں گیا ہے؟"

نوجوان نے جواب دیا "وہاں تو آپ آج نہیں پہنچ سکتے اسے آج صبح چند آدمی کسی کے علاج کے لیے دریا کے پار لے گئے ہیں۔"

"لیکن یہ بہت ضروری ہے وہ بستی کتنی دور ہے؟"

"بستی تو دور نہیں۔ وہ دریا کے پار نظر آتی ہے لیکن ایسی بارش میں پتہ نہیں کس وقت پانی چڑھ جائے۔ آج کوئی دریا میں کشتی ڈالنے کی ہمت نہیں کرے گا۔"

رندھیر قدرے مایوس ہو کر گھوڑے سے اُترا اور نوجوان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا "دیکھو! یہ کسی کی زندگی کا سوال ہے۔ میں تمہاری مدد چاہتا ہوں مجھے کسی طرح دریا کے پار پہنچا دو۔"

نوجوان مذبذب سا ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

رندھیر نے اپنے ہاتھ کی انگلی سے سونے کی انگوٹھی اتاری اور کہا "یہ لو اس وقت میرے پاس اور کچھ نہیں۔"

شودر کے بیٹے اس کے کندھے پر اونچی ذات کے ایک باوقار نوجوان کی شفقت کا ہاتھ اس انگوٹھی سے کہیں زیادہ قیمتی تھا۔ اس نے کہا "مجھے اس کی ضرورت نہیں۔ میری کشتی حاضر ہے لیکن مجھے ڈر ہے کہ اگر طغیانی آ گئی تو ہمیں اپنے بازوؤں پر بھروسہ کرنا پڑے گا۔"

رندھیر نے پُرامید ہو کر جواب دیا "میں طغیانی میں بھی دریا کو عبور کر سکتا ہوں صرف اس سپیرے کو لانے کے لیے کشتی لے جانا ضروری سمجھتا ہوں۔"

نوجوان نے کہا "وہ پانی سے کچھ ڈرتا ہے لیکن شاید آپ سے انکار نہ کرے خیر دیکھا جائے گا ہم اسے زبردستی بھی لا سکتے ہیں۔ چلیئے! میں آپ کا گھوڑا گھر میں باندھ دیتا ہوں۔ دریا یہاں سے بہت قریب ہے۔"

(۲)

نوجوان گھوڑے کو جھونپڑی کے اندر چھوڑ کر رندھیر کے ساتھ ہو لیا۔ دونوں بھاگتے ہوئے دریا کے کنارے پہنچے۔ ماہی گیروں کی چار چھوٹی چھوٹی کشتیاں جن کے رسے کنارے پر لکڑی کی میخوں کے ساتھ بندھے ہوئے تھے، پانی کی لہروں پر ہچکولے کھا رہی تھیں۔ نوجوان ماہی گیر نے کشتی میں پڑا ہوا ایک مٹی کا ٹھیکرا اٹھایا اور کشتی کا پانی نکالنے لگا۔ رندھیر نے دوسری کشتی سے اسی قسم کا ایک ٹھیکرا اُٹھایا اور ماہی گیر کے ساتھ کام میں شریک ہو گیا۔ دونوں کو کشتی سے چند گھڑے پانی نکال کر دریا میں پھینکتے دیر نہ لگی۔

ماہی گیر نے رسہ کھولا اور بانس اٹھا کر کشتی کھینے لگا۔ رندھیر نے کہا "پانی ابھی چڑھا تو نہیں؟"

"نہیں! ابھی طغیانی نہیں آئی۔ پھر بھی پانی کافی تیز ہے۔"

ملاح کو منجدھار میں پہنچ کر چند مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن وہ ہر لہر سے بچنے اور ہر بھنور سے نکلنے کے بعد یہی کہتا "سرکار! یہ تو کچھ بھی نہیں میں نے بڑے بڑے طوفانوں کا مقابلہ کیا ہے اب وہاں ہمیں دیر نہ لگے تو اچھا ہو گا۔ پانی آہستہ آہستہ چڑھ رہا ہے۔"

دوسرے کنارے پر پہنچ کر ماہی گیر نے کشتی کا رسّا ایک پتھر کے ساتھ باندھ دیا اور دونوں بھاگتے ہوئے کنارے سے کوئی دو سو قدم دور ایک بستی میں داخل ہوئے۔ ماہی گیر نے ایک جھونپڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہ گاؤں کے چودھری کا گھر ہے۔ چلیئے! آپ یہاں بیٹھیں۔ میں سپیرے کا پتہ کرتا ہوں۔"

رندھیر نے جواب دیا "نہیں، تم پہلے یہ معلوم کرو کہ وہ کس گھر میں ہے۔ میں

تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔"

ماہی گیر جھونپڑی کے اندر داخل ہوا اور تھوڑی دیر بعد ایک عمر رسیدہ آدمی کو ساتھ لیے باہر نکلا۔ یہ گاؤں کا چودھری تھا۔ اس نے رندھیر کو دیکھتے ہی دُور سے ہاتھ باندھ کر پرنام کیا۔ "مہاراج! آپ یہاں اور ایسے موسم میں! چلیئے آپ اندر بیٹھیں میں سپیرے کو بلاتا ہوں۔"

"نہیں، میں تمہارے ساتھ چلوں گا۔ مجھے پہلے ہی بہت دیر ہو چکی ہے۔"

"بہت اچھا سرکار۔ جو آپ کی آگیا۔ چلیئے!"

رندھیر نے چلتے چلتے پوچھا۔ "وہ جس مریض کے علاج کے لیے یہاں آیا تھا اس کی اب کیسی حالت ہے؟"

"سرکار، وہ تو بالکل ٹھیک ہے۔ آج پتہ نہیں کس چیز سے اس کے پاؤں پر چھالا پڑ گیا۔ وہ ماں باپ کا ایک ہی لڑکا ہے اس کی ماں نے چھالا دیکھتے ہی دُہائی مچا دی کہ میرے بچے کو سانپ کاٹ گیا ہے اور وہ لڑکا بھی عجیب بے وقوف ہے۔ ہم گئے تو بستر پر لیٹا ہوا کراہ رہا تھا۔ ہم جا کر سپیرے کو لے آئے تو وہ بھنگ پی کر ہم سب کو گالیاں دے رہا ہے۔ "تم سب بدمعاش ہو۔ تم نے مجھے بارش میں خراب کیا ہے۔"

رندھیر نے کہا "میں نے سنا ہے کہ وہ ہر قسم کے سانپ کا علاج کر لیتا ہے۔"

"سرکار! اس میں شک نہیں وہ پاگل جیسا ہے لیکن ہم نے یہی دیکھا ہے کہ وہ سانپ کے ڈسے ہوئے کے پاس وقت پر پہنچ جائے۔ تو پھر اسے مرنے نہیں دیتا۔"

---

(۳۳)

بہ تینوں باتیں کرتے ہوئے ایک جھونپڑی میں داخل ہوئے۔ سپیرا گاؤں کے چند آدمیوں کے درمیان بیٹھا بھوتوں، چڑیلوں اور سانپوں کی داستانیں سُنا رہا تھا اس کا ایک چیلا اسے بھنگ کا ایک کونڈا پلا چکا تھا اور دوسرا رگڑ کر تیار کر رہا تھا۔

چودھری نے سپیرے کے قریب جا کر آہستہ سے اس کے کان میں کچھ کہا اور اس نے سر ہلاتے ہوئے اونچی آواز میں جواب دیا "نہیں! —— کبھی نہیں!! —— ہرگز نہیں!!! —— اس وقت راجہ بھی چل کر آئے تو بھی نہیں جاؤں گا۔"

چودھری نے کھسیانا سا ہو کر باقی لوگوں کی طرف دیکھا اور کہا "تم جانتے ہو، یہ کون ہیں؟ یہ بیاس کے پار اونچی ذات والوں کے شہر کے رہنے والے ہیں۔ اور اس ملک میں اس شہر کا سردار ہی ایک ایسا آدمی ہے جو ہماری قوم سے نفرت نہیں کرتا۔ جب اسے معلوم ہو گا کہ شہر سے اونچی ذات کا ایک آدمی ایسی حالت میں دریا عبور کر کے ہماری قوم کے ایک سپیرے کو بلانے کے لیے آیا اور اس نے کورا جواب دیا تو اسے یقیناً دکھ ہو گا۔"

لوگ یہ سن کر ایک دوسرے سے کانا پھوسی کرنے لگے اور چودھری سپیرے سے مخاطب ہوا "کالو! جانتے ہو یہ لوگ تمہیں بیڑیاں پہنا کر بھی لے جا سکتے ہیں۔"

رندھیر نے چودھری کی گفتگو کو ذرا زیادہ مؤثر بنانے کی نیت سے کہا "شہر کے سردار میرے پتا ہیں۔ تاہم میں انہیں مجبور نہیں کر سکتا۔ بے شک انہیں بارش میں تکلیف ہو گی لیکن جس کی جان بچانے کے لیے میں انہیں لے جانا چاہتا ہوں آپ کی قوم کی ایک لڑکی ہے۔ اس نے میرے پیروں میں سانپ دیکھ کر میری جان بچانا چاہی اور سانپ نے اسے ڈس لیا۔"

سردار کے بیٹے کے سامنے لوگ ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو گئے اور چودھری نے کہا "مہاراج! آپ کے لیے ہم سب کی جانیں حاضر ہیں" اور پھر سپیرے سے مخاطب ہوا "کالو! اُٹھتے ہو یا ہم زبردستی اُٹھائیں؟"

کالو کے دماغ سے بھنگ کے اثرات ابھی زائل نہ ہوئے تھے تاہم لوگوں کے تیور دیکھ کر اس کی جرأت خوف میں تبدیل ہو رہی تھی۔ اس نے گھگھیا کر کہا "دیکھو! مجھے بارش میں باہر نہ نکالو۔ میں مر جاؤں گا۔ دریا میں کشتی الٹ جائے گی اور مجھے..... مجھے مگرمچھ کھا جائیں گے۔ تم نے مگرمچھ نہیں دیکھے، میں نے دیکھے ہیں یہ دریا مگرمچھوں سے پٹا پڑا ہے۔" سپیرے کو بھنگ کے نشے میں جھونپڑی میں تمام آدمی مگرمچھ نظر آنے لگے۔ وہ چلایا۔ "دیکھو یہ مگرمچھ! مگرمچھ!!" اور اٹھ کر جھونپڑی کے ایک کونے میں کھڑا ہو گیا۔

چودھری نے کہا اس نے آج بھنگ بہت زیادہ پی ہے لیکن ہم اس کا نشہ اترنے کا انتظار نہیں کر سکتے۔ بارش میں اس کا دماغ جلد ٹھیک ہو جائے گا۔ چھجو تم اس کا تھیلا اُٹھا لو۔"

ایک شخص نے سپیرے کا تھیلا اٹھا لیا اور چودھری اور چار نوجوان اسے زبردستی پکڑ کر باہر لے آئے۔ سپیرے نے کچھ دیر ہاتھ پاؤں مارے۔ گالیاں دیں لیکن نوجوانوں کی آہنی گرفت اور موسلا دھار بارش نے جلد ہی اس کا دماغ ٹھنڈا کر دیا اور اس نے کہا "اچھا! مجھے چھوڑ دو۔ میں چلتا ہوں۔"

کنارے پر پہنچ کر رندھیر کو معلوم ہوا کہ دریا کے تیور بدلے ہوئے ہیں۔ وہ پتھر جس کے ساتھ کشتی کا رسا باندھا گیا تھا پانی میں ڈوب چکا تھا۔ نوجوان ملاح کے چہرے پر پریشانی کے آثار دیکھ کر رندھیر نے چودھری کی طرف دیکھا اس نے کہا "مہاراج! خطرہ تو ہے لیکن میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں آپ تیرنا جانتے ہیں نا؟"

رندھیر نے جواب دیا "تم میری فکر نہ کرو۔ میں پانی سے نہیں ڈرتا اور اس لڑکی کی جان بچانے کے لیے میں ہر خطرہ مول لینے کے لیے تیار ہوں۔"

سپیرا یہ سن کر شور مچانے لگا "مجھے تیرنا نہیں آتا میں ڈوب جاؤں گا۔ مجھ پر رحم کرو۔" لیکن لوگوں نے اسے زبردستی کشتی میں ڈال دیا۔

اس کشتی میں صرف ایک بانس تھا چودھری نے ایک شخص سے دوسرا بانس لانے کے لیے کہا وہ بھاگ کر نزدیک ہی ایک کشتی سے دوسرا بانس لے آیا۔ رندھیر سپیرے کے قریب بیٹھ گیا اور چودھری اور نوجوان ماہی گیر کشتی کھینے لگے۔

جس وقت یہ دونوں ملاح دھارے کی خطرناک موجوں کا مقابلہ کر رہے تھے سپیرے نے رازدارانہ لہجے میں رندھیر سے پوچھا "سچ کہو تمہیں تیرنا آتا ہے؟"

رندھیر نے جواب دیا "آتا ہے۔"

سپیرے نے ٹھنڈی سانس لی اور کہا "پھر یہ بدمعاش ضرور کشتی ڈبو دیں گے۔"

"وہ کیوں؟"

"بس انہیں مجھ سے بیر ہے۔ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر میں ڈوب جاؤں گا تو انہیں کون پوچھے گا۔ اگر آپ تیرنا نہ جانتے تو انہیں آپ کی حفاظت کا خیال ہوتا لیکن اب انہیں اطمینان ہے کہ آپ تیر کر بچ جائیں گے اور یہ بدمعاش کشتی اس طرح چلا رہے ہیں جیسے یہ دریا نہیں کوئی جوہڑ ہے۔"

رندھیر نے سپیرے کو تسلی دینے کی نیت سے کہا "تیرنا مجھے بھی نہیں آتا میں صرف مذاق کر رہا تھا۔"

"تو پھر ان سے کہو نا کشتی ہوشیاری سے چلائیں۔"

"انہیں ہم سے زیادہ فکر ہے۔"

"خاک فکر ہے۔ ان لوگوں کا آپ کو اس وقت پتہ لگے گا، جب کشتی

الٹ جائے گی۔ وہ لہر آرہی ہے، وہ بھنور آگیا اور وہ دیکھو کیا آرہا ہے۔ ارے
مگرمچھ! وہ ایک بہتی ہوئی لکڑی دیکھ کر چلانے لگا۔

چودھری کے تجربے اور نوجوان ماہی گیر کی ہمت نے کشتی کو صحیح سلامت
دوسرے کنارے پر پہنچا دیا اور یہ چاروں بھاگتے ہوئے بستی میں داخل ہوئے
نوجوان جھونپڑی سے گھوڑا لے آیا۔ سپیرے نے کہا" اب تو شام ہونے
والی ہے۔ ہم شہر کیسے پہنچیں گے؟"

رندھیر نے کہا" آپ گھوڑے پر میرے پیچھے بیٹھ جائیں ہم ابھی پہنچ جائیں گے۔"

"باپ رے باپ! میرا باپ، میرا دادا، میرے دادے کا دادا بھی گھوڑے
پر سوار نہیں ہوا۔ اور یہ گھوڑا نہیں یہ تو کوئی جن ہے۔ میرا تو اس کی شکل دیکھ کر
دم نکل رہا ہے۔"

چودھری نے رندھیر سے کہا" آپ گھوڑے پر چڑھ کر یہ تھیلا پکڑ لیں۔
ہم اسے آپ کے پیچھے لاد دیتے ہیں۔"

رندھیر نے جلدی سے گھوڑے پر بیٹھ کر تھیلا پکڑ لیا اور چودھری اور
اس کے ساتھی نے چیختے چلاتے سپیرے کو اٹھا کر اس کے پیچھے لاد دیا۔

رندھیر نے رخصت ہونے سے پہلے ان دونوں کی طرف دیکھا اور کہا
"میں تمہارے نام پوچھ سکتا ہوں۔"

نوجوان ملاح نے جواب دیا" میرا نام نتھو ہے۔" اور چودھری بولا" میرا
نام دھرمو ہے۔" ہمیں افسوس ہے کہ آپ بارش میں آئے اور بارش میں جا رہے
ہیں۔ ہم آپ کی کوئی سیوا نہ کر سکے۔"

"آپ نے میرے لیے بہت کچھ کیا ہے۔ اب بھگوان سے التجا کریں
اس کی جان بچ جائے۔ میں آپ سے پھر کبھی ملوں گا۔"

رندھیر نے گھوڑے کی باگ ذرا ڈھیلی کی اور سپیرا خوف زدہ ہو کر اس
کی کمر کے ساتھ لپٹ گیا۔ دھرمو نے چند قدم گھوڑے کے ساتھ بھاگتے ہوئے
کہا" کالو! ہم سے ناراض نہ ہونا۔ تم ایک اچھے کام کے لیے جا رہے ہو۔ اگر تم
اس لڑکی کی جان نہ بچا سکے تو ہم سب کی بدنامی ہوگی۔"

گاؤں سے باہر نکل کر رندھیر نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور وہ ہوا سے باتیں
کرنے لگا۔ سپیرا چلا رہا تھا" آہستہ! ذرا آہستہ!! تمہیں اپنے بھگوان کی قسم!
اپنے دیوتاؤں کی قسم!!"

نصف راستہ طے کرنے کے بعد رندھیر کو رات کی تاریکی نے آلیا۔ اور اس
نے گھوڑے کی رفتار آہستہ کر دی۔ بارش کا زور قدرے کم ہو چکا تھا لیکن تاریکی
میں ایک قدم آگے دیکھنا دشوار تھا اور آخری دو کوس کے ٹیلے اور پہاڑیاں ایک
دوسرے سے بہت مشابہ تھے اس لیے رندھیر نے صحیح راستہ تلاش کرنے
کی ذمہ داری گھوڑے کی فراست پر چھوڑ دی۔

جب گھوڑا راستے کے آخری ٹیلے پر چڑھنے لگا۔ رندھیر کا دل دھڑکنے
لگا اور وہ انتہائی عجز و انکسار کے ساتھ شانتا کے لیے دعائیں مانگنے لگا۔
جھونپڑی کے قریب پہنچ کر جب اسے کوئی آواز سنائی نہ دی تو اسے کچھ تسلی ہوئی
بدھو اور مادھو گھوڑے کی آہٹ پا کر جھونپڑی سے باہر نکلے۔ مادھو نے
آواز دی۔ کون رندھیر؟"

اس نے بے قراری سے پوچھا" شانتا کیسی ہے؟"

"اسے ہوش نہیں۔" مادھو نے آگے بڑھ کر رندھیر کے گھوڑے کی لگام
پکڑ لی۔ اور پوچھا" سپیرا نہیں آیا؟"

"یہ میرے پیچھے ہے اسے اتار دو!"

بدھو نے آگے بڑھ کر سپیرے کو اُترنے کے لیے سہارا دیا۔ رندھیر نے تھیلا مادھو کو تھما دیا اور نیچے اتر کر کہا: "اسے کہاں باندھوں؟"

بدھو نے گھوڑے کی لگام اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا: "میں اسے چھپر کے نیچے باندھ آتا ہوں۔ مادھو! تم انہیں اندر لے چلو!"

---

(۴)

چراغ کی دُھندلی روشنی میں رندھیر کو شانتا ایک چارپائی پر بے ہوش لیٹی ہوئی دکھائی دی۔ کنول اس کے سرہانے بیٹھی ہوئی تھی۔

سپیرے نے پوچھا: "کہاں کاٹا سانپ نے؟"

کنول، مادھو اور بدھو اس سوال کا جواب دینا چاہتے تھے لیکن سب سے پہلے رندھیر نے اس کے ٹخنے پر انگلی رکھتے ہوئے کہا: "یہاں۔ آبلہ میں نے کاٹ ڈالا تھا۔"

"بہت اچھا کیا تم نے۔ لڑکی بچ جائے گی۔ مجھے سانپ بھی زیادہ زہریلا معلوم نہیں ہوتا۔"

سپیرے نے یہ کہتے ہوئے زخم پر منہ رکھ دیا اور اسے چوس چوس کر تھوکنے لگا۔ سوزش کے علاوہ شانتا کی پنڈلی زخم کے نزدیک سیاہ اور باقی سُرخ ہو چکی تھی جب تک زخم سے سرخ خون نہ نکلا سپیرا اُسے چوستا رہا۔ اس کے بعد اس نے اپنے تھیلے سے لکڑی کی ایک ڈبیا نکال کر کھولی اور اس میں سے سیاہ رنگ کا سفوف زخم پر چھڑک دیا۔ شانتا نے سفوف کی جلن سے کراہتے ہوئے آنکھیں کھولیں اور بستر پر ہاتھ پاؤں مارنے لگی۔

سپیرے نے کہا: "اسے تھوڑی دیر کے لیے پکڑ لو۔"

بدھو نے اس کی ٹانگیں اور مادھو اور رندھیر نے اس کے بازو پکڑ لیے شانتا نے ان کے ہاتھوں کی گرفت میں بے بس سی ہو کر اِدھر اُدھر دیکھا اور اس کی نگاہیں رندھیر کے چہرے پر مرکوز ہو کر رہ گئیں۔ سپیرے نے کنول کی طرف دیکھ کر کہا "تمہارے گھر میں گھی ہے تو جلدی سے گرم کر لاؤ!"

کنول نے اٹھ کر ایک کوزے سے مٹی کی پیالی میں گھی نکالا اور جھونپڑی کے ایک کونے میں چولھے کے سامنے جا بیٹھی۔ چولھے میں موٹی لکڑی کا ایک سرا سلگ رہا تھا۔ کنول نے اس کے ساتھ دو لکڑیاں رکھ کر پھونکیں ماریں اور پیالی بھڑکتی ہوئی آگ پر رکھ دی۔

سپیرے نے تھیلے سے دوسری ڈبیہ نکالی اور اس میں سے ایک اور سفوف نکال کر اپنی ہتھیلی پر ڈالتے ہوئے کنول کو آواز دی "بس لے آؤ اسے زیادہ گرم کرنے کی ضرورت نہیں۔" کنول گھی لے آئی اور اس نے کہا "اٹھو بیٹی! یہ دوائی کھا کر گھی پی لو۔ بس کل تم ٹھیک ہو جاؤ گی۔"

مادھو نے ہاتھ کا سہارا دے کر شانتا کو بٹھا دیا۔

شانتا نے کہا "میں دوا کھا لیتی ہوں۔ گھی نہ پیوں گی۔ مجھے متلی ہو جائے گی۔"

بدھو نے کہا "بیٹی! تمہیں پینا پڑے گا۔"

کنول بولی "شانتا بے وقوف نہ بنو۔"

شانتا نے مایوس سی ہو کر رندھیر کی طرف دیکھا اور اس نے صرف اتنا کہا:

"پی لو شانتا!" ان الفاظ میں ایک التجا تھی جسے وہ ٹھکرا نہ سکی۔ ایک حکم تھا جس سے انحراف اس کے لیے ممکن نہ تھا۔ رندھیر کی خواہش پر وہ زہر کا پیالہ بھی حلق سے اتار سکتی تھی۔ شانتا نے مسکراتے ہوئے اپنا منہ کھول دیا۔ سپیرے نے دوائی منہ

میں ڈالی اور کنول نے اپنے ہاتھ سے اسے گھی پلانا چاہا لیکن اس نے پیالی اپنے ہاتھ میں پکڑلی اور گھی پی کر فاتحانہ انداز میں رندھیر کی طرف دیکھنے لگی۔ رندھیر خوشی سے مسکرا رہا تھا۔

سپیرا زمین پر بیٹھ گیا اور آنکھیں بند کر کے کوئی منتر پڑھنے لگا۔

شانتا کی بدلی ہوئی حالت دیکھ کر رندھیر اس کے منتر سے زیادہ اس کی دوا کے اثر کا قائل ہو رہا تھا۔ تھکے ہوئے سپیرے نے جلد ہی اپنا منتر ختم کر دیا۔

شانتا کی حالت سے مطمئن ہو کر رندھیر کو اب بھوک اور تھکاوٹ محسوس ہونے لگی۔ بدھوا ایک ذہنی کشمکش میں مبتلا تھا۔ گھر میں روٹی، دودھ اور مکھن کے علاوہ تازہ مچھلی کافی مقدار میں موجود تھی لیکن اسے رندھیر کو کھانے کی دعوت دینے کی جرأت نہ ہوئی اور اس کی موجودگی میں سپیرے سے پوچھنا بھی مناسب خیال نہ کیا۔ چھوت چھات کے علاوہ اس کا یہ بھی خیال تھا کہ رندھیر سونے اور چاندی کے برتنوں میں کھانا کھانے کا عادی ہوگا۔ اگر بفرضِ محال وہ اس کی دعوت قبول کر بھی لے تو بھی مٹی کے پیالوں کو ہاتھ لگانا اس کی توہین ہوگی۔ لیکن سکھدیو بھی کوئی معمولی آدمی نہ تھا اسے مٹی کے برتنوں سے نفرت نہ تھی۔ یہ بھی شاید بالکل سکھدیو جیسا ہے۔ شاید اسے بھی مٹی کے برتنوں سے نفرت نہ ہو۔ آخر پوچھ لینے میں کیا ہرج ہے اس خیال سے بدھو کو کچھ تسلی ہوئی اور رندھیر سے مخاطب ہونے کے لیے موزوں الفاظ سوچنے لگا لیکن پھر اسے خیال آیا کہ سکھدیو، کنول کی وجہ سے مٹی کے برتنوں میں کھانے اور جھونپڑیوں میں رہنے کے لیے مجبور تھا اور اسے کوئی مجبوری نہیں مگر شانتا؟ کیا یہ ممکن ہو سکتا ہے کہ رندھیر اور شانتا ایک دوسرے کے لیے کنول اور سکھدیو بن چکے ہوں۔ اس نے یکے بعد دیگرے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ان کی خاموش نگاہیں گرد و پیش سے بے خبر ایک دوسرے کو کوئی پیام دے رہی تھیں۔ وہ پیام جو روزِ ازل سے ہر ذی روح انسان اپنی جنسِ مقابل

کو دیتا چلا آیا ہے۔ بدھو نے اپنے دل میں کہا "یہ جوڑا بُرا نہیں لیکن اس کا انجام؟ کیا رندھیر شانتا کے لیے اتنی بڑی قربانی کرنے کے لیے تیار ہوگا!!"

رندھیر نے کہا "میں اب گھر جاتا ہوں۔ پتا بہت پریشان ہوں گے۔ میں صبح پھر آؤں گا۔"

بدھو کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ رندھیر نے اپنی انگلی سے سونے کی انگوٹھی اتاری۔ اور سپیرے کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "آپ نے آج بہت دیا کی۔ میرے پاس اس وقت اور کوئی شے نہیں۔ میں صبح پھر آؤں گا۔ جب تک شانتا اچھی نہ ہو آپ یہاں سے نہ جائیں۔"

سپیرے نے سونے کی انگوٹھی کو بھوکی نگاہوں سے دیکھا اور ہاتھ بڑھانے کا ارادہ کر رہا تھا کہ کنول بول اٹھی "نہیں! نہیں!! یہ نہیں ہوگا۔ آپ اپنی انگوٹھی اپنے پاس رکھیں۔ آپ نے ہم پر بہت دَیا کی ہے" کنول نے اٹھ کر ایک پٹاری کھولی اور ایک انگوٹھی نکال کر سپیرے کو پیش کرتے ہوئے کہنے لگی:

"آپ کے احسان کا بدلہ ہم لوگ نہیں دے سکتے لیکن میرے پاس اس سے زیادہ قیمتی چیز اور کوئی نہیں۔ یہ شانتا کے باپ کی آخری نشانی ہے۔"

سپیرے نے پوچھا "وہ مر چکا ہے؟"

"ہاں!" کنول کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

سپیرے نے کہا "بیوہ کا دھن ہم پر حرام ہے تم اسے اپنے پاس رکھو۔"

رندھیر نے سپیرے کا ہاتھ پکڑ کر اس پر اپنی انگوٹھی رکھ دی اور اس نے چپکے سے سفوف والی ڈبیا میں رکھ کر اپنے تھیلے میں ڈال لی۔

کنول نے کہا "بیٹا! تم یہ پہن لو ورنہ مجھے دکھ ہوگا۔"

رندھیر نے جواب دیا۔ "نہیں ماتا! اسے اپنے پاس رکھیں۔" لیکن بدھو اور ماھو

کے اصرار پر رندھیر نے مجبوراً کنول کے ہاتھ سے انگوٹھی لے لی۔ انگوٹھی کو غور سے دیکھنے پر اسے چند حروف نظر آئے اور انہیں دیپے کی روشنی کے قریب جا کر پڑھنے کے بعد حیرانی اور مسرت کے ملے جلے جذبات کے ساتھ شانتا، مادھو اور کنول کی طرف دیکھنے لگا۔ انگوٹھی پر سکھدیو کا نام کندہ تھا۔ وہ تلوار پر اپنے باپ کا نام پہلے ہی دیکھ چکا تھا۔ وہ اس انکشاف پر اپنی مسرت کو چھپا نہ سکا۔ اس نے پوچھا۔

"مادھو! تمہارے باپ کا نام سکھدیو تھا؟"

"ہاں" مادھو نے جواب دیا۔

رندھیر جوشِ مسرت میں مادھو کے ساتھ لپٹ گیا۔

مادھو کو چھوڑ کر رندھیر شانتا کی طرف متوجہ ہوا "شانتا! میں تمہیں کچھ دینا چاہتا ہوں لیکن انکار نہ کرنا۔" یہ کہہ کر اس نے شانتا کا ہاتھ پکڑ کر اسے انگوٹھی پہنا دی اور کہا "شانتا! تمہارے باپ کی نشانی تمہارے پاس رہنی چاہیئے۔"

پھر وہ کنول کی طرف متوجہ ہوا۔ "ماتا! میں رام داس کا بیٹا ہوں۔ شاید آپ اسے جانتی ہوں۔"

کنول کو جیسے اپنا بچھڑا ہوا بیٹا مل گیا ہو۔ اس نے پیار سے رندھیر کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا:

"بیٹا تم وہی ہو دوسروں کے دکھ درد کے ساتھی — رام داس نے ہمیں قید سے نکالا تھا اور تم نے میری بیٹی کی جان بچائی۔ جیتے رہو بیٹا!"

سب سے آخر میں وہ بدھو کی طرف متوجہ ہوا۔ "اچھا اب میں جاتا ہوں صبح ضرور آؤں گا۔"

بدھو نے کہا "چلیئے! آپ کا گھوڑا چھپر کے نیچے بندھا ہوا ہے۔"

رندھیر اور بدھو باہر نکلے تو شانتا نے پھر آنکھیں بند کر لیں لیکن اس دفعہ

آنکھیں بند کرنے کا باعث سانپ کا زہر نہ تھا بلکہ اس کے دماغ پر ایک سرور کی کیفیت طاری ہو رہی تھی۔ وہ کنول اور سپیرے سے آنکھ بچا کر انگوٹھی والے ہاتھ کو کئی بار سینے، ہونٹوں اور آنکھوں تک لے گئی۔

بارش تھم چکی تھی اور آسمان پر کہیں کہیں بادل کی پھٹی ہوئی چادر میں سے ستارے جھانک رہے تھے۔ جھونپڑی سے باہر چند قدم اٹھانے کے بعد بدھو اچانک ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔ رندھیر نے پوچھا "کیا ہے؟"

بدھو نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا "وہ دیکھو، شاید کوئی آدمی جا رہا ہے؟"

رندھیر کو ایک سایہ درختوں کی آڑ میں غائب ہوتا دکھائی دیا۔ اس نے آواز دی "کون ہے ٹھہرو!"

رندھیر کی آواز پر کسی کے بھاگنے کی آہٹ سنائی دی۔

بدھو نے کہا "معلوم ہوتا ہے کہ کوئی آپ کا گھوڑا چرانے کے ارادے سے آیا تھا۔"

رندھیر آج دنیا کے تمام خزانے لٹانے کے لیے تیار تھا اس نے جواب دیا "تو مجھے افسوس ہے کہ وہ خالی ہاتھ جا رہا ہے۔"

بدھو نے کہا "تم بالکل سکھدیو کی طرح ہو۔"

---

(۵)

بدھو سے رخصت ہو کر رندھیر سیدھا گھر جانے کی بجائے جھیل پر پہنچا اور گھوڑے کو درخت کے ساتھ باندھ کر کیچڑ سے لت پت کپڑوں سمیت پانی میں

کُود پڑا۔

جب وہ دوبارہ گھوڑے پر سوار ہُوا تو صبح کے آثار نمودار ہو رہے تھے۔ تھکا ہوا گھوڑا آہستہ آہستہ قدم اٹھا رہا تھا۔ رندھیر کے دل و دماغ پر ایک سُرور کی کیفیت طاری تھی۔ وہ گزشتہ دن اور رات کے تمام واقعات کے متعلق بار بار سوچنے کے بعد یہ محسوس کر رہا تھا، کہ شودروں کے متعلق جو رائے اس نے سماج کے اُونچے ایوانوں میں رہ کر قائم کی تھی کس قدر غلط تھی۔ وہ اپنے دل سے بار بار پوچھ رہا تھا کہ دھرمو اور نتھو جیسے انسانوں کو اچھوت کہنا پاپ نہیں؟ ہمارے شہر میں کتنے لوگ ہیں جو دوسروں کو مصیبت میں دیکھ کر ایسی مروّت اور ایثار سے پیش آتے ہیں۔ رندھیر کے دماغ میں شودر کا مفہوم انسانوں کا وہ گروہ تھا جن کے تنگ و تاریک جھونپڑے محبت کے چراغوں سے روشن تھے۔

رندھیر تصور میں ایک ایسی دنیا تعمیر کر رہا تھا جس میں تمام انسان ایک ہی درجہ رکھتے تھے۔ جس میں شودر اور برہمن ایک ہی صف میں کھڑے تھے جس کا قانون ہر انسان کو پھلنے اور پھولنے کی یکساں آزادی دیتا تھا جس کا مذہب تمام انسانوں کو نجات کی راہ دکھاتا تھا۔ جس کے مندروں کے دروازے ہر پجاری کے لیے کھلے تھے۔ اس نے آسمان کی طرف دیکھا اور انتہائی خلوص کے ساتھ یہ دُعا کی:

"بھگوان! تیری دنیا کو کسی ایسے انسان کی ضرورت ہے جو تیرے سادہ دل اور کمزور بندوں کو خود غرض انسانوں کے اقتدار سے نجات دلا سکے۔ یہ دنیا جس کی زینت کے لیے تُو نے چاند، سورج اور ستارے بنائے ہیں جس میں دریا بہتے ہیں ہوائیں چلتی، درخت لہلہاتے اور پھول کھلتے ہیں، کس قدر حسین ہے، لیکن کیا تُو یہ گوارا کر سکتا ہے کہ اس زمین پر جس کی وسعت کا اندازہ کسی کو نہیں۔ طاقت ور انسانوں کی ایک جماعت کمزور انسانوں کے لیے ایک دائمی عذاب بن کر ان کے لیے فلاح کے

تمام راستے بند کر دے۔

بھگوان تیرے باغ میں اب ایسی خاردار جھاڑیاں اُگ رہی ہیں جن کے نیچے ہزاروں نرم اور نازک پودے ہوا اور روشنی کے لیے ترس رہے ہیں۔ اب تیرے باغ کو ایک مالی کی ضرورت ہے جو ان جھاڑیوں کو کانٹ چھانٹ کر ان نرم و نازک پودوں کے برابر کر دے۔ ورنہ ان پودوں کی آبیاری کر کے ان جھاڑیوں کے برابر کر دے۔ بھگوان میں آج شودروں کے جھونپڑوں میں گیا ہوں اُن کو چھو چکا ہوں اور میں خوش ہوں کہ آج میرے دماغ میں تیرا صحیح تصور آیا ہے۔ میں اپنے دل میں ایک نئی روشنی پاتا ہوں۔ لیکن میرے پاس کوئی ایسی مشعل نہیں جس سے دوسروں کو تیرا صحیح راستہ دکھا سکوں۔ بھگوان! اس ملک میں کوئی مشعل والا بھیج دے۔"

دعا کے بعد رندھیر نے محسوس کیا کہ آنے والی صبح اس کے لیے ایک نئی زندگی کا پیام ہے۔ صبح صادق کی بڑھتی ہوئی روشنی میں سمٹنے والی تاریکی کی طرح مذہب اور انسانیت کے متعلق اس کے پرانے تصورات نئے خیالات کے لیے جگہ خالی کر رہے تھے۔ شہر کے قریب پہنچ کر اس نے محسوس کیا کہ اس کے دل میں سماج کے اونچے ایوانوں کا وہ پہلا سا احترام تھا نہ خوف۔

شہر میں داخل ہوتے ہی رندھیر کو سواروں کی ایک ٹولی ملی اور اسے معلوم ہُوا کہ سردار اور اس کا کوئی سپاہی رات بھر نہیں سویا۔ لوگ اسے دیکھتے ہی رندھیر آگیا! رندھیر آگیا!! کہتے ہوئے رام داس کے گھر کی طرف بھاگے۔ رندھیر کو پہلی دفعہ اپنے باپ کی پریشانی کا خیال آیا اور اس نے گھوڑا تیز کر دیا۔

رام داس اور ارجن مکان سے باہر ایک چبوترے پر بیٹھے اس کا انتظار کر رہے تھے۔ رندھیر نے جلدی سے اتر کر گھوڑا ایک سپاہی کے حوالے کیا اور بھاگ کر پہلے رام داس اور پھر ارجن کو پرنام کیا۔

"بیٹا! تم نے ہمیں بہت پریشان کیا۔ کہاں تھے تم!" رام داس نے یہ کہتے ہوئے رندھیر کو گلے لگا لیا۔ اس کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو چھلک رہے تھے۔

"پتا جی! میں...... میں شہر سے دُور چلا گیا تھا۔ بارش میں ایک جگہ ٹھہر گیا واپسی پر اندھیرے میں راستہ بھول گیا۔"

رام داس نے کہا "جاؤ! بیٹا لباس تبدیل کرو تمہیں بھوک بھی لگ رہی ہوگی۔"

دوپہر کے وقت رندھیر نے گہری نیند سے بیدار ہو کر آنکھیں کھولیں۔ موہنی اس کے سرہانے کھڑی مسکرا رہی تھی وہ انگڑائی لے کر اٹھا۔

موہنی بولی "میں تیسری دفعہ آئی ہوں اور اب تمہیں بڑی مشکل سے جگایا ہے کہاں تھے ساری رات! میرے پتا جی تمہارے پتا جی کے ساتھ تمہیں ساری رات تلاش کرتے رہے اور ماتا جی بھی ساری رات روتی رہیں۔"

رندھیر نے کہا "موہنی! تم سے جھوٹ نہیں بول سکتا۔ میں جھیل پر گیا تھا۔"

"ساری رات...... ؟"

"نہیں۔ شانتا کو سانپ نے کاٹ لیا تھا۔"

"سانپ نے ؟"

"ہاں!"

"اُف بے چاری اب کیسی ہے ؟"

اب شاید بچ جائے۔ میں یہاں سے آٹھ نو کوس کے فاصلے پر دریا پار سے ایک سپیرے کو لینے چلا گیا تھا۔

"ایسے طوفان میں دریا کے پار کیسے پہنچے ؟"

رندھیر نے اس سوال کے جواب میں اپنے سفر کے تمام واقعات سنانے کے بعد موہنی سے پوچھا۔ "موہنی! شانتا کو دیکھنے چلو گی ؟"

"کب ؟"

"ابھی، تم چلو میں ابھی آتا ہوں۔ اوّل تو اس وقت راستے میں کوئی ملے گا نہیں اور اگر کوئی ملا تو کہہ دینا کہ مندر کی طرف جا رہی ہوں۔"

---

(۶)

شنکر گزشتہ آٹھ پہر سے یہ محسوس کر رہا تھا کہ شہر کا پروہت، سردار اور اس کے سپاہی سب کے سب بے خبری کی نیند سو رہے ہیں اور بھگوان نے سماج کی رکشا کے تمام فرائض اسی کو سونپ دیے ہیں۔ گزشتہ آٹھ پہر سے وہ بھوک، پیاس اور تھکاوٹ کا احساس کیے بغیر مندر، شہر اور جھیل کے کنارے اچھوتوں کی ایک جھونپڑی کا درمیانی فاصلہ کئی بار طے کر چکا تھا۔ دوپہر کے وقت جب رندھیر اس سے گھوڑا چھین کر سوار ہوا تو اس کا رخ شہر کی طرف نہ تھا۔ چنانچہ وہ الٹے پاؤں جھیل کے کنارے جھونپڑی کی طرف بھاگا۔ رندھیر وہاں نہ تھا۔ اسے یہ علم نہ تھا کہ شانتا کو سانپ ڈس چکا ہے۔ اس نے اب تک جو کچھ دیکھا تھا۔ کافی دور سے دیکھا تھا کچھ دیر وہ جھونپڑی کے پاس درختوں کے نیچے کھڑا سوچتا رہا۔ جب بارش شروع ہو گئی تو وہ مندر کی طرف بھاگا۔ مندر میں زیادہ دیر اس کی بے قرار طبیعت کو چین نہ آیا رندھیر کہاں گیا؟ رندھیر کہاں گیا؟ یہ سوال اسے سخت پریشان کر رہا تھا۔ وہ تھوڑی دیر مندر میں سستانے کے بعد بھاگتا ہوا شہر پہنچا۔ رندھیر وہاں بھی نہ تھا۔ وہ رام داس کے سامنے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتا تھا لیکن اس کی بارعب شکل دیکھ کر زبان ہلانے کی جرأت نہ ہوئی اسے امید نہ تھی کہ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھے بغیر رندھیر کے متعلق ایسی باتوں پر یقین کر لے گا۔ وہ دیر تک شہر میں رندھیر کا انتظار کرتا رہا۔

ایک پہر رات گئے جب رندھیر کی تلاش شروع ہوئی تو وہ کنول کی جھونپڑی کی طرف بھاگا۔ اس کو پھر مایوسی ہوئی لیکن تھوڑی دیر جھونپڑی کے دروازے کے ساتھ لگ کر کنول، بدھوا اور مادھو کی باتیں سننے کے بعد معلوم ہوا کہ یہ لوگ رندھیر کا انتظار کر رہے ہیں۔ وہ رام داس کو اپنے ساتھ لانے کے لیے پھر شہر کی طرف بھاگا لیکن وہ سپاہیوں کو ساتھ لے کر رندھیر کی تلاش میں جا چکا تھا۔ تھوڑی دیر کے لیے اُسے تھکاوٹ محسوس ہوئی لیکن فرض شناسی نے اسے جلد ہی تازہ دم کر دیا۔ اس نے زیادہ دیر رام داس کا انتظار نہ کیا اور پھر جھونپڑی کی طرف بھاگا۔ اس نے جھونپڑی کے اندر رندھیر کی آواز دور سے پہچان لی۔ رندھیر کہہ رہا تھا اچھا اب میں جاتا ہوں۔ شنکر کے سینے میں جیسے کسی نے نشتر چبھو دیا ہو۔ لیکن اس کے ساتھ ہی جب اس نے یہ کہا کہ صبح ضرور آؤں گا۔ شنکر کو گویا ڈوبتے وقت تنکوں کا سہارا مل گیا وہ مطمئن ہو کر مندر پہنچا اور چارپائی پر لیٹتے ہی سو گیا۔

دوپہر کے وقت جب اس کی آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا کہ گوپال پانی کا گھڑا اس کے اوپر انڈیل رہا ہے اور پروہت لال لال آنکھیں نکال کر یہ کہہ رہا ہے کہ "اس بے وقوف کو اگر بھوک اور پیاس نہ لگے تو آٹھوں پہر سویا رہے۔ نہ پوجا نہ پاٹ گوپال! یہ کبھی نہاتا بھی ہے یا نہیں؟"

گوپال نے جواب دیا مہاراج! میں ہی کبھی کبھی اس طرح سوتے ہوئے پر پانی ڈال دیا کرتا ہوں۔"

"رات بھر کیا کرتا ہے یہ؟"

"کچھ نہیں مہاراج! یہ شام کو کھانا کھاتے ہی سو گیا تھا۔"

پروہت شنکر کو بُرا بھلا کہتا ہوا شہر کی طرف چل دیا اور شنکر گوپال کو چند گالیاں دینے کے بعد جھیل کی طرف بھاگا۔ وہ بار بار اپنے دل میں یہ کہہ رہا تھا "وہ

اب وہاں سے ہو کر واپس بھی چلا گیا ہو گا۔ میں کیوں سویا، مجھے نیند کیوں آئی؟"

جھونپڑی کے باہر کچھ دیر کھڑا رہنے کے بعد اس کے کانوں نے گواہی دی کہ رندھیر یہاں نہیں وہ انتہائی مایوسی کی حالت میں وہاں سے لوٹا لیکن زیادہ دُور نہیں گیا تھا کہ اس کا دل خوشی کے سمندر میں غوطے کھانے لگا۔ رندھیر اور موہنی آ رہے تھے وہ ایک درخت کے پیچھے چھپ گیا۔ رندھیر اور موہنی باتیں کرتے ہوئے گزر گئے۔ اس کی نگاہیں جھونپڑی تک ان کا تعاقب کرتی رہیں۔ رندھیر کے ساتھ موہنی کو بھی جھونپڑی میں داخل ہوتے دیکھ کر اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ وہ دبے پاؤں چلتا ہوا جھونپڑی کے قریب پہنچا۔ اندر سے موہنی کی آواز آئی۔

شانتا بہن! اب کیسی ہو؟ شنکر یہ سنتے ہی سر پہ پاؤں رکھ کر شہر کی طرف بھاگا۔ کاش دیوتا اسے تھوڑی دیر کے لیے اُڑنے کی طاقت عطا کر دیتے۔

شہر کے قریب اسے پروہت ملا اور چند باتیں سننے کے بعد وہ بھی اس کے ساتھ بھاگنے لگا۔

مادھو کی دیوی

کنول نے ایک مدت کے بعد موہنی کو دیکھا تھا اس لیے پہچان نہ سکی۔ بدھو نے اسے پہلی بار دیکھا تھا اس لیے مرعوب ہو کر رہ گیا۔ مادھو، موہنی کہہ کر اٹھا اور کچھ دیر بے حس و حرکت کھڑا اس کی طرف دیکھتا رہا۔ موہنی کا اس کی جھونپڑی میں آنا اس کی توقع سے کہیں زیادہ تھا جب موہنی، شانتا سے باتیں کرنے لگی تو مادھو کی بدحواسی مسرت میں تبدیل ہونے لگی۔ اس نے چارپائی گھسیٹ کر آگے کرتے ہوئے کہا: موہنی دیوی! بیٹھ جاؤ۔" موہنی مادھو کی درخواست سے زیادہ رندھیر کا اشارہ پا کر شانتا کی طرف منہ کر کے بیٹھ گئی۔

کنول نے رندھیر سے کہا "بیٹا! تم بھی بیٹھ جاؤ۔" رندھیر موہنی سے ذرا ایک طرف ہو کر بیٹھ گیا۔

کنول نے پوچھا: "بیٹا! یہ تمہاری بہن ہے؟"

اس نے جواب دیا "جی نہیں! یہ موہنی دیوی ہے۔ اس کا باپ ارجن ہے ایک دفعہ جب شنکر نے مادھو کو مارا تھا یہ میرے ساتھ تھی۔"

"ہاں! اب مجھے یاد آگیا۔ یہ اس وقت بہت چھوٹی تھی۔ اس نے مادھو کے سر پر اپنا دوپٹہ باندھ دیا تھا۔ بہت اچھی لڑکی ہے۔ کیسی ہو بیٹا؟"

موہنی نے جواب دیا "اچھی ہوں۔ شانتا اب تو ٹھیک معلوم ہوتی ہے۔"

سپیرا جو اب تک خاموش بیٹھا تھا بول اٹھا "ٹھیک کیوں نہ ہوتی میں نے

یہ بال دھوپ میں سفید نہیں کیے۔"

رندھیر نے کہا "آپ نے بہت دیا کی۔"

کنول بولی "اب یہ جانا چاہتے ہیں۔ میں نے بہت منت کی ہے کہ ایک دو دن ٹھہر جائیے!"

رندھیر نے سپیرے سے کہا "آپ ایک دو دن ٹھہر جائیں تو کیا ہرج ہے؟"

سپیرے نے جواب دیا "اب میرا یہاں کوئی کام نہیں۔ ادھر کرتی مجھے لینے آیا تو اسے بہت پریشانی ہوگی۔ آج بارش نہیں، ممکن ہے کہ کل بارش آجائے۔ پھر مجھے بہت تکلیف ہوگی۔"

رندھیر نے کہا "میں کل تمہیں گھوڑے پر چھوڑ آؤں گا۔"

اس نے جواب دیا "نہ سرکار! میرا جسم لوہے کا نہیں۔ بدھو نے مجھے گدھے پر چھوڑ آنے کا وعدہ کیا ہے۔ میں اس کے ساتھ آہستہ آہستہ چلا جاؤں گا۔"

رندھیر نے پوچھا "تو آپ آج ہی جانا چاہتے ہیں؟"

سپیرے نے جواب دیا "میرا آج ہی جانا اس لیے بھی ضروری ہے کہ وہاں سے لڑکی کے لیے ایک دوائی بھیجنی ہے۔ وہ دوائی اب میرے پاس نہیں ہے۔"

یہ اس کا ایک بہانہ تھا۔ دراصل وہ گاؤں میں پہنچ کر لوگوں کو سونے کی انگوٹھی دکھانے کے لیے بے قرار تھا۔

رندھیر نے کہا اگر وہ دوائی ضروری ہے تو میں آپ کے ساتھ گھوڑے پر جا کر جلدی لے آؤں؟"

سپیرے نے جواب دیا "نہیں! آپ کی ضرورت نہیں۔ کل تک بدھو آ جائے گا۔ اس وقت تک جو دوائی میں دے چلا ہوں، کافی ہے۔"

بدھو غور سے موہنی کو بار بار دیکھ کر یہ محسوس کر رہا تھا کہ مادھو نے ایک بہت

بڑا رازاُن سے ابھی تک چُھپا رکھا تھا۔ مادھو کی تراشی ہوئی مُورتیاں اس لڑکی سے مشابہ تھیں اور مادھو نے گزشتہ شام کنول سے یہ خبر سنتے ہی کہ شہر کا ایک خوش وضع نوجوان سپیرے کو بلانے کے لیے گیا ہے۔ انہیں جھونپڑی کے ایک کونے میں ایک چادر کے نیچے چُھپا دیا تھا۔

شانتا کو سپیرے نے چلنے پھرنے سے منع کر دیا تھا اس لیے وہ کپڑوں کی ایک گٹھڑی سے ٹیک لگا کر بیٹھی ہوئی تھی۔ رندھیر کی نگاہیں جھونپڑی کے طول و عرض میں بار بار چکر لگانے کے بعد شانتا کے چہرے پر رک جاتیں لیکن موہنی کی آنکھوں کا کوئی معنی خیز اشارہ اسے پریشان کر دیتا اور وہ مادھو، بدھو یا کنول کی طرف دیکھ کر کوئی بات چھیڑ دیتا۔ مادھو اپنے گرد و پیش سے بے خبر موہنی کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہا تھا اور وہ اپنے گالوں پر ایک خوش گوار حرارت محسوس کر رہی تھی۔ بدھو، مادھو کی اس محویت کو دیکھ چکا تھا جو اس پر پتھر کی خوبصورت مُورتیاں دیکھ کر طاری ہو جایا کرتی تھی اور اس کے دل میں مادھو کی دماغی حالت کے متعلق کئی شبہات پیدا ہو چکے تھے لیکن آج موہنی کی طرف دیکھ کر اسے علم ہُوا کہ مادھو کی تراشی ہوئی بے جان مورتیاں اس پیکرِ حُسن و جمال کی غیر فانی تصویریں تھیں وُہ رو بھر راگ جو اس نے صبح شام ان مُورتیوں کے سامنے گائے تھے دراصل اس لڑکی کے لیے تھے۔ اور وہ ترو تازہ پھول جنہیں وہ ہر صبح لا کر ان مورتیوں پر نچھاور کرتا تھا ایک اونچی ذات کی دیوی کے قدموں میں ایک نیچ ذات کی ادنیٰ بھینٹ تھی۔ بدھو کے دل میں مادھو کے لیے رحم اور موہنی کے لیے شفقت کے جذبات کروٹیں لینے لگے۔ وہ تصور میں اپنی لاڈلی بہو کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرنے لگا۔ اونچی ذات کی ایک باوقار لڑکی کا اس جھونپڑی میں آنا ہی اس بات کا کافی ثبوت تھا کہ وہ مادھو کی محبت سے غافل نہیں۔

رندھیر اور شانتا کی محبت کے متعلق بھی اب اُسے کوئی شبہ نہ تھا۔ ان کی زبانیں اگرچہ گُنگ تھیں لیکن نگاہوں میں کافی بے باکی آ چکی تھی۔ مادھو کی بے قرار نگاہیں بھی اس کے دل کی ترجمانی کر رہی تھیں لیکن موہنی کی حیا کے باعث ان کے درمیان اجنبیت کے پردے نہ اٹھ سکے۔ موہنی اور شانتا دونوں کے دل ایک ہی جیسے سیلاب سے آشنا تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ شانتا اپنے مستقبل سے بے پروا ہو کر اس سیلاب کو بہنے اور بہالے جانے کی اجازت دے چکی تھی لیکن موہنی اپنے انجام سے خوفزدہ ہو کر اسے تھپکیاں دے کر اپنے دل میں سُلانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس سیلاب کے سامنے آخری چٹان رندھیر ہو سکتا تھا۔ رندھیر کا سہارا لے کر وہ اپنے دل کو مادھو کی نگاہوں کے سامنے پتھر بنا سکتی تھی لیکن اب یہ سہارا ٹوٹنے کے متعلق اسے کوئی شُبہ نہ رہا۔ پہلی دفعہ اس نے رندھیر اور شانتا کی نگاہوں کے اشاروں سے متاثر ہونے کے بعد اپنے دل کو یہ کہہ کر دھوکا دینے کی کوشش کی تھی کہ اچھوت لڑکی کے ساتھ رندھیر کی دلچسپی عارضی اور ہنگامی ہے۔ آج گھر پر دوپہر کے وقت جب اس نے اپنی تازہ سرگزشت سُنائی تو اس کے شبہات میں کچھ اضافہ ہو گیا۔ مادھو گزشتہ ملاقات میں اس کے دل پر ایک نہ مٹنے والا نقش چھوڑ چکا تھا اسے جب بھی اس کا خیال آتا وہ پریشان ہو جاتی۔ بھگوان سے اپنے دھرم پر اور رندھیر کی محبت میں ثابت قدم رہنے کی دعائیں کرتی۔ وہ اپنے دل میں عہد کر چکی تھی کہ وہ مادھو کو دوبارہ نہ دیکھے گی لیکن آج اسے رندھیر کے متعلق بڑھتے ہوئے شبہات نے یہ عہد توڑنے پر مجبور کر دیا اور وہ شانتا سے ہمدردی کے بہانے اس جھونپڑی میں چلی آئی۔

---

(۴)

رندھیر کو بے قراری کے ساتھ شانتا کی طرف دیکھتے ہوئے موہنی نے محسوس

کیا کہ وہ اس سے بہت دور جا رہا ہے اور مادھو کی نگاہیں اس کے دل کے وہ دروازے توڑ رہی ہیں جہاں وہ رندھیر کا پہرا بٹھانا چاہتی تھی تاہم اسے رندھیر سے اس قدر گلہ نہ تھا جس قدر مادھو سے خوف تھا اُس نے ایک دو مرتبہ آنکھ بچا کر مادھو کی طرف دیکھا اور محسوس کیا کہ اگر وہ زیادہ دیر یہاں ٹھہری تو محبت کے اس دیوتا کے سامنے ہتھیار ڈال دینے پر مجبور ہو جائے گی۔ اس نے گھبرا کر کہا:

"رندھیر! چلو گھر چلیں"۔

رندھیر نے چونک کر موہنی اور اس کے بعد شانتا کی طرف دیکھا۔ شانتا کی نگاہیں اس کے پاؤں کے لیے زنجیر بن گئیں۔

اس کا تذبذب دیکھ کر موہنی پھر بولی "اچھا رندھیر! تم بیٹھو میں چلتی ہوں"۔

بدھو نے آگے بڑھ کر کہا "بیٹھو بیٹی! تم پہلے دن ہمارے گھر میں آئی ہو"۔

رندھیر نے بدھو کی تائید کی "ہاں ہاں موہنی! تھوڑی دیر بیٹھو، ابھی چلتے ہیں ہاں مجھے ایک بات یاد آ گئی۔ شانتا تم کہتی تھیں۔ مادھو نے اپنی دیوی کی مورتیاں بنائی ہیں۔ کہاں ہیں وہ؟"

شانتا نے قدرے خوف زدہ ہو کر بدھو اور مادھو کی طرف دیکھا۔ مادھو کو کچھ دیر اور موہنی کو بٹھانے کی تدبیر نظر آئی۔ لیکن وہ کچھ سوچنے کے بعد فکر مند ہو کر رندھیر کی طرف دیکھنے لگا۔

رندھیر نے کہا: "دکھاؤ! یہ بُرا نہیں مانیں گی۔ انہیں مورتیاں دیکھنے کا بہت شوق ہے۔ کیوں موہنی! دیکھو گی نا؟ شانتا ان مورتیوں کی بہت تعریف کرتی تھی"۔

موہنی نے نڈھال ہو کر رندھیر کی طرف دیکھا اور مادھو نے اس کی خاموشی کو رضا مندی سمجھتے ہوئے جھونپڑی کے کونے میں جا کر مورتیوں کے اُوپر سے چادر اٹھا دی۔ تین مورتیاں ایک قطار میں کھڑی تھیں۔ ان میں سے دو کی موہنی کے ساتھ

گہری مشابہت تھی اور درمیان والی مورتی موہنی کی مکمل تصویر تھی۔ مورتیوں کے قدموں میں تازہ پھولوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ موہنی پر تھوڑی دیر کے لیے ایک سکتے کا عالم طاری ہو گیا۔ سنگ تراشی میں مادھو کا یہ کمال رندھیر کی توقع سے بھی کہیں زیادہ تھا۔ وہ یکے بعد دیگرے موہنی اور مورتیوں کی طرف دیکھتا ہوا چارپائی سے اٹھا اور مورتیوں کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

اس نے کہا "موہنی اگر ان مورتیوں کے ساتھ آئینہ رکھ کر اپنی شکل دیکھو تو مجھے یقین ہے کہ اپنے عکس اور اس مورتی کے درمیان کوئی فرق نہ پاؤ گی۔ مادھو! تم نے سچ مچ کمال کر دکھایا"۔

سپیرا بھی کھسک کر مورتیوں کے قریب آ بیٹھا۔ اس نے کہا "ان مورتیوں میں صرف جان کی کمی ہے ورنہ شکل تو ہو بہو اس دیوی کی ہے"۔

موہنی کو جیسے کسی نے ہاتھ پاؤں باندھ کر دریا میں پھینک دیا ہو وہ تھوڑی دیر میں حواس درست کرنے کے بعد چارپائی سے اٹھی اور بھاگتی ہوئی جھونپڑی سے باہر نکل گئی۔ تھوڑی دور بھاگنے کے بعد اس کی آنکھوں کے سامنے آنسوؤں کے پردے چھا گئے اور ایک درخت کے ساتھ سر لگا کر سسکیاں لینے لگی لیکن اس کا ضمیر کہہ رہا تھا۔ موہنی! اس بچارے کا کوئی قصور نہیں تمہیں اس کی محبت کا علم تھا اس کی یہ جرأت تمہاری حوصلہ افزائی کا نتیجہ ہے۔ آخر تو بار بار یہاں کیوں آئی؟ تو ایک مدت سے اس کی طرف کھنچی جا رہی تھی۔ مادھو کے ساتھ تیری دلچسپی صرف ہمدردی کی وجہ سے نہ تھی بلکہ تجھے اس کے ساتھ پریم تھا تو اس پریم پر فتح حاصل کرنے کے لیے رندھیر کی پناہ لینی چاہتی تھی لیکن تو جانتی ہے کہ رندھیر کے ساتھ شادی کر کے بھی تیرے دل میں یہ آگ سلگتی رہے گی جسے تو دھرم رکھشا سمجھتی ہے وہ دراصل سماج کے انتقام کا خوف ہے۔ موہنی تو بزدل ہے اور موت سے پہلے اپنا

بلیدان دے رہی ہے تو مادھو سے بھاگ کر سماج کی پناہ لے سکتی ہے لیکن تیری روح پر ہمیشہ اس کا قبضہ رہے گا۔ اس نے بے بسی کی حالت میں آسمان کی طرف دیکھا اور کہا:

"بھگوان! تُو نے اسے شودر کیوں بنایا اور اگر اسے شودر بنایا تھا تو مجھے اونچی ذات میں پیدا کیوں کیا؟"

---

(۳)

موہنی کے جھونپڑی سے نکلنے کے بعد تمام لوگ پریشان ہو کر ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے وہ خیالی جنت جو مادھو نے برسوں میں آباد کی تھی آناً فاناً اجڑ گئی۔ وہ انتہائی رنج و کرب کی حالت میں رندھیر کے پاؤں پر گر پڑا اور گڑگڑا کر کہنے لگا "وہ مجھ سے خفا ہو گئیں۔ وہ مجھ سے رُوٹھ گئیں۔ مجھے معلوم نہ تھا وہ بُرا مانیں گی۔ میں بے قصور ہوں۔ آپ جانتے ہیں میں بے قصور ہوں۔"

رندھیر نے مادھو کا بازو پکڑ کر اٹھایا اور تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ "مادھو! وہ تم سے خفا نہیں۔ میری بات پر یقین کرو۔ میں پھر آؤں گا۔"

رندھیر بھاگتا ہوا موہنی کے قریب پہنچا اس نے پوچھا۔ "موہنی! کیا ہو گیا تمہیں؟"

موہنی نے آنسو پونچھ کر ایک مغموم مسکراہٹ کے ساتھ رندھیر کی طرف دیکھا اور جواب دیا۔ "کچھ نہیں رندھیر! سچ بتاؤ تم مجھ سے نفرت تو نہیں کرتے؟"

"نفرت! اور تم سے!! وہ کیوں؟"

"رندھیر تم جانتے ہو اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔ میں یہاں آنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ میں نے کبھی اس کے ساتھ بات بھی نہیں کی۔"

"موہنی! وہ تم سے پریم کرتا ہے وہی پریم جو انسان دیوتاؤں سے کرتے ہیں بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ ایسا پریم دیوتاؤں سے بھی بہت کم انسان کرتے ہوں گے میں ذاتی طور پر پریم کے معاملے میں اونچ اور نیچ کا قائل نہیں رہا۔ موہنی! تم نے شانتا کو دیکھا اس نے کل میرے لیے اپنی جان تک قربان کر دینا ایک کھیل سمجھا سماج کا قانون مجھے اس سے نفرت سکھاتا ہے لیکن انسانیت مجھے اس کی محبت کا جواب دینے سے منع نہیں کر سکتی میں اس کا دل توڑنا ایک پاپ سمجھتا ہوں اور اگر میں تمہاری جگہ ہوتا تو کسی صورت میں بھی مادھو جیسے نوجوان سے نفرت نہ کر سکتا۔ اس نے تمہاری مورتیاں بنا کر کوئی پاپ نہیں کیا۔ موہنی سچ کہو تمہیں اس سے پریم نہیں؟"

موہنی نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ "رندھیر! مجھ سے یہ نہ پوچھو میں ایک عورت ہوں جو اپنی حد سے باہر پاؤں نہیں رکھ سکتی۔"

"موہنی! میں تمہارے ساتھ ہوں لیکن صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تمہیں اس سے پریم ہے یا نہیں۔"

"مجھے معلوم نہیں۔ پریم کیا ہوتا ہے؟ میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ اسے بھول جانا اب میرے بس کی بات نہیں۔ لیکن میں آگ کے ساتھ نہیں کھیلوں گی۔ میں بدنامی اور رسوائی کی زندگی پر موت کو ترجیح دوں گی۔ ماں باپ کا نام رسوا کرنے کی بجائے اپنا گلا اپنے ہاتھوں سے گھونٹ ڈالوں گی۔"

موہنی پھر ہچکیاں لینے لگی۔ رندھیر نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے تسلی دیتے ہوئے کہا: "موہنی! میں جانتا ہوں کہ تمہارے راستے میں نہایت خطرناک چٹانیں ہیں لیکن دنیا میں کوئی مشکل ایسی نہیں جس پر ہمت اور استقلال سے فتح حاصل نہ کی جا سکے۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔"

موہنی کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن اچانک جھاڑیوں میں سے سرسراہٹ کی آواز آئی اور رام داس "شاباش بیٹا! شاباش!!" کہتا ہُوا نمودار ہُوا۔ رام داس کے پیچھے ارجن کو دیکھ کر موہنی کے مُنہ سے ہلکی سی چیخ نکلی اور وہ بے ہوش ہو کر نیچے گر پڑی۔ رندھیر نے اسے آگے بڑھ کر اٹھانا چاہا لیکن ارجن نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے پیچھے دھکیل دیا اور کہا: "بدمعاش! ہٹو پیچھے! مرنے دو اسے!"

رام داس نے جھک کر موہنی کو اٹھایا اور ارجن کی طرف دیکھ کر کہا: "ارجن! موہنی نردوش ہے یہ سب قصور رندھیر کا ہے۔ اس کا اپنا منہ کالا ہو چکا ہے اور یہ موہنی کو بھی اپنے ساتھ شامل کرنا چاہتا ہے۔"

موہنی نے ہوش میں آ کر آنکھیں کھولیں اور خوف زدہ ہو کر اپنے باپ کی طرف دیکھنے لگی۔ اتنے میں شنکر اور پروہت بھی جھاڑیوں سے باہر آ چکے تھے۔ رام داس نے موہنی کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"بیٹی! ہم سب باتیں سن چکے ہیں تم بے قصور ہو۔ جاؤ اپنے گھر! شنکر تم اس کے ساتھ جاؤ لیکن اس بات کا کسی سے ذکر نہ کرنا اور پروہت جی! اب ہماری عزت آپ کے ہاتھ میں ہے۔"

پروہت نے جواب دیا "آپ فکر نہ کریں کسی کو اس بات کا علم نہ ہوگا۔"

موہنی شنکر کے ساتھ چل دی۔

رام داس رندھیر سے مخاطب ہُوا "تو کل تم راستہ بھول گئے تھے تمہیں اس بات کی بھی شرم نہ آئی کہ تمہارا باپ شہر کا سردار ہے۔ تم موہنی سے کس بات کا انتقام لینا چاہتے تھے اور ارجن تم بھی چلو۔ میں تمہارے سامنے بہت نادم ہوں۔ اب مجھ سے جو کچھ ہو سکے گا کروں گا۔ موہنی کی عمر ہی کیا ہے اسے یہ باتیں کیا معلوم! یہ ساری بدمعاشی رندھیر کی ہے۔ کل تک سارے معاملات ٹھیک ہو جائیں گے۔ چلو اب گھر چلیں۔"

(۴۳)

راستے میں رندھیر نے کئی بار رام داس سے کچھ کہنے کا ارادہ کیا لیکن اس کے تیور دیکھ کر اسے بات کرنے کی ہمت نہ ہُوئی۔ شنکر ان کے پہنچنے سے پہلے گھر کے دروازے پر کھڑا تھا اس نے کہا: "مہاراج! موہنی دیوی کو گھر چھوڑ آیا ہوں، کوئی اور حکم ہے؟"

"کچھ نہیں، تم جاؤ" رام داس نے قدرے تلخ ہو کر جواب دیا۔

"پتا جی!" رندھیر نے مُرجھائی ہُوئی آواز میں کہا۔

رام داس نے اس پر ایک قہر آلود نگاہ ڈالی اور غصّے سے کانپتی ہوئی آواز میں جواب دیا "میں تمہاری کوئی بات نہیں سننا چاہتا۔"

"پتا جی! .... پتا جی! وہ نردوش ہیں۔ وہ شودر بھی نہیں۔ میں ان پر ظلم نہیں ہونے دوں گا۔"

رام داس کا پیمانۂ صبر لبریز ہو چکا تھا وہ دانت پیستا ہُوا آگے بڑھا اور رندھیر کے منہ پر پوری طاقت سے تھپڑ رسید کرنے کے بعد اس کے سر کے بال پکڑ کر دھکیلتا ہُوا مکان کے اندر لے گیا۔ رندھیر کا ضبط اور سکون اسے متاثر نہ کر سکا۔ اور وہ پھر ایک بار اسے پیٹنے لگا۔ رندھیر ایک دیوار کی طرح کھڑا یہ سب کچھ برداشت کر رہا تھا۔ یہاں تک کہ رام داس کے ہاتھ تھک گئے اور رندھیر کے ہونٹوں سے خون ٹپکنے لگا۔ رندھیر کے سفید گالوں پر انگلیوں کے نشان اور ہونٹوں پر خون کے قطرے دیکھ کر پدرانہ شفقت نے رام داس کے ہاتھ پکڑ لیے اور وہ کہنے لگا:

"ہاں تمہاری نظروں میں وہ شودر نہیں۔ تم انہیں برہمن سمجھتے ہو اور تم ان پر ظلم نہیں ہونے دو گے۔ بے شرم! بے حیا!! کمینہ کہیں کا۔"

رندھیر نے کہا "پتا جی! میں سچ کہتا ہوں، وہ .... !"

"چپ رہو!" رام داس کی گرجتی ہوئی آواز نے رندھیر کے ہونٹ سی دیے۔
رام داس نے اس کا بازو پکڑ کر کھینچتے ہوئے کہا:

"چلو میرے ساتھ!" رندھیر بے بس سا ہو کر اس کے ساتھ چل دیا۔ رام داس نے مکان کی ایک کوٹھڑی کے دروازے پر پہنچ کر اسے اندر دھکیل دیا اور باہر سے کنڈی لگاتے ہوئے کہا:

"تم اب یہاں رہو۔"

رندھیر نے دروازے کو اندر سے دھکے دیتے ہوئے کہا:

"پتا جی! پتا جی!! میری بات سنیئے۔ پتا جی! بھگوان کے لیے وہ شودر نہیں۔ وہ آپ کے دوست سکھدیو کی اولاد ہیں۔"

لیکن رام داس جا چکا تھا۔ پتھر کے فرش پر اس کے واپس لوٹتے ہوئے قدموں کی آہٹ بتدریج کم ہو رہی تھی۔

سماج کی فتح

بدھو سپیرے کے ساتھ جا چکا تھا۔ پڑوس کا ایک چرواہا ان کی بھیڑیں چرانے کے لیے لے گیا۔ مادھو کو باقی دن گھر میں بیٹھ کر گزارنا مشکل نظر آیا وہ مورتیاں جنہیں دیکھتے ہی اس پر ایک محویت سی طاری ہو جایا کرتی تھی اب اسے پتھر کے بے حس ٹکڑے نظر آ رہے تھے۔ موہنی کے خفا ہو کر بھاگنے کی صحیح وجہ اس کی سمجھ میں نہ آ سکی وہ صرف یہ سوچ سکتا تھا کہ موہنی صرف ان مورتیوں کو دیکھ کر خفا ہو گئی ہے اسے بار بار یہ خیال آتا تھا "کیا یہ ممکن ہے کہ اونچی ذات کے انسانوں کی مورتیاں بنانا پاپ خیال کرتے ہوں؟ نہیں! یہ ممکن نہیں!! آخر رندھیر بھی تو ایک اونچی ذات کا آدمی ہے اگر اس میں کوئی برائی ہوتی تو وہ یقیناً ان مورتیوں کو دیکھ کر خوش نہ ہوتا۔ بہرحال موہنی یہاں سے خوش ہو کر نہیں گئی۔ کاش! میں یہ مورتیاں نہ بناتا۔ لیکن اب کیا ہو گا؟ میں شاید دوبارہ اسے نہ دیکھ سکوں۔

مستقبل کی بے کیف اور غمگین زندگی کے تصور سے وہ کانپ اٹھا۔ انتہائی مایوسی اور بے بسی میں اسے امید کی ایک ہلکی سی کرن نظر آئی اور اس نے محسوس کیا کہ وہ اب صرف بھگوان یا اس زبردست طاقت کا سہارا لے سکتا ہے جس نے اسے اور موہنی کو ایک دوسرے کے قریب لانے کے لیے بار بار غیر متوقع حالات پیدا کیے تھے۔ وہ طاقت جو موہنی کو دھکیلتی ہوئی اس کی جھونپڑی میں لے آئی تھی اور آج اس سے موہنی خفا نہیں ہوئی بلکہ بھگوان خفا ہو گیا ہے۔ لیکن کیوں؟ شاید

اس لیے کہ اس نے موہنی کی مُورتیاں بنانے کے شوق میں بھگوان کو بُھلا دیا تھا اس
نے بھگوان کی زبردست طاقت کا سہارا لینے کی بجائے اُن مورتیوں کو اپنی تمام
توجہ کا مرکز بنا لیا تھا وہ بے قرار ہو کر اٹھا۔ کنول اور شانتا سے کچھ کہے بغیر جھونپڑی
سے باہر نکل آیا۔ ہر قدم پر اس کے دل سے یہ پکار اٹھ رہی تھی "بھگوان میری خطا
معاف کر، اے زمین و آسمان کی زبردست طاقت! میری خطا معاف کر!"

مادھو جھیل کے کنارے ایک درخت کے نیچے بیٹھ گیا اور دیر تک سر جھکائے
بھگوان کو مخاطب کرنے کے لیے موزوں الفاظ سوچتا رہا۔ اچانک اسے موہنی
کا سکھایا ہوا بھجن یاد آیا اور وہ دردبھری آواز میں گنگنانے لگا۔ آہستہ آہستہ وہ
گردوپیش سے بے خبر ہوتا گیا اور اس کی لَے بلند ہوتی گئی۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ
اس کی رُوح نیلگوں آسمان کی وسعتوں کو عبور کرتی ہوئی ان بلندیوں تک پہنچ رہی ہے
جہاں بھگوان رہتا ہے لیکن اچانک ایک پتھر اس کی کمر میں آ لگا۔ اس نے پریشان
ہو کر آنکھیں کھولیں اور بھونچکا ہو کر رہ گیا۔ آٹھ آدمی لاٹھیوں اور کلہاڑیوں سے
مسلح اس کے اردگرد کھڑے اسے خونخوار آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔

شنکر نے کہا "اٹھو ہمارے ساتھ چلو"

مادھو کو اس نئی مصیبت میں بھی بھگوان کی مرضی نظر آئی وہ اٹھا اور بے خوف و
ہراس ان کے آگے آگے چل دیا۔

چند قدم چلنے کے بعد پیچھے سے کسی کی آواز آئی "ٹھہرو! یہ بہت بھاری ہیں
سب کو باری باری اٹھانی پڑیں گی۔"

مادھو نے پیچھے مڑ کر دیکھا تین آدمی مادھو کی تراشی ہوئی مورتیاں اٹھائے
آہستہ آہستہ آ رہے تھے۔

مادھو کو کنول اور شانتا کا خیال آیا اور اس نے سراپا التجا بن کر شنکر کی طرف

دیکھتے ہوئے کہا: "یہ مورتیاں میں نے بنائی ہیں۔ میری ماں اور بہن کا اس میں
کوئی قصور نہیں۔"

شنکر نے غضب ناک ہو کر کہا "شودر کُتّے! تُو نے یہ بنائی ہیں یا ہمارے
مندروں سے چوری کی ہیں؟"

"نہیں! میں نے چوری نہیں کی۔"

شنکر پہلے ہی ایک اچھوت کو دیکھنے اور اس کے ساتھ باتیں کرنے میں
اپنے دھرم کا کچھ حصہ بھرشٹ کر چکا تھا۔ اس نے لال پیلا ہو کر کہا:

"چپ رہو ورنہ زبان کاٹ ڈالوں گا۔ لے چلو اسے!"

لاٹھیوں اور کلہاڑیوں کو شنکر کے حکم کی تعمیل کے لیے مستعد پا کر مادھو پھر
اپنے پہرہ داروں کے ساتھ چل دیا۔

---

(۲)

شام سے کچھ دیر پہلے رام داس کے گھر کے نزدیک پیپل کے ایک درخت
کے نیچے ایک چبوترے کے اردگرد شہر کے مردوں اور عورتوں کا ہجوم تھا۔ چبوترے
پر تین مورتیاں رکھی ہوئی تھیں اور لوگ ان کے سامنے روپیہ، پیسہ، پھل پھول اور
غلے کے ڈھیر لگا رہے تھے۔

شہر کے شمال میں کچھ دُور آج مدتوں کے بعد کالی دیوی کے مندر میں کچھ رونق
تھی۔ لوگ ان مورتیوں کے سامنے ہدیۂ عقیدت پیش کرنے کے بعد اس مندر کا
رُخ کر رہے تھے۔ رام داس کی سرداری کے زمانے میں کالی دیوی کے پجاری صرف
مویشیوں کے دان پر اکتفا کرتے رہے لیکن آج اُن کے لیے ایک انتہائی مسرت

کا دن تھا۔

رام داس مندروں کے چور کے لیے کوئی اور سزا تجویز کرنا چاہتا تھا لیکن پروہت شہر کے برہمنوں اور ارجن کے سامنے اس کی پیش نہ کی گئی۔ مادھو کو شہر کے آٹھ قابلِ اعتماد آدمیوں نے اپنے کانوں سے مقدس زبان میں بھجن گاتے سنا تھا۔ تین مورتیاں جن کے متعلق شہر کے برہمنوں کا متفقہ فیصلہ تھا کہ وہ دور دراز کے مندروں سے چُرائی گئی ہیں اس کے گھر سے دست یاب ہو چکی تھیں اتنے بڑے مجرم کی سزا کا فیصلہ کرنے کے لیے کسی سوچ بچار کی ضرورت نہ تھی۔

رام داس اگر سردار کی بجائے ایک راجہ بھی ہوتا تو بھی اسے پروہت کی مرضی کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا پڑتا۔ وہ بدنامی سے بچنے کے لیے مادھو کو گرفتار کر کے جلاوطن کرنا چاہتا تھا لیکن اسے کیا معلوم تھا کہ وہ بھجن گاتا ہوا پکڑا جائے گا اور اس کے گھر سے مورتیاں برآمد ہوں گی۔ وہ اپنی رواداری کے باعث اونچی ذات کے لوگوں کی نظر میں بہت بدنام تھا لیکن یہ واقعہ ایسا نہ تھا کہ وہ رائے عامہ کے احترام سے بے پروا ہو کر کوئی فیصلہ کرتا۔ ہندوؤں کی مقدس مورتیاں چُرانے اور چھپ چھپ کر بھجن سننے کے علاوہ مادھو نے براہِ راست اس کی اور اس کے دوست کی عزت پر ہاتھ ڈالا تھا۔ اس لیے جب برہمنوں کی پنچایت نے یک زبان ہو کر کالی دیوی کے مندر میں مادھو کے بلیدان کا مُطالبہ کیا تو اسے اس قدر تکلیف نہ ہوئی جتنی کہ عام حالات میں ہونی چاہیے تھی۔

مادھو کے گھر کے باقی افراد کے متعلق بالخصوص اس کی بہن کے متعلق اسے تشویش تھی اور وُہ چاہتا تھا کہ وہ سماج کا طوفان اٹھنے سے پہلے اپنی جانیں بچا کر کہیں بھاگ جائیں۔ انتہائی غصے کی حالت میں بھی عورتوں پر ہاتھ اٹھانا وہ اپنی سماج کی بہادرانہ روایات کے منافی خیال کرتا تھا۔ شہر کے لوگ کالی دیوی کے مندر میں مدت

کے بعد بلیدان دیئے جانے کی خبر سُن رہے تھے۔ ان کے لیے اس معاملہ میں ایک لمحہ بھر کی تاخیر بھی صبر آزما تھی۔ وہ رات ہونے سے پہلے ہی اس مقدس فریضے سے سبک دوش ہونا چاہتے تھے لیکن بدقسمتی سے کالی دیوی کے مندر کا پروہت دریا کے پار ایک گاؤں میں کسی رشتہ دار سے ملنے کے لیے گیا ہوا تھا۔

رام داس نے برہمنوں کے اصرار پر اسے لانے کے لیے شام کے وقت ہی ایک کشتی دریا کے پار بھجوا دی اور انہیں اطمینان دلایا کہ پروہت سورج نکلنے سے پہلے پہنچ جائے گا۔

رام داس کو اس بات کا افسوس تھا کہ وہ مادھو کے لیے کچھ نہیں کر سکا۔ تاہم برہمنوں کے فیصلے کے بعد وہ چاہتا تھا کہ یہ بلیدان اب جس قدر جلد ہو جائے اتنا ہی بہتر ہے ورنہ اتنی دیر رندھیر کو کوٹھڑی میں بند رکھنا پڑے گا۔

رندھیر کے متعلق اسے یقین تھا کہ وہ اپنی ہٹ کا پکا ہے اور مادھو کو بچانے کا جو ارادہ وہ ظاہر کر چکا ہے اسے ضرور پورا کرے گا۔

---

(۳)

مادھو کی گرفتاری سے قبل جو سپاہی جھونپڑی کی تلاشی لینے گئے تھے انہیں رام داس نے عورتوں پر کسی قسم کی زیادتی کرنے سے منع کر دیا تھا۔ اس لیے کسی نے شانتا اور کنول سے بات تک نہ کی۔ تاہم شنکر کے لیے اچھوت کی جھونپڑی میں داخل ہونا اور شانتا جیسی لڑکی سے بات تک نہ کرنا صبر آزما تھا۔ وہ اپنے دل میں اچھا پھر سہی کہہ کر نکلا اور سپاہیوں کے ساتھ مادھو کی تلاش میں چل دیا۔

سپاہیوں کے جاتے ہی کنول کو مادھو کی فکر دامن گیر ہوئی اور وہ تھوڑی دیر

انتظار کرنے کے بعد جھونپڑی سے نکلی اس نے جھیل کے کنارے اور آس پاس کی بستیوں میں کئی چکر لگائے لیکن مادھو کا کہیں پتہ نہ تھا۔ چند شودر بھی اس کی بیقراری دیکھ کر اپنے اپنے گھروں سے نکلے اور مادھو کو تلاش کرنے لگے۔ کنول تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد گھر آتی اور شانتا کو تسلی دے کر پھر مادھو کی تلاش میں نکل جاتی۔

جوں جوں رات قریب آ رہی تھی۔ مادھو کے متعلق اس کا وہم یقین میں تبدیل ہونے لگا کہ اسے شہر کے سپاہی پکڑ کر لے گئے ہیں۔ رات کے وقت ایک چرواہے نے اسے بتایا کہ فلاں بستی کا ایک چرواہا مادھو سے بنسری سیکھا کرتا ہے۔ شاید اس کے پاس گیا ہوگا۔ یہ بستی ایک کوس پر تھی۔ لیکن مایوسی کے دریا میں ڈوبتی ہوئی ممتا نے پھر ایک بار تنکوں کا سہارا لیا اور کنول، شانتا کو تسلیاں دینے کے بعد چرواہے کو ساتھ لے کر اس بستی کی طرف چل پڑی۔

شانتا جھونپڑی سے باہر اپنی چارپائی پر لیٹی ستاروں کی طرف دیکھ رہی تھی۔ مادھو کے متعلق کنول کی طرح اس کا بھی یہی خیال تھا کہ اسے شہر کے سپاہی پکڑ کر لے گئے ہیں لیکن وہاں رندھیر جیسے رحم دل انسان کی موجودگی کے باعث اسے ایک گونہ اطمینان تھا۔

اچانک اس نے اپنے متعلق سوچا "اگر کوئی مجھے پکڑ کر لے جائے تو؟" اور یہ خیال آتے ہی پاس کے درخت اور جھاڑیاں اس کے لیے توہمات کے بھوت بن گئے وہ گھبرا کر اپنے بستر سے اٹھی اور جھونپڑی کے اندر جا کر اپنے پتا کی تلوار نکال لائی اور دوبارہ چارپائی پر لیٹ کر تصور میں اپنے کئی دشمنوں کو خاک و خون میں تڑپتا ہوا دیکھنے لگی۔

تھوڑی دیر بعد اس نے کسی کے پاؤں کی آہٹ سنی اور "ماتا۔ ماتا" کہتی ہوئی

اٹھ بیٹھی۔

"تمہاری ماتا گھر میں نہیں ہے؟" ایک کرخت مردانہ آواز نے شانتا پر کپکپی طاری کر دی۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ ایک آدمی ہاتھ میں مشعل لیے جھونپڑی کے پاس کھڑا تھا۔

"تم کون ہو؟" شانتا نے سہمی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"شور نہ کرو" یہ کہہ کر اس نے مشعل جھونپڑی کی طرف بڑھائی۔ سرکنڈے کے تنکوں میں آگ کے شعلے بھڑکے۔ شانتا نے بڑھتی ہوئی روشنی میں شنکر کے چہرے کی چمکتی ہوئی سیاہی سے اسے پہچان لیا۔ وہ چارپائی سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور بھاگنے کا ارادہ کر رہی تھی کہ شنکر نے مشعل پھینکی اور آگے بڑھ کر اس کا بازو پکڑ لیا۔

"چلو میرے ساتھ۔"

شانتا نے جھٹک کر اپنا بازو چھڑایا اور چند قدم پیچھے ہٹ کر کھڑی ہو گئی۔

"اچھوت اور یہ نخرے!"

شانتا حسرت بھری نگاہوں سے جھونپڑی کی بڑھتی ہوئی آگ کو دیکھنے لگی۔ شنکر نے آگے بڑھ کر پھر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ شانتا نے اس دفعہ دوسرے ہاتھ سے پوری طاقت کے ساتھ اس کے منہ پر چپت رسید کیا! اور وہ شانتا کا ہاتھ چھوڑ کر اپنا گال سہلانے لگا۔

"بھگوان نے تمہارے ہاتھ تھپڑ مارنے کے لیے نہیں۔ چومے جانے کے لیے بنائے ہیں۔" یہ کہہ کر شنکر پھر آگے بڑھا لیکن شانتا نے بھاگ کر چارپائی پر سے تلوار اٹھالی اور اس کی نوک شنکر کے سینے کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی "بے شرم! بے حیا! کمینے!! اگر ایک قدم آگے بڑھایا تو تیرے ٹکڑے اڑا دوں گی"

شنکر سراسیمہ ہو کر الٹے پاؤں پیچھے ہٹنے لگا اور شانتا غضب ناک ہو کر

آگے بڑھنے لگی۔ الٹے پاؤں تیزی سے چلتے ہوئے شنکر کے پاؤں کو ایک پتھر
کی ٹھوکر لگی اور وہ لڑکھڑاتا ہوا جھونپڑی کی جلتی ہوئی دیوار سے جا ٹکرایا۔ آگ کے
شعلوں نے اس کا منہ اور اس کے سر کے بال جھلس دیے۔ شانتا نے حقارت سے
اس کی طرف دیکھا اور بزدل کہہ کر تلوار نیچے کر لی۔ اس عرصے میں بستی کے لوگ شور
مچاتے ہوئے جھونپڑی کی طرف آ رہے تھے۔ شنکر سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا اور آن
کی آن میں درختوں کے پیچھے غائب ہو گیا۔

تھوڑی دیر میں بہت سے مرد اور عورتیں شانتا کے ارد گرد جمع ہو گئے۔
جھونپڑی کی آگ بجھانا اب کسی کے بس میں نہ تھا۔ شانتا بار بار کہہ رہی تھی:
"اگر مجھے معلوم ہوتا کہ وہ اس قدر بزدل ہے تو میں اسے جھونپڑی کو کبھی
آگ نہ لگانے دیتی میں اس کے ہاتھ سے مشعل چھین لیتی۔"

---

(۴)

تھوڑی دیر بعد کنول پہنچ گئی اور شانتا ماتا ماتا کہہ کر روتی ہوئی اس سے
لپٹ گئی۔

کنول نے اسے تسلی دی اور شانتا نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا "ماتا! یہ میرا
قصور ہے۔ میں ڈر گئی تھی ورنہ وہ بہت بزدل تھا۔ میں اگر ہمت کرتی تو اس کے
ہاتھ سے مشعل چھین لیتی۔"

کنول کے سامنے جھونپڑی کی کوئی اہمیت نہ تھی اس کے ذہن میں صرف
مادھو تھا۔ وہ شہر میں اس کا پتہ لگانے کے طریقے سوچ رہی تھی لیکن اسے ڈر تھا
کہ کوئی اچھوت شہر جانے کا خطرہ مول نہیں لے گا۔

اب وہ اپنا آخری حربہ استعمال کرنے پر مجبور تھی اس نے جھونپڑی کے
قریب جمع ہونے والے لوگوں سے کہا:

"تم میں سے کسی نے اب تک مجھے نہیں پہچانا لیکن تم میں کئی ایسے ہیں جنہیں
میں پہچانتی ہوں میں تمہارے سردار کی بیٹی ہوں۔ جن لوگوں نے آج سے بیس برس
پہلے میرے پتا کو قتل کیا تھا وہ آج میرے بیٹے مادھو کو پکڑ کر لے گئے ہیں اور اس
کے ساتھ وہی سلوک کریں گے جو انہوں نے میرے باپ کے ساتھ کیا تھا۔ تم
میں سے کون ہے جو میرے بیٹے کی جان بچانے کے لیے میرا ساتھ دے گا۔"

لوگ ایک دوسرے سے باتیں کرنے لگے "سردار کی بیٹی — کون؟ —
کنول! کنول!! کنول!!!

کنول نے کہا "ہاں! میں کنول ہوں۔ تم سکھدیو کو بھی جانتے ہو وہ میرا
پتی تھا۔"

چند بوڑھے اور ادھیڑ عمر لوگ کنول کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو گئے۔
ایک سفید ریش آدمی نے آگے بڑھ کر آگ کی روشنی میں کنول کی طرف غور
سے دیکھا اور پوچھا "کنول بیٹی! مجھے پہچانتی ہو؟"

"میں تمہیں کیسے بھول سکتی ہوں جب میں چھوٹی تھی۔ تم مجھے سارا دن کندھوں
پر اٹھائے پھرا کرتے تھے۔ تمہیں یاد ہے ایک دن تم آم کے درخت کے نیچے سو
رہے تھے۔ تمہارا منہ کھلا تھا اور میں نے تمہارے منہ میں آم لا کر نچوڑ دیا تھا۔ ایک
دفعہ میں نے مٹی کھائی تھی اور تم نے مجھے بہت پیٹا تھا اور پھر پتا جی سے بھی
پٹوایا تھا۔ کیوں چاچا جی پہچانا مجھے؟"

کنول اور سفید ریش بوڑھے کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ قوم
کے باقی لوگوں کو بھی وہ آزادی اور بے فکری کے دن یاد آ گئے سب کی آنکھیں

پُرنم ہوگئیں۔

کنول نے کہا "چچا! مادھو کا پتہ لگاؤ۔"

تیجو نے کہا "کنول! تو ہمارے سردار کی بیٹی ہے۔ تیرے اشاروں پر جان قربان کرنا ہمارا دھرم ہے لیکن تو جانتی ہے کہ ہم اپنے دشمن کے مقابلے میں نہتے ہیں۔ ہم میں کوئی اتفاق نہیں۔ تیرے پتا کی موت کے بعد ہم کچھ مدت چھپ چھپ کر لڑتے رہے۔ لیکن نیا سردار رام داس ایک ہوشیار آدمی تھا وہ ایک دن اکیلا ہمارے پاس پہاڑوں میں چلا آیا اور ہم سے انصاف کا وعدہ کرکے اس نے ہمارے بہت سے آدمیوں کو اپنا حامی بنا لیا۔ ہمیں شہر کے آس پاس آباد ہونے کی اجازت مل گئی لیکن بعض نے اس کے وعدوں پر یقین نہ کیا اور وہ یہاں سے دُور پہاڑوں میں جاکر آباد ہوگئے۔

رام داس نے ہم سے کوئی بدعہدی نہیں کی لیکن شہر کے تمام لوگ ہمیں حقیر سمجھتے ہیں۔ ہمیں وہاں جانے کی اجازت نہیں۔ ہم ان کے مندروں کے قریب سے نہیں گزر سکتے۔ ہم جب تک ان لوگوں کے دشمن تھے۔ خود کو انسان سمجھتے تھے اور اب ان سے صلح کرکے شودر اور اچھوت بن گئے ہیں۔ ہماری قوم کے وہ لوگ جو اب تک پہاڑوں میں چھپ کر آزادی کا سانس لے رہے ہیں، زرخیز زمین اور اچھی چراگاہوں سے محروم ہیں لیکن مجھے ان کی زندگی پر رشک آتا ہے آزادی ایک ایسی نعمت ہے جس پر زندگی کا ہر آرام قربان کیا جا سکتا ہے۔ چند برس کی غلامی کے بعد ہمارے دماغ سے آزادی کا تصور مٹ چکا ہے۔ ہم ہمیشہ کے لیے ان لوگوں کو اپنے اوپر حکومت کا حق دے چکے ہیں۔ اب ہماری سب سے بڑی خواہش یہ ہے کہ ہم ان کے مندروں میں جاکر ان کے دیوتاؤں کی پوجا کر سکیں ان کے کنوؤں سے پانی پی سکیں اور ان کے شہروں کو دیکھ سکیں۔ رام داس نے آج تک ہم میں

سے کسی کے ساتھ ایسا سلوک نہیں کیا لیکن تمہاری جھونپڑی جلانے اور مادھو کو پکڑ کر لے جانے کی وجہ جو میری سمجھ میں آسکتی ہے یہی ہو سکتی ہے کہ اسے کسی طرح یہ علم ہوگیا ہے کہ تم ہمارے سردار کی بیٹی ہو اور سردار کے نواسے کا ہم لوگوں میں رہنا زیادہ خطرناک سمجھتے ہوں گے لیکن میں حیران ہوں کہ انہیں یہ علم کیسے ہوگیا؟"

کنول نے کہا "اور تو کسی کو پتہ نہیں۔ سردار کا بیٹا ہمارے گھر آیا تھا۔ اس نے شانتا کے پتا کی انگوٹھی دیکھ کر ہمیں پہچان لیا تھا۔ لیکن وہ ......!"

شانتا نے کنول کا فقرہ پورا نہ ہونے دیا۔ فوراً بولی "نہیں ماتا... وہ ایسا نہیں رندھیر ہمارے ساتھ ایسا نہیں کر سکتا۔"

تیجو نے کہا "بیٹی! تو ان لوگوں کو نہیں جانتی۔ یہ لوگ خطرے کو کوسوں دُور سے دیکھ لیتے ہیں۔ رندھیر کو میں نے بھی کئی دفعہ شکار پر جاتے دیکھا ہے۔ وہ شکل و صورت سے بہت رحم دل معلوم ہوتا ہے لیکن ہمیں کسی کی شکل دیکھ کر دھوکا نہیں کھانا چاہیے۔ ان لوگوں کے چہرے ملائم ہیں لیکن دل پتھر کی طرح سخت ہیں۔"

شانتا نے جواب دیا "لیکن وہ اسی رام داس کا بیٹا ہے جس کی تم تعریف کر رہے تھے۔"

"ہاں! یہ میں جانتا ہوں کہ رام داس ان لوگوں سے مختلف ہے لیکن وہ ہم سے نیک سلوک بھی اپنی بھلائی کے لیے کرتا ہے۔ یہ اس کی نرمی کا نتیجہ ہے کہ ہماری آدھی سے زیادہ قوم جسے غلام رکھنے کے لیے اسے بر وقت ہزاروں سپاہیوں کی ضرورت ہوتی، آج اس کے ڈیڑھ دو سو سپاہیوں کے اشاروں پہ ناچتی ہے۔ وہ ہمیں حکم دیتے ہیں کہ ہمارے شہر میں نہ آؤ اور ہم اس کے قریب سے نہیں گزرتے۔ یہ شہر بھی وہ ہے جس کے مکانات کے نیچے ہماری جھونپڑیوں کی راکھ دبی ہوئی ہے۔ تم سوچو کہ اگر ہم ان کے کنوؤں پر چڑھ جائیں یا مندروں

میں داخل ہو جائیں تو رام داس ہمارے ساتھ کیا سلوک کرے گا؟ اب تم ہی بتاؤ کہ جھونپڑی رام داس کی اجازت کے بغیر کوئی جلا سکتا تھا؟ اور مادھو کو اس کے حکم کے بغیر کوئی پکڑ کر لے جا سکتا تھا؟"

تیجو کے دلائل کے سامنے شانتا کی پیش نہ گئی وہ دل ہی دل میں رندھیر کے خلاف پیدا ہونے والے شکوک کے خلاف جنگ کر رہی تھی۔

کنول نے کہا: "لیکن اب کیا ہو گا وہ مادھو کے ساتھ کیا سلوک کریں گے؟"

تیجو نے جواب دیا "مادھو کے لیے میری جان حاضر ہے لیکن مجھے امید نہیں کہ بہت سے لوگ میرا ساتھ دینے کے لیے تیار ہو جائیں گے۔"

پانچ چھ آدمیوں کی آواز آئی "ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ ہم سب تمہارے ساتھ ہیں۔"

کنول نے ان کی طرف یکے بعد دیگرے دیکھا وہ سب کے سب بوڑھے تیجو کے ہم عمر اور کنول کے باپ کے پرانے وفاداروں میں سے تھے۔ نوجوانوں کے چہروں پر ہمدردی کی بجائے خوف غالب تھا۔ شہر والوں کے متعلق وہ کسی برے خیال کو اپنے دل میں جگہ دینا بھی ایک پاپ سمجھتے تھے۔ عورتوں کو کنول کے بیٹے سے زیادہ اپنی جھونپڑیاں عزیز تھیں۔ مائیں اپنے بیٹوں، بیویاں اپنے شوہروں اور بہنیں اپنے بھائیوں کے ہاتھ پکڑ کر اپنے گھروں کی طرف چل دیں کنول کے پاس صرف چھ آدمی اور ایک چودہ سال کا لڑکا رہ گئے۔ یہ لڑکا تیجو کا پوتا تھا اور اس کا نام لالو تھا۔

کنول نے کہا "یہ سب ڈر گئے ہیں میں نے انہیں شہر والوں کے ساتھ لڑنے کو تو نہیں کہا تھا۔"

لالو نے آگے بڑھ کر کہا "میں تمہارے لیے لڑوں گا میں کسی سے نہیں ڈرتا۔"

کنول نے اس کے سر پہ پیار سے ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا "بیٹا! تم کون ہو؟"

تیجو بولا: "یہ میرا پوتا ہے۔"

لالو نے تیجو سے پوچھا "بابا! میں شہر جا کر مادھو کا پتہ لگاؤں؟"

کنول نے حیران ہو کر کہا "تم! نہیں بیٹا، جاؤ تم گھر جاؤ۔"

یہ کہہ کر وہ تیجو کی طرف متوجہ ہوئی۔ "چچا! تم شانتا کو اپنے گھر لے جاؤ میں خود شہر جاتی ہوں۔ رام داس سکھدیو کا دوست تھا اس نے ہماری جان اس وقت بچائی تھی جب ہم راجہ کی قید میں تھے اور صبح ہم دونوں کا بلیدان دیا جانے والا تھا اب بھی مجھے یقین ہے کہ وہ ہماری مدد کرے گا۔ اگر مادھو کو اس نے کوئی خطرہ محسوس کر کے گرفتار کیا ہے تو میں اس کی تسلی کر دوں گی۔ اگر اسے ہمارا اس جگہ رہنا پسند نہ ہوا تو میں اس سے یہ ملک چھوڑ دینے کا وعدہ کروں گی وہ یقیناً مادھو کو چھوڑ دے گا۔"

تیجو نے کہا "لیکن رام داس کے گھر تک تمہاری رسائی بہت مشکل ہے۔ اول تو تمہیں شہر میں کوئی داخل نہ ہونے دے گا۔ اور اگر بچ بچا کر وہاں تک چلی بھی جاؤ تو اس کے سپاہی تمہیں دور سے دھتکار دیں گے اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ الفاظ کی بجائے اینٹیں استعمال کریں اور اس وقت تو شہر کا دروازہ بھی بند ہو گا۔ میں لالو کو بھیجتا ہوں یہ مادھو کو تلاش کرے گا۔ اگر اسے موقع ملا تو شاید اس کی بھی مدد بھی کر سکے۔"

کنول نے پوچھا "لالو کون ہے؟"

تیجو نے اپنے پوتے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا "یہی۔"

کنول نے کہا "نہ چچا اسے نہ بھیجو۔ یہ بچہ ہے۔ یہ کیا کرے گا وہاں جا کر؟"

تیجو نے جواب دیا "بیٹی! تو اسے نہیں جانتی۔ شہر کا کوئی گھر ایسا نہیں، جہاں یہ نہیں جاتا۔"

"لیکن وہ اسے کچھ نہیں کہتے۔"

"یہ آج تک کسی کے قابو میں نہیں آیا۔ رات کے وقت شہر کی دیوار پھاند کر ان کے گھروں سے کھانے پینے کی چیزیں چُرا لانا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ اس کا رنگ بھی اپنے باپ کی طرح سفید ہے اور یہ دن کے وقت بھی ان ہی کے چوری کیے ہوئے کپڑے پہن کر ان کے گھروں اور مندروں میں چلا جاتا ہے۔ اب تم میرے گھر چلو! لالو صبح سے پہلے کوئی اچھی خبر لے کر آ جائے گا۔ اگر یہ کسی طرح مادھو کو قید سے نکال لایا تو ہم تمہیں پہاڑوں میں پہنچا دیں گے۔"

مادھو کے متعلق کنول کے خدشات نے اسے تیجو کی دعوت قبول کرنے پر آمادہ کر لیا۔ اس نے کہا "اب اور تو کچھ نہیں رہ گیا۔ یہ چارپائیاں اُٹھا لیں۔"

شانتا نے موقع پا کر لالو کا بازو پکڑ لیا اور اسے ذرا ایک طرف لے جا کر آہستہ سے کہا: "لالو! تم شہر کا ہر گھر جانتے ہو؟"

اس نے جواب دیا "بہت اچھی طرح۔"

"تم نے رندھیر کو دیکھا ہے؟"

"کئی بار۔"

"اس کے گھر کا پتہ ہے؟"

"واہ! یہ ہو سکتا ہے کہ کوئی ہر روز شہر جائے اور اسے رندھیر کے گھر کا پتہ نہ ہو۔"

"اچھا لالو! تم میرے بھائی ہو نا؟"

لالو نے خوش ہو کر اثبات میں سر ہلایا۔

"میرا ایک کام کرو گے؟"

"ضرور کروں گا۔"

تم رندھیر کے پاس جا کر اسے کہو کہ سانپ کے زہر سے شانتا کی حالت پھر خراب ہو گئی ہے۔ وہ مرنے سے پہلے تمہیں دیکھنا چاہتی ہے اور لو! یہ انگوٹھی اسے دے دینا۔"

لالو نے انگوٹھی لے لی اور کہا "بس میں ابھی جاتا ہوں۔ صرف گھر جا کر کپڑے بدلوں گا۔"

شانتا نے کہا: "اور دیکھو میں تمہیں ہر روز دودھ اور مکھن دیا کروں گی۔"

لالو نے جواب دیا "اُوں ہُوں۔ دودھ اور مکھن سے مجھے نفرت ہے میں صرف اونچی ذات والوں کے گھر کے پکوان کھایا کرتا ہوں۔"

قربانی

چرواہوں کی بستیوں میں کوئی ایسا نہ تھا جسے لالو کے ساتھ دلچسپی نہ تھی۔ وہ بلا کا چست اور بے حد نڈر تھا۔ بھاگنے، تیرنے اور درختوں پر چڑھنے میں کوئی اس کا ہم پلہ نہ تھا۔ اس کی شرارتوں کی داستانیں ہر بچے اور ہر بوڑھے کی زبان پر تھیں اسے جنگل کے درندوں کا خوف تھا نہ شہر کے مہذب انسانوں کا ڈر۔ اگر ایک دن اس کے متعلق یہ خبر مشہور ہوتی کہ وہ جنگل سے ریچھ کا بچہ پکڑ لایا ہے، تو دوسرے دن یہ سُنا جاتا کہ وہ شہر کے کسی معزز آدمی کے نئے کپڑے یا کسی اونگھتے ہوئے سپاہی کے ہتھیار اٹھا لایا ہے۔

ماں باپ کا سایہ بچپن میں سر سے اٹھ جانے کے بعد اس کی دیکھ بھال کی تمام ذمہ داری تیجو پر تھی۔ تیجو نے اسے ایک اچھا ماہی گیر اور ایک فرض شناس چرواہا بنانے کے لیے بہت جتن کیے لیکن لالو پر اس کی کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی۔ چنانچہ اسے چودہ سال کی عمر تک سمجھانے، گالیاں دینے اور پیٹنے کے بعد مایوس ہو کر اس نے نہ صرف اس کے مشاغل میں دخل دینا ترک کر دیا بلکہ آہستہ آہستہ ان میں دلچسپی لینے لگا۔

شروع شروع میں لالو نے تاریک راتوں میں شہر کے محلات اور مندروں کی سیر کی۔ لیکن اب وُہ دن کے وقت بھی وہاں سے ہو آتا تھا۔ اس کا رنگ سفید تھا کپڑے وہ کئی سال کی ضرورت سے زیادہ جمع کر چکا تھا۔ اس لیے شہر میں کبھی کسی

نے اس کا حسب نسب پوچھنے کی ضرورت محسوس نہ کی وُہ ان کے آداب معاشرت اور پوجا پاٹ کے تمام طریقوں سے واقف ہو چکا تھا۔

لالو تین پہر رات گئے شہر میں داخل ہُوا۔ رام داس کے مکان کا دروازہ بند تھا اور پہرے دار دیوار کے سہارے بیٹھا خراٹے لے رہا تھا۔ مکان کی چار دیواری بہت اونچی تھی۔ لالو نے پچھلی طرف جا کر دیوار کے ساتھ اُگے ہوئے آم کے درخت سے سیڑھی کا کام لیا اور مکان کے اندر پہنچ گیا وہ اس مکان کے ہر کونے سے واقف تھا۔ رام داس اور رندھیر گرمیوں میں مکان کی چھت پر سویا کرتے تھے وہ دبے پاؤں سیڑھیوں پر چڑھتا ہُوا چھت پر پہنچا لیکن آج خلاف معمول وہاں پر صرف ایک چارپائی تھی۔ اس نے جھک کر غور سے دیکھا تو معلوم ہُوا کہ اس پر سونے والا رام داس ہے لیکن رندھیر کہاں ہے؟ اس نے اپنے دل سے سوال کیا۔

تھوڑی دیر سوچنے کے بعد وہ نیچے اترا۔ صحن میں چند نوکر سو رہے تھے اسے خیال آیا کہ شاید رندھیر آج ان کے پاس سو گیا ہو لیکن انہیں اچھی طرح دیکھنے کے بعد اسے پھر مایوسی ہوئی۔

پو پھٹنے سے کچھ دیر پہلے وہ جس راستے مکان میں داخل ہُوا تھا، اسی راستے واپس نکل آیا۔ اب کسی اور طرف رُخ کرنے سے پہلے اس نے کسی جگہ بیٹھ کر صبح کا انتظار کرنا ضروری سمجھا لیکن اسے بھوک محسوس ہوئی۔ شہر کے باہر ایک باغ میں اسے ایک پودے کے آم بہت پسند تھے وہ اس طرف چل دیا لیکن پندرہ بیس قدم اٹھانے کے بعد وہ ایک مکان میں کسی کی آواز سن کر رک گیا۔

کوئی عورت ہچکیاں لیتے ہوئے کہہ رہی تھی:

"ماتا! مجھے جانے دو ۔۔۔ بھگوان کے لیے مجھے جانے دو۔ وہ نردوش

ہے اس نے مُورتیاں نہیں چُرائیں۔ اگر ہمارا ان کے گھر جانا پاپ تھا تو اس کی سزا ہمیں ملنی چاہیئے نہ کہ اسے اور یہ پاپ نہیں تھا۔ اس لڑکی نے رندھیر کی جان بچائی تھی ہم اس کی خبر کو گئے تھے۔

دوسری عورت کہہ رہی تھی کہ "موہنی اپنے باپ کے منہ پر کلنک کا ٹیکہ نہ لگاؤ کوئی سن لے گا تو کیا کہے گا؟"

"نہیں ماتا! مجھے جانے دو۔ اگر اس کا بلیدان دیا گیا تو میں دریا میں ڈوب مروں گی۔"

"موہنی! میرے دودھ کی شرم کرو مندر میں جا کر تمام لوگوں کے سامنے اپنے باپ کے سر پر خاک ڈالو گی؟ وہ تمہیں کبھی زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

"تو ماتا تم جا کر پتا کو سمجھاؤ وہ تمہاری بات ضرور مانے گا۔"

"نہیں وہ اس کا بلیدان دینے کی قسم کھا چکا ہے۔ آج اس نے کسی پہریدار کا بھی اعتبار نہیں کیا وہ خود مندر میں پہرہ دے رہا ہے۔"

"تو پھر بھگوان کے لیے مجھے رندھیر کے گھر جانے دو۔ رندھیر کے پتا کو اگر یہ معلوم ہو جائے کہ اس کی بہن نے رندھیر کی جان بچائی ہے تو وہ ضرور اسے بچا لے گا۔"

"موہنی بھگوان کے لیے چپ رہو۔ کیا رندھیر یہ اپنے پتا کو نہیں بتا سکتا؟"

"ماتا تم خود کہتی ہو کہ رندھیر کوٹھڑی میں بند ہے اور اسے یہ بھی معلوم نہیں کہ سپاہی مادھو کو پکڑ کر لے آئے ہیں۔"

"میرے سامنے بار بار اس ذلیل کتے کا نام نہ لو۔ کوئی سنے گا تو کیا کہے گا؟"

"مجھے اس کی پروا نہیں۔ اگر اس کا بلیدان دیا گیا تو کوٹھے کی چھت پر چڑھ

کر چلاؤں گی۔ یہ پاپ تھا وہ بے گناہ تھا۔ ماتا بھگوان کے لیے اس کی جان بچاؤ میں وعدہ کرتی ہوں کہ میں کبھی جھیل پر نہیں جاؤں گی۔"

اس کے بعد دیر تک ہچکیوں کی آواز آتی رہی۔

---

(۲)

یہ باتیں سننے کے بعد لالو آموں کو بھول گیا اور سیدھا کالی دیوی کے مندر کی طرف بھاگا۔ رات کی سیاہی صبح کی دھندلی میں تبدیل ہو رہی تھی۔ مندر کے قریب پہنچ کر اسے شنکر آتا ہوا دکھائی دیا۔ شنکر کا چہرہ جھلس جانے پر زیادہ سیاہ ہو چکا تھا۔ اس نے لالو کو دور سے دیکھتے ہی پوچھا "پروہت جی آ گئے؟"

"کون سے پروہت جی؟"

"کالی دیوی کے مندر کے۔"

"وہ کہاں گئے ہوئے تھے؟"

"دھرم پور۔ سردار نے انہیں لانے کے لیے آدمی بھیجے تھے۔"

"شاید آ گئے ہوں مجھے پتہ نہیں لیکن تمہارے منہ کو کیا ہوا؟"

شنکر نے خشک لہجے میں جواب دیا "کچھ نہیں" اور بڑبڑاتا ہوا آگے چل دیا۔

لالو بھاگتا ہوا کالی دیوی کے مندر میں پہنچا۔ مادھو رسیوں میں جکڑا ہوا مندر کے سامنے پڑا تھا اور ارجن کے علاوہ پندرہ سپاہی اس سے ذرا دور ہٹ کر بیٹھے ہوئے تھے۔ لالو نے وہاں ایک لمحہ بھی ضائع کرنا مناسب خیال نہ کیا اور واپس شہر کی طرف بھاگا۔ راستے میں اسے مندر کی طرف آنے والے مردوں اور عورتوں کی کئی ٹولیاں ملیں۔

رام داس کے گھر کا دروازہ اب کھلا تھا اور وہ کسی قسم کی جھجک سے بغیر اندر داخل ہو گیا۔ رام داس ایک وسیع کمرے میں شہر کے چند سرکردہ برہمنوں اور کھشتریوں کے درمیان بیٹھا اُن سے باتیں کر رہا تھا۔ گفتگو کا موضوع مادھو کا بلیدان تھا۔

لالو نے کچھ دیر دروازے سے باہر کھڑے ہو کر یہ باتیں سنیں اور پھر مکان میں اِدھر اُدھر پھر کر رندھیر کو تلاش کرنے لگا۔

رندھیر کی کوٹھڑی تلاش کرنے میں اسے دیر نہ لگی لیکن دروازے کو قفل لگا ہُوا تھا اور باہر ایک پہرے دار کھڑا تھا۔

کچھ دیر سوچنے کے بعد لالو کے ذہن میں ایک تدبیر آئی اور اس نے پہریدار کے پاس جا کر کہا: "سردار نے تمہیں بلایا ہے۔"

پہریدار رام داس کے کمرے کی طرف چل دیا اور لالو نے جلدی سے دروازے کے قریب جا کر رندھیر کو آواز دی۔

"کون ہے؟" رندھیر نے اندر سے پوچھا۔

لالو نے جواب دیا "باتوں کا وقت نہیں۔ سنو آج کالی دیوی کے مندر میں مادھو کا بلیدان دیا جائے گا۔ مجھے شانتا نے بھیجا ہے وہ سانپ کے زہر سے مر رہی ہے اس نے مجھے اپنی انگوٹھی دے کر تمہارے پاس بھیجا ہے اور وہ کہتی تھی میرے بھائی کی جان بچاؤ۔ یہ لو میں اسے کواڑ کے نیچے سے اندر پھینک رہا ہوں۔"

رندھیر نے جلدی سے کہا: "ٹھہرو! ٹھہرو!! انگوٹھی اندر مت پھینکو۔ تم اگر میرے پتا کے پاس جا سکتے ہو تو یہ انگوٹھی ان کے پاس لے جاؤ۔ اُن سے کہو۔ یہ ان کے دوست کی آخری نشانی ہے۔ اس پر جس شخص کا نام ہے۔ وہ مادھو کا باپ ہے۔"

پہریدار بڑبڑاتا ہُوا واپس آ رہا تھا اور لالو اسے دیکھ کر برآمدے کے ستونوں کے پیچھے چھپتا ہُوا بڑے کمرے کی طرف کھسک آیا۔

رام داس کے کمرے میں لوگوں کی تعداد اب پہلے سے زیادہ ہو چکی تھی۔ لالو کو پیام رسانی کا فرض ادا کرنا مشکل نظر آیا۔ تھوڑی دیر وہ دروازے میں کھڑا موقع ملنے کا انتظار کرتا رہا۔ اتنے میں ایک شخص بھاگتا ہُوا کمرے میں داخل ہُوا اور اس نے سردار سے کہا۔ مہاراج! پروہت جی پہنچ گئے۔ مندر میں آپ کا انتظار ہو رہا ہے۔"

رام داس نے حاضرین سے مخاطب ہو کر کہا "آپ چلیں! میں ابھی آتا ہوں۔" لوگ یکے بعد دیگرے نکل آئے۔ رام داس نے ایک شخص کو ہاتھ کے اشارے سے روک لیا اور آہستہ سے کہا "گوپال میں شاید وہاں نہ آؤں۔ مجھ سے یہ تماشا نہ دیکھا جائے گا، پروہت سے کہہ دینا میرا زیادہ دیر انتظار نہ کرے۔"

گوپال "بہت اچھا" کہہ کر چل دیا لیکن دروازے کے قریب پہنچ کر پھر واپس مڑا اور کہنے لگا:

"مہاراج! آپ نے اس لڑکے کو نہیں دیکھا؟"

رام داس نے جواب دیا "نہیں میں نے سنا ہے کہ وہ بہت خوش شکل نوجوان ہے۔"

"مہاراج! اس کی شکل سکھدیو جیسی ہے۔"

"سکھدیو جیسی؟"

"ہاں مہاراج" گوپال یہ کہہ کر مکان سے باہر نکل آیا اور رام داس کمرے میں ٹہلنے لگا۔ لالو چپکے سے اندر داخل ہُوا۔

رام داس اسے دیکھتے ہی چلّایا "تم کون ہو؟ جاؤ یہاں سے؟"

"مہاراج! ..... یہ ..... انگوٹھی" لالو نے اپنا فقرہ پورا کیے بغیر انگوٹھی

رام داس کے ہاتھ میں تھما دی۔ رام داس نے انگوٹھی لے کر بے پروائی سے ایک طاقچے میں رکھ دی۔

لالو نے پھر بولنے کی جرأت کی "مہاراج! یہ آپ کے دوست کی . . . !"

رام داس نے اس کا کان پکڑ کر دروازے سے باہر نکالتے ہوئے کہا "جس کی ہوگی اسے مل جائے گی۔ میرے کان نہ کھاؤ۔"

لالو نے آخری بار ہمت کی "مہاراج یہ . . . . !"

"بھاگ جاؤ یہاں سے۔ ارے کوئی ہے؟"

لالو شکست خوردہ سا ہو کر وہاں سے چل دیا اور برآمدے کے ایک ستون کے قریب کھڑا ہو کر نئی نئی تدابیر پر غور کرنے لگا۔ تھوڑی دیر میں ایک شخص شور مچاتا ہوا مکان کے اندر داخل ہوا۔

"مہاراج! مہاراج!! غضب ہو گیا!!!"

رام داس چیخ پکار سن کر ہاتھ میں تلوار لیے کمرے سے باہر نکلا اور اس نے پوچھا "کیا ہوا؟"

"مہاراج! غضب ہو گیا۔ شہر میں ایک شودر گھس آیا ہے اس کے ہاتھ میں تلوار ہے۔ سپاہیوں نے اسے روکا لیکن وہ کہتا تھا میں تمہارے سردار سے ملنا چاہتا ہوں۔ وہ دو سپاہیوں کو زخمی کر چکا ہے۔ ایک سپاہی کی تلوار اس کے سینے میں لگی لیکن اسے معلوم بھی نہیں ہوا۔ مہاراج! وہ راکشس ہے۔ وہ اس طرف آ رہا ہے اسے روکنے والا کوئی نہیں۔ شہر کے تمام آدمی مندر میں جا چکے ہیں۔ سرکار دہ اکیا: وہ آگیا!!"

لالو نے باہر کے دروازے کی طرف دیکھا۔ ایک شخص خون آلود تلوار ہاتھ میں لیے آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا اس کی طرف آ رہا تھا۔ یہ بدھو تھا۔ اس کے پاؤں

لڑکھڑا رہے تھے اور برہنہ سینے سے خون کی دھار بہہ رہی تھی۔ اس کے ہونٹ بھینچے ہوئے تھے اور آنکھوں سے مظلومیت ٹپک رہی تھی۔

رام داس نے کہا "ٹھہرو! تم کون ہو؟" اور تلوار سونت کر آگے بڑھا۔

بدھو اسے سر کی جنبش اور ہاتھ کے اشارے سے سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ اس کے ساتھ لڑنے کے ارادے سے نہیں آیا۔ اس کی آنکھوں کی خاموش فریاد سے متاثر ہو کر رام داس نے پوچھا "تم یہاں کیوں آئے ہو؟"

بدھو کے بھینچے ہوئے ہونٹوں میں ایک خفیف سی جنبش ہوئی۔ اس نے پوچھا "تم رام داس ہو؟"

"ہاں کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"مادھو، سکھدیو کا بیٹا ہے۔ رندھیر کو معلوم ہے، اسے بچاؤ! اسے بچاؤ!! وہ سکھدیو کا بیٹا ہے اسے!!!"

آخری الفاظ آہستہ آہستہ چند بار دہرانے کے بعد اس کے منہ سے خون کی دھار بہہ نکلی اور وہ نیچے گر پڑا۔ اس کے ہونٹ بدستور ہل رہے تھے۔ وہ بیہوشی کی حالت میں "اسے بچاؤ! اسے بچاؤ" دہرا رہا تھا۔ اس کی آواز خفیف سے خفیف تر ہو رہی تھی یہاں تک کہ صرف ہلتے ہوئے ہونٹ نظر آ رہے تھے اور آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ بدھو نے ایک جھرجھری لی اور اس کے ہونٹ آخری بار ایک دوسرے سے جدا ہوئے۔ میدانِ ہستی کا تھکا ہوا مسافر ملکِ عدم پہنچ چکا تھا لیکن بے جان آنکھیں ابھی تک رام داس کے چہرے پر اپنی فریاد کا اثر ڈھونڈ رہی تھیں۔ لالو اپنے آنسو ضبط نہ کر سکا۔

---

(۳۱)

بدھو کی موت نے رام داس پر بھی ایک گہرا اثر کیا۔ کچھ دیر بدھو کو پہچاننے کی ناکام کوشش کے بعد وہ تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا رندھیر کی کوٹھڑی کی طرف بڑھا اور پہریدار کو کوٹھڑی کا دروازہ کھولنے کا حکم دیا۔

دروازہ کھلتے ہی رندھیر لپک کر باہر نکلا اور رام داس کی طرف غصہ، نفرت اور حقارت سے دیکھتے ہوئے بولا:

"پتاجی! اب تو آپ کا کلیجہ ٹھنڈا ہو گیا ہو گا لیکن میں پوچھتا ہوں کیا انصاف یہی تھا۔ سماج کا قانون توڑنے والا آپ کا بیٹا تھا لیکن بلیدان کے لیے آپ نے ایک ایسے بے گناہ شخص کو منتخب کیا جس کے خون کا ہر قطرہ صدیوں تک سماج کے ماتھے پر بدنامی کا داغ بن کر چمکتا رہے گا۔"

"رندھیر! میرے ساتھ آؤ" رام داس نے یہ کہہ کر رندھیر کا بازو پکڑ لیا اور اسے اس جگہ لے آیا جہاں بدھو پڑا ہوا تھا۔ رام داس نے بدھو کی لاش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے رندھیر سے پوچھا "اسے جانتے ہو، یہ کون ہے؟"

رندھیر کچھ دیر بے حس و حرکت کھڑا بدھو کی لاش کی طرف دیکھتا رہا۔ بالآخر اس نے پُرنم آنکھیں اوپر اٹھائیں اور رام داس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

"پتاجی! یہ آپ کی دوسری فتح ہے ـــــ میں اسے جانتا ہوں۔"

ان الفاظ کے ساتھ رندھیر کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب اُمڈ آیا۔

بدھو کی تلوار اس کے ساتھ پڑی ہوئی تھی۔ رندھیر نے اس کا دستہ پہچان لیا اور اٹھا کر رام داس کو پیش کرتے ہوئے کہا:

"پتاجی! یہ مادھو کے باپ اور آپ کے دوست کی دوسری نشانی ہے۔

انگوٹھی میں نے آپ کو بھیج دی تھی۔"

رام داس نے تلوار ہاتھ میں پکڑ لی اور پوچھا "کونسی انگوٹھی؟"

رندھیر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا اور لالو اس کا مطلب سمجھ کر بھاگتا ہوا کمرے میں جا کر انگوٹھی لے آیا اور بولا "مہاراج یہ ہے۔ میں نے ابھی آپ کو دی تھی لیکن آپ نے اسے طاقچے میں پھینک دیا تھا۔"

رام داس دوسرے ہاتھ میں انگوٹھی پکڑ کر جواب طلب نگاہوں سے رندھیر کی طرف دیکھنے لگا۔

رندھیر نے کہا "پتاجی! اس انگوٹھی پر سکھدیو کا اور اس تلوار پر آپ کا نام لکھا ہوا ہے۔"

رام داس نے یکے بعد دیگرے تلوار کے دستے اور انگوٹھی کی طرف دیکھا اور دونوں چیزیں اس کے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے گر پڑیں۔ اضطراری حالت میں اس کے منہ سے یہ الفاظ نکلے۔

"اُف بھگوان! کیا یہ ممکن ہے؟" اس نے رندھیر کی طرف دیکھا اور کہا:

"رندھیر! تمہیں یقین ہے کہ وہ سکھدیو کا بیٹا ہے؟"

رندھیر نے جواب دیا "پتاجی! اب میرے یقین دلانے سے کیا ہو گا کاش آپ مجھے کل رات بات کرنے کا موقع دیتے۔ اب جو ہونا تھا سو ہو چکا۔"

رام داس نے کہا "نہیں! ابھی کچھ نہیں ہوا۔ وہ ابھی تک زندہ ہے میں اسے بچا سکتا ہوں" میں اسے بچاؤں گا۔"

یہ کہہ کر رام داس اصطبل کی طرف بھاگا۔ رندھیر نیچے پڑی ہوئی تلوار اور لالو انگوٹھی اٹھا کر پیچھے بھاگے۔

چند لمحوں کے بعد رام داس اور رندھیر گھوڑوں کی ننگی پیٹھ پر سوار مندر کا

رُخ کر رہے تھے۔ لالو رندھیر کے ساتھ چمٹا ہوا تھا۔

---

(۴)

کالی دیوی کی مورتی کے پجاری اس کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔ مادھو کو رسیوں میں جکڑ کر مورتی کے سامنے لٹا دیا گیا تھا۔ ایک پجاری اس کے سر پر چمکتا ہوا برچھا لیے کھڑا تھا۔ پروہت مقدس زبان میں کوئی بھجن گا رہا تھا۔

مادھو کے چہرے پر خوف کی بجائے ایک غیر معمولی عزم و استقلال تھا۔ اس کی آنکھیں ایک ایسے سکون کی آئینہ دار تھیں جو ایک مسافر کو لمبے اور تکلیف دہ سفر کے بعد منزلِ مقصود پر پہنچ کر حاصل ہوتا ہے۔ وہ ہر لمحہ دنیا سے دور اور بھگوان سے نزدیک جا رہا تھا۔ وہ دنیا کے ہر کام میں بھگوان یا کائنات کی ایک زبردست طاقت کی مرضی کا قائل ہو چکا تھا۔ موہنی کے تصور سے اس کے دل میں زندہ رہنے کی خواہش اسے تھوڑی دیر کے لیے پریشان کر دیتی۔ لیکن وہ ہر بار اپنے دل کو یہ کہہ کر تسلی دینے کی کوشش کرتا کہ موہنی اس کے پرواز کی آخری منزل نہ تھی وہ صحیح منزلِ مقصود کی طرف رہنمائی کرنے والا ایک روشن ستارہ تھا۔

جب جلاد برچھا لے کر سر پر کھڑا ہو گیا تو ایک لمحہ کے لیے اس کے جسم پر کپکپی طاری ہو گئی لیکن اس نے فوراً اپنے دل کو یہ کہہ کر تسلی دی کہ اب ڈرنے یا کانپنے سے کچھ نہیں بنے گا۔ اگر بھگوان تجھے زندہ رکھنا چاہتا ہے تو یہ برچھا تیرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ اور اگر اسے تیرا رہنا منظور نہیں تو دنیا کی کوئی طاقت تجھے نہیں بچا سکتی۔

بھجن گانے والے پروہت کی آواز بلند ہوتی اور تماشائی "کالی دیوی کی

جے"۔ "کالی دیوی کی جے" کے نعرے لگانے لگے۔ پجاری دونوں ہاتھوں سے برچھا بلند کر کے پروہت کے اشارے کا انتظار کرنے لگا۔ اپنے تمام عزم و استقلال کے باوجود مادھو موت کو اس قدر قریب سے دیکھنے کی ہمت نہ کر سکا اور اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

لالو بھاگتا ہوا مندر میں داخل ہوا۔ اس نے بلند آواز میں کہا: "ٹھہر جاؤ! ٹھہر جاؤ!! مہاراج آ رہے ہیں۔"

پروہت کی آواز گلے میں رک گئی اور پجاری کا برچھا نیچے جھک گیا۔ لوگ مڑ مڑ کر دروازے کی طرف دیکھنے لگے۔ اتنی دیر میں رام داس اور رندھیر مندر میں داخل ہو چکے تھے۔ لوگ ایک دوسرے سے کانا پھوسی کرنے لگے۔ رام داس کچھ کہے بغیر لوگوں کو ادھر ادھر ہٹاتا ہوا مورتی کے قریب پہنچا اور مادھو کو دیکھ کر لوگوں کی طرف متوجہ ہوا۔

"تم سب اپنے اپنے گھر چلے جاؤ آج بلیدان نہیں ہو گا۔"

دن کی روشنی اگر رات کی تاریکی میں تبدیل ہو جاتی تو بھی شاید لوگ اس قدر بدحواس نہ ہوتے

پروہت نے سراسیمگی کی حالت میں رام داس کی طرف دیکھا اور کہا: "مہاراج! بلیدان کی تمام رسمیں پوری ہو چکی ہیں۔ اب اسے روکنا نہ آپ کے اختیار میں ہے نہ ہمارے بس میں۔"

"مجھے ظلم کی روک تھام کا ہر وقت حق ہے۔" یہ کہتے ہوئے رام داس تلوار سے مادھو کے ہاتھ پاؤں کی رسیاں کاٹنے لگا۔

کالی دیوی کے مندر کا پروہت کچھ مرعوب ہو گیا لیکن بڑے مندر کے پروہت نے آگے بڑھ کر کہا: "مہاراج! آپ کیا کر رہے ہیں۔ یہ دھرم کی عزت کا معاملہ ہے۔"

رام داس نے بدستور رسّیاں کاٹتے ہوئے جواب دیا: "دھرم کی عزت بے انصافی میں نہیں انصاف میں ہے۔"

پروہت بولا: "مہاراج! کیسی بے انصافی! اس نے بھجن سنے۔ اس نے مورتیاں چرائیں اور برہمنوں کی پنچائت نے اس کے متعلق جو فیصلہ کیا تھا آپ اس سے بھی متفق تھے۔ اب آپ یہ کیا کر رہے ہیں یہ دیوی کے مندر کی توہین ہے۔"

ارجن نے آگے بڑھ کر کہا "نہیں! دیوی کی توہین نہیں ہو گی بلیدان ضرور ہو گا۔"

عوام بھی شور مچانے لگے "ضرور ہو گا۔ ضرور ہو گا۔"

رام داس مادھو کی تمام رسّیاں کاٹ چکا تھا وہ ارجن کی طرف دیکھ کر ذرا سخت لہجے میں بولا: "ارجن! تم جانتے ہو کہ یہ بے قصور ہے۔ اس نے مورتیاں نہیں چرائیں۔ تم یہ بھی جانتے ہو کہ یہ مورتیاں کس کی ہیں؟ میں تمہاری عزت کے لیے سب کچھ کر سکتا ہوں لیکن اس پر ظلم نہیں کر سکتا۔"

ارجن نے ندامت سے آنکھیں جھکا لیں لیکن لوگ بدستور شور مچا رہے تھے۔ "بلیدان ضرور ہو گا۔ بلیدان ضرور ہونا چاہیئے۔"

شہر کا سرکردہ برہمن جو راجہ کے دربار کے بڑے پروہت کا رشتہ دار تھا بولا: "مہاراج! آپ کو دھرم کی باتوں میں دخل دینے کا حق نہیں۔ آپ اسے یہاں سے نہیں لے جا سکتے۔ اگر آپ نے زبردستی کی تو ہم سب راجہ کے پاس جائیں گے۔"

رام داس نے جواب دیا "میں انصاف کے معاملے میں کسی سے نہیں ڈرتا۔ مجھے معلوم ہو چکا ہے کہ وہ مورتیاں اس نے خود بنائی ہیں مندروں سے نہیں چرائیں۔"

"مہاراج! آپ کے پاس کیا ثبوت ہے کہ مورتیاں اس نے خود بنائی ہیں؟"

رام داس نے کہا: "رندھیر! تم بتاؤ!"

رندھیر بولا: "میں نے اسے اپنی آنکھوں سے جھیل کے کنارے مورتی تراشتے دیکھا تھا۔"

"اور بھجن؟"

رام داس نے کہا: "جو لوگ اس پر بھجن گانے کا الزام لگاتے ہیں میں انہیں قابلِ اعتماد نہیں سمجھتا۔ رندھیر! اسے لے جاؤ۔"

برہمن سردار کے مقابلے میں اپنی شکست برداشت نہ کر سکے۔ وہ مندر میں جمع ہونے والے لوگوں کو بے حسی اور بزدلی کا طعنہ دے کر اکسانے لگے نصف سے زیادہ کھشتری ان کے طرف دار بن گئے۔

بڑے مندر کے پروہت نے کہا "مہاراج! اب ہمیں اس سے بحث نہیں کہ یہ بے گناہ ہے یا گنہگار۔ اب تمام رسمیں پوری ہو چکی ہیں اور بلیدان کسی حالت میں بھی نہیں رک سکتا۔"

کھشتریوں کو برہمنوں کا ساتھ دیتے ہوئے دیکھ کر رام داس کو صدمہ ہوا اس نے کہا: "بہت اچھا! بلیدان ہو گا۔"

مندر میں کالی دیوی کی جے! اور مہاراج کی جے!! کے نعرے بلند ہوئے۔ رام داس نے ہاتھ کے اشارے سے لوگوں کو خاموش کیا اور کہا: "لیکن بلیدان اس کا نہیں بلکہ میرا ہو گا۔"

بیسیوں آوازیں ایک ساتھ نکلیں "آپ کا؟"

"ہاں! میرا۔" رام داس نے یہ کہہ کر دیوی کے سامنے بیٹھ کر سر جھکا دیا اور کہا اگر بلیدان اسی قدر ضروری ہے تو میں حاضر ہوں۔ پروہت جی! آپ تمام رسمیں پوری کر چکے ہیں۔ پجاری کو میری گردن کاٹنے کا حکم دیجئے۔ میں دیوی کے احترام کے لیے اپنی جان دے سکتا ہوں لیکن اسے ایک بے گناہ کے خون کے چھینٹوں سے

واعدا نہیں کر سکتا۔"

رام داس انسانی فطرت کی کمزوریوں سے واقف تھا۔ اس کا یہ حربہ کارگر ہُوا۔ برہمنوں کی زبان تھوڑی دیر کے لیے گنگ ہو گئی اور کھشتری پھر اس کے طرفدار بن گئے۔ ارجن نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اُٹھا لیا۔

رام داس نے پروہت کی طرف دیکھ کر کہا "پروہت جی! بس اتنی سی بات سے گھبرا گئے ہو؟"

یہ کہہ کر رام داس مادھو کا بازو پکڑ کر مندر سے باہر نکل آیا۔ رندھیر بھی اس کے ساتھ ہی نکلا۔ لوگ اس قدر بدحواس تھے کہ کسی کے دل میں ان کا راستہ روکنے کا خیال تک پیدا نہ ہُوا۔

مندر سے باہر نکل کر رام داس نے پوچھا "مادھو! سکھدیو کہاں ہے؟"

مادھو نے جواب دیا "انہیں مرے ہوئے مدت ہو گئی۔"

"تمہاری ماتا کا نام کنول ہے نا؟"

مادھو نے اثبات میں سر ہلایا۔

رام داس نے کہا "اچھا! اب تم فوراً گھر جاؤ۔ شہر کے لوگ تمہارا پیچھا کریں گے تم اپنی ماں اور بہن کو لے کر پہاڑوں کی طرف نکل جاؤ۔ ادھر دیکھو! اس پہاڑی کے دامن میں ایک چشمہ ہے۔ رات کے وقت وہاں پہنچ کر میرا انتظار کرنا۔ میں کل صبح سے پہلے وہاں پہنچ جاؤں گا۔ جلدی جاؤ وقت ضائع نہ کرو۔ ان لوگوں کا جوش زیادہ دیر ٹھنڈا نہیں رہے گا۔"

احسان مندی کے الفاظ مادھو کے سینے میں گھٹ کر رہ گئے اور وُہ کچھ کہے بغیر مندر کی چار دیواری سے باہر نکل کر بھاگنے لگا۔

رندھیر نے کہا "پتاجی! اگر آپ اجازت دیں تو میں وہاں سے ہو آؤں میں

ابھی آ جاؤں گا۔"

رام داس نے مسکراتے ہوئے رندھیر کی طرف دیکھا اور سوال کیا "مادھو کی بہن کا کیا نام ہے؟"

اس نے آنکھوں میں آنسو بھرتے ہوئے جواب دیا "شانتا۔"

رام داس نے کہا "رندھیر! اس وقت تمہارا وہاں جانا مناسب نہیں۔ تم میرے ساتھ چلو۔"

"لیکن پتاجی! وہ مر رہی ہے۔"

"کون شانتا! کیا ہُوا اسے؟"

رندھیر اس سوال کا جواب دینا چاہتا تھا لیکن مندر سے چند برہمن شور مچاتے ہوئے باہر آ رہے تھے۔ رام داس نے کہا "اچھا تم جاؤ لیکن مجھے جلد اطلاع دینا۔"

رندھیر بھاگتا ہُوا مندر سے باہر نکلا وہ درخت سے اپنا گھوڑا کھول رہا تھا کہ لالو بھاگتا ہُوا آیا۔ اس نے پوچھا "آپ شہر جائیں گے؟"

"نہیں، میں کہیں اور جا رہا ہوں۔" یہ کہہ کر رندھیر گھوڑے پر سوار ہو گیا، لیکن لالو نے اس کی باگ پکڑ لی اور کہا "مجھے معلوم ہے کہ آپ شانتا کو دیکھنے کے لیے جا رہے ہیں لیکن وہ اپنے گھر پر نہیں۔ مجھے ساتھ لے چلیے۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ کہاں ہے؟"

"اچھا میرے پیچھے بیٹھ جاؤ! لیکن تم ہو کون؟ اور شانتا کو کیسے جانتے ہو؟ اور جب تم انگوٹھی لائے تھے وہ تمہیں کہاں سے ملی تھی؟"

لالو جواب دیے بغیر چھلانگ مار کر رندھیر کے پیچھے بیٹھ گیا اور جب گھوڑا سرپٹ دوڑنے لگا تو اس نے کہا "میں آپ کو ایک خوش خبری سناؤں؟"

رندھیر نے جواب دیا: "اس وقت مجھے کوئی خبر خوش نہیں کر سکتی۔ کہو کیا کہتے ہو؟"

لالو نے کہا: "بات دراصل یہ ہے کہ شانتا بالکل تندرست ہے۔"

رندھیر کا دل خوشی کے سمندر میں غوطے کھانے لگا۔ اس نے گھوڑے کی باگیں کھینچتے ہوئے مڑ کر لالو کی طرف دیکھا اور کہا: "بھگوان کے لیے سچ سچ بتاؤ!"

لالو نے کہا: "بات یہ ہے کہ میں نے آپ سے جھوٹ بولا تھا۔"

"لیکن تم وہاں گئے کب؟"

"میں وہیں رہتا ہوں۔"

"وہاں؟"

"ہاں۔"

"تو کیا تم شہر میں نہیں رہتے؟"

"نہیں۔"

"تم کھشتری نہیں؟"

"نہیں۔"

"تو تم کون ہو؟"

"پہلے آپ وعدہ کریں کہ آپ مجھے گھوڑے سے نیچے نہیں پھینک دیں گے؟"

"وہ کیوں؟"

"میں ایک شودر ہوں۔"

"شودر! لیکن تمہارا لباس تو ۔ ۔ ۔ ۔ ؟"

"یہ سب آپ لوگوں کی دَیا ہے۔"

"مجھے تمہاری باتوں پر یقین نہیں آتا۔ تمہاری زبان بھی شہر کے لوگوں سے

ملتی ہے۔"

"اگر میں آپ کی طرح باتیں کرنا نہ سیکھتا تو اس قدر آزادی کے ساتھ آپ کے گھروں اور مندروں میں نہ پھر سکتا۔"

"تم بہت نڈر معلوم ہوتے ہو" یہ کہہ کر رندھیر نے گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔ جھیل کے قریب پہنچ کر رندھیر کو مادھو بھاگتا ہوا نظر آیا۔ اس نے اس کے قریب پہنچ کر گھوڑا روکتے ہوئے لالو سے کہا:

"دیکھو ابھی اسے بدھو کے متعلق نہ بتانا۔"

"بہت اچھا" لالو نے جواب دیا۔

اعتراف

غروبِ آفتاب سے کچھ دیر پہلے رام داس اور رندھیر اپنے مکان کے صحن میں بڑ کے درخت کے نیچے ایک چبوترے پر بیٹھے ہوئے تھے۔ رندھیر اسے اپنی سرگزشت سنا رہا تھا۔ جب وہ بچپن کی ابتدائی ملاقات سے لے کر جوانی کی آخری ملاقاتوں تک تمام واقعات بیان کر چکا تو رام داس نے کہا: "رندھیر! سچ کہو شانتا واقعی بہت خوب صورت ہے؟"

"پتا جی۔۔۔۔!" رندھیر نے شرما کر آنکھیں جھکا لیں۔

رام داس پھر بولا: "سکھدیو اور کنول کی بیٹی یقیناً خوبصورت ہو گی ـــ اچھا یہ بتاؤ کہ تم واقعی اس سے پریم کرتے ہو؟"

رندھیر نے جھجک کر آنکھیں اوپر اٹھائیں اور جواب دیا "پتا جی! ۔۔۔۔۔ میں ۔۔۔۔ میں ۔۔۔۔ اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔"

"تم جانتے ہو کہ تمہیں سکھدیو کی طرح تمام عمر کانٹوں پر چلنا پڑے گا۔ ان شہروں اور ان خوب صورت محلات کے دروازے تم پر ہمیشہ کے لیے بند ہو جائیں گے۔"

"پتا جی! میں اس کے لیے تیار ہوں۔"

"رندھیر! اگر میں یہ کہوں کہ تم اس لڑکی کا خیال چھوڑ دو تو؟"

"پتا جی! پھر میں یہ کہوں گا کہ آپ اپنے ہاتھوں سے میرا گلا گھونٹ دیجئے۔"

"اب وہ کافی دور جا چکے ہوں گے؟"

"ہاں پتا جی! میرا خیال ہے کہ وہ آدھا راستہ طے کر چکے ہوں گے۔"

"شانتا اب بالکل تندرست ہے نا؟"

"ہاں پتا جی! اس لڑکے نے جھوٹ بولا تھا۔"

"وہ تھا کون؟"

رندھیر نے اس سوال کے جواب میں لالو کے متعلق اپنی تازہ معلومات ظاہر کر دیں۔

رام داس نے کچھ سوچنے کے بعد سوال کیا: "رندھیر! تمہیں یقین ہے کہ موہنی مادھو سے پریم کرتی ہے؟"

"مجھے یقین ہے۔"

"اسے معلوم ہے کہ مادھو سکھدیو کا بیٹا ہے؟"

"نہیں۔ شاید اسے معلوم نہیں۔"

رام داس پھر سوچ میں پڑ گیا۔

موہنی بھاگتی ہوئی مکان میں داخل ہوئی اور رام داس کے قریب پہنچ کر اس نے کہا: "چچا جی! چچا جی!! انہیں بچائیے۔ پتا جی شہر کے بہت سے لوگوں کو ساتھ لے کر ان پر دھاوا بولنے کا ارادہ کر رہے ہیں۔ ابھی وہ گھر پر ہیں۔ شہر کے تمام برہمن بھی ہمارے گھر جمع ہیں۔"

رام داس نے جان بوجھ کر بے پروائی سے جواب دیا "تو میں کیا کروں؟"

"چچا! آپ شہر کے سردار ہیں۔ پتا جی کو آپ منع کر سکتے ہیں۔ آپ نے اس کا بلیدان ہونے سے بچایا ہے۔ کیا اب اسے قتل ہوتا دیکھ کر خاموش رہیں گے؟"

"بیٹی! تمہیں اس کی فکر کیوں ہے۔ کرموں کا لکھا کون مٹا سکتا ہے؟"

موہنی، رام داس سے مایوس ہو کر رندھیر کی طرف متوجہ ہوئی۔ "رندھیر! تم ہی کچھ کرو۔ وہ اسے زندہ جلا دینا چاہتے ہیں۔ بھگوان کے لیے جاؤ۔"

رندھیر کے چہرے پر تشویش کی بجائے اطمینان کے آثار دیکھ کر موہنی نے کہا: "تو یہ سب کچھ دکھاوا تھا۔ تمہارے سینے میں بھی وہی دل ہے جو دوسرے لوگوں کے سینوں میں ہے۔ تم بزدل ہو۔" ان الفاظ کے ساتھ موہنی کی آنکھوں سے آنسو نکلے۔ رام داس چبوترے سے اٹھ کر نیچے اُترا۔ اور پیار سے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر بولا: "بیٹی! ایک شودر کے ساتھ اس قدر ہمدردی۔"

موہنی نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا: "مجھے معلوم نہ تھا کہ پتا جی کی طرح آپ بھی ایک شودر کو انسان نہیں سمجھتے۔"

"بیٹی! مجھے معلوم نہ تھا کہ تم اس سے اس قدر پریم کرتی ہو۔ میں تمہاری مدد کروں گا۔"

"میں صرف اس کی جان بچانا چاہتی ہوں۔ وہ بے گناہ ہے۔"

"اب اس کی جان کو کوئی خطرہ نہیں۔ وہ اب بہت دُور ہو چکا ہے۔"

"بہت دُور کہاں؟"

"پہاڑوں میں۔"

"موہنی کے چہرے پر مسرت اور غم کی لہریں ایک دوسرے کا تعاقب کرنے لگیں۔ دل ایک بار دھڑکا اور بیٹھ گیا۔ آنکھوں کے چراغ ایک لمحہ کے لیے روشن ہوتے اور بُجھ گئے۔ اس کے ہونٹوں سے درد کی گہرائیوں میں ڈوبی ہوئی آواز نکلی "تو آپ، آپ نے اسے جلا وطن کر دیا؟"

رام داس نے جواب دیا۔ "اس کی جان بچانے کے لیے یہ ضروری تھا کہ اسے کہیں دُور بھیج دیا جائے۔"

"دُور کس جگہ؟"

"بس کسی ایسی جگہ، جہاں شہر کا کوئی آدمی نہ پہنچ سکے۔"

موہنی کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہونے لگیں۔

رام داس نے کہا: "ہائیں! تم اب بھی رو رہی ہو۔ اب تو تمہارے غم کی کوئی وجہ باقی نہیں رہی۔ وہ زندہ ہے اس کی جان کو کوئی خطرہ نہیں۔ اس سے زیادہ تم کیا چاہتی ہو؟"

موہنی نے رام داس کو کوئی جواب دینے کی بجائے رندھیر کی طرف متوجہ ہو کر پوچھا "کیا اس کی ماتا اور شانتا بھی اس کے ساتھ ہیں؟"

رام داس نے رندھیر کو جواب دینے کا موقع نہ دیا اور کہا: "ہاں! وہ بھی اس کے ساتھ ہیں اور رندھیر بھی اس کے پیچھے جانے والا ہے۔ یہ اس لڑکی کے لیے ہمیں تیاگ چکا ہے۔"

موہنی نے بے اختیار رام داس کے پاؤں پر گرتے ہوئے کہا: "چچا! میں بھی رندھیر کے ساتھ جانا چاہتی ہوں۔ میں اُس کے لیے تمام دنیا کو تیاگ سکتی ہوں میں اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔"

رام داس نے موہنی کا بازو پکڑ کر کہا لیکن تمہارا پتا، تمہاری ماتا، ان سب کو چھوڑ دو گی؟"

"مجھے کسی کی پروا نہیں۔ موہنی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"لیکن دنیا کیا کہے گی؟"

"مجھے دنیا کی بھی پروا نہیں۔ چچا! مجھ پر دیا کرو ورنہ میں کہیں ڈوب مروں گی یا کسی پہاڑی پر چڑھ کر چھلانگ لگا دوں گی۔"

"اچھا بیٹی! تم جیتیں۔ اب تیار ہو جاؤ۔ رندھیر رات کے وقت شہر سے

باہر اس ٹیلے کے قریب جس کی چوٹی پر پیپل کا درخت ہے تمہارا انتظار کرے گا
تم دونوں کے لیے گھوڑے وہاں موجود ہوں گے لیکن کسی کو خبر نہ ہو۔"
اظہارِ تشکر کے لیے موہنی کی زبان موزون الفاظ تلاش نہ کر سکی۔ اس نے
احسان مندانہ نگاہوں سے رام داس کی طرف دیکھا اور چپکے سے دو آنسو بہا دیے۔

---

(۲)

رات کے وقت رام داس دیر تک مکان کی چھت پر ٹہلنے کے بعد چارپائی
پر لیٹ گیا۔ اس کے دل پر ایک ناقابلِ برداشت بوجھ تھا۔ اسے اپنا وسیع
مکان سُونا معلوم ہوتا تھا۔ آج سے دس برس پہلے رندھیر کی ماں کی وفات کے
بعد اس کی زندگی کی تمام دلچسپیاں اپنے اکلوتے بیٹے پر مرکوز تھیں۔ بچپن سے
لے کر اب تک رندھیر کی مختلف تصویریں اس کی آنکھوں کے سامنے آ رہی تھیں۔
وہ کم سن بچہ جو اس کی گود میں بیٹھ کر اپنے ننھے ہاتھوں سے اس کی مونچھیں پکڑ
کر قہقہے لگایا کرتا تھا جو اس کی انگلی منہ میں لے کر اپنے چھوٹے چھوٹے دانتوں
سے کاٹنے کی کوشش کرتا۔ لیکن اسے درد کی بجائے راحت ہوتی۔ وہ ہونہار
لڑکا جسے وہ شاہسواری۔ تیر اندازی اور تیغ زنی کے کرتب سکھایا کرتا تھا۔ اور
پھر وہ نوجوان جس کی ہر بات اسے دنیا بھر کے انسانوں سے نرالی نظر آتی تھی۔
رندھیر کی شکل میں بادشاہوں کا جلال اور دیوتاؤں کی پاکیزگی نظر آتی۔ دن میں کئی بار
اس کے منہ سے یہ الفاظ نکلتے "میرا بیٹا! میرا رندھیر!!"
رندھیر کی ماں موہنی کی ماں کی سہیلی تھی اور ارجن۔ رام داس کے بہترین دوستوں
میں سے تھا اس لیے رندھیر کے ساتھ ارجن اور ساوتری کی دلچسپی ایک قدرتی

بات تھی۔ وہ رندھیر اور موہنی کے مستقبل کا فیصلہ اپنے دل میں ایک مدت سے کر
چکا تھا لیکن تازہ واقعات کے غیر متوقع طوفان نے اس کی امیدوں کے چراغ بجھا
دیے تھے۔ شانتا کے ساتھ رندھیر کی محبت کا انکشاف اس کے لیے ناقابلِ برداشت
تھا۔ پھر بھی اسے امید تھی کہ وہ اس کی ڈانٹ ڈپٹ سے سمجھ جائے گا لیکن مادھو
اور شانتا کے باپ کا علم ہونے کے بعد اسے مایوسی کا آخری گھونٹ حلق سے اتارنا
پڑا۔ سکھدیو کے ساتھ پرانی محبت نے اسے پھر ایک بار سماج کا باغی بنا دیا۔ وہ
رندھیر اور موہنی کو رخصت کر چکا تھا۔
نوکر نے آج بھی حسبِ معمول رندھیر کا بستر اس کے قریب بچھا دیا تھا۔
رام داس نے لیٹے لیٹے ہاتھ بڑھا کر رندھیر کے خالی بستر سے تکیہ اٹھا کر سینے سے
لگا لیا۔ وہ آنکھیں جو ایک مدت سے آنسوؤں سے ناآشنا تھیں پُرنم ہو گئیں اس
نے درد بھری آواز میں کہا: "رندھیر! میرے بیٹے، تم آج جنگل میں کس طرح دن
گزارو گے تمہیں شاید پتھروں پر لیٹنا پڑے اور میں۔۔۔۔! . . . . . "
رام داس یہ کہہ کر اٹھا اور پھر آہستہ آہستہ ٹہلنے لگا۔ قریباً آدھی رات
کے وقت اس نے ایک نوکر کو آواز دے کر بلایا اور گھوڑا تیار کرنے کا حکم دیا۔ نوکر
یہ حکم سن کر چلا گیا اور تھوڑی دیر بعد آ کر کہنے لگا "سرکار گھوڑا تیار ہے لیکن ارجن
نیچے کھڑا آپ سے ملنا چاہتا ہے۔"
رام داس نے کہا: "اوپر لے آؤ" اور خود اپنی چارپائی پر بیٹھ گیا۔

---

(۳)

ارجن نے اوپر آتے ہی کہا "مہاراج! موہنی رات ہوتے ہی گھر سے نکلی تھی

ابھی تک نہیں آئی۔ میں تمام شہر میں اسے تلاش کر چکا ہوں۔ رندھیر کہاں ہے؟"

رام داس نے جواب دیا "رندھیر یہاں نہیں ہے تم بیٹھ جاؤ!"

"نہیں، میں بہت پریشان ہوں۔ رندھیر کب سے گھر میں نہیں؟"

رام داس نے کہا: "ارجن! تم بیٹھ جاؤ۔ میں تمہیں کچھ بتانا چاہتا ہوں۔"

ارجن نے پوچھا "تو موہنی کے متعلق آپ کو کوئی علم ہے؟"

"ہاں! بیٹھ جاؤ۔"

ارجن پریشان ہو کر بیٹھ گیا۔

رام داس نے کہا: "ارجن! تم سکھدیو کو بھولے تو نہیں ہو گے؟"

ارجن نے جواب دیا: "میں سکھدیو کو کیسے بھول سکتا ہوں لیکن اس بات کا موہنی سے کیا تعلق ہے؟"

رام داس نے جواب دیا: "ارجن! رندھیر اور موہنی ہمیں چھوڑ کر بھاگ گئے ہیں۔"

ارجن اٹھ کر کھڑا ہو گیا "بھاگ گئے؟" اس نے بدحواس ہو کر پوچھا۔

"ہاں! بھاگ گئے۔ رندھیر، سکھدیو کی لڑکی کے پیچھے اور موہنی اس کے لڑکے کے پیچھے۔"

"سکھدیو کی لڑکی اور لڑکا! میں آپ کی بات نہیں سمجھا۔ بھگوان کے لیے مجھے پریشان نہ کیجیے۔"

رام داس نے اٹھ کر ارجن کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "ارجن! میں سچ کہتا ہوں۔"

ارجن نے کہا "لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ کیا وہ اچھوت . . . ؟"

"ہاں وہ اچھوت سکھدیو کی لڑکی اور لڑکا تھے۔"

ارجن کچھ دیر بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ بالآخر غضب ناک ہو کر بولا ـــ

"نہیں! میں یہ نہیں مانتا۔ یہ جھوٹ ہے۔ وہ اچھوت ہیں۔ شہر کا ہر آدمی جانتا ہے کہ وہ اچھوت ہیں۔ تم اپنا دھرم چھوڑ چکے ہو اور اپنے بیٹے کو معاف کر سکتے ہو لیکن اگر موہنی اس بدمعاش کے ساتھ بھاگ گئی ہے تو میں قسم کھاتا ہوں کہ ان دونوں کو زندہ نہ چھوڑوں گا۔ میں آس پاس کی بستیوں کے تمام اچھوتوں کو قتل کروا دوں گا آج تم نے دوستی کا حق ادا کر دیا۔ اس ذلیل شودر نے میری عزت پر ہاتھ ڈالا اور تم اسے کالی دیوی کے مندر سے نکال لائے۔ مجھے بتاؤ وہ کہاں ہے؟ میں نے تمام بستیوں میں تلاش کر چکا ہوں۔ بے شک تم سردار ہو لیکن میں بے غیرت نہیں۔ میں صبح ہونے سے پہلے پہلے تمام شہر کے لوگوں کو اکٹھا کر کے شودروں کی بستیوں پر حملہ کر دوں گا۔ تم سردار ہو۔ تمہارے پاس سپاہی ہیں لیکن تم اس طوفان کا مقابلہ نہیں کر سکو گے۔"

عام حالات میں رام داس ایسے الفاظ برداشت کرنے کا عادی نہ تھا لیکن ارجن کی باتیں سن کر غصہ پی گیا اور نہایت نرمی سے بولا۔

"ارجن! تم جانتے ہو میں ڈرنے والوں میں سے نہیں۔ میں بے گناہوں کو ظلم سے بچانے کے لیے خون کا آخری قطرہ تک بہا دوں گا۔ لیکن تم میری بات پر یقین کرو۔ میں قسم کھاتا ہوں کہ وہ سکھدیو کا بیٹا ہے۔ میں اس کا ثبوت اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا ہوں۔ سکھدیو کو قید سے چھڑانے میں تم میرے ساتھ تھے اس نے باغیوں کے سردار کی لڑکی کے ساتھ شادی کر لی تھی۔ سکھدیو مر چکا ہے۔ لیکن اس کی بیوی اور بچے زندہ ہیں۔ وہ اس شہر کے نزدیک آ کر آباد ہو گئے۔ سماج نے ان کے لیے شہر کے دروازے ہمیشہ کے لیے بند کر رکھے تھے لیکن بھگوان کے کھیل نیارے ہیں۔ اس نے رندھیر اور موہنی کو ان کی جھونپڑی کا راستہ بتا دیا۔"

ارجن کا غصہ آہستہ آہستہ کم ہو رہا تھا۔ اس نے پوچھا "لیکن آپ کو کیسے

یقین ہُوا کہ وہ سکھدیو کے بچّے ہیں ؟"

رام داس نے جواب دیا "میں سکھدیو کی انگوٹھی اور وہ تلوار جو میں نے اسے قید سے نکال کر رخصت کرتے وقت دی تھی دیکھ چکا ہوں اور یہ تم بھی دیکھ چکے ہو کہ اس لڑکے کی شکل بالکل سکھدیو سے ملتی تھی۔"

ارجن نے کہا "پھر بھی میں موہنی کو قابلِ معافی نہیں سمجھتا۔ اس نے میرے منہ پر سیاہی تھوپی ہے۔ مجھے دنیا میں کہیں کا نہ چھوڑا۔ سکھدیو کا بیٹا ایک نیچ ذات عورت کے بطن سے پیدا ہُوا ہے۔ وہ چنڈال ہے۔"

رام داس نے کہا "ارجن! محبت اونچ نیچ نہیں دیکھتی۔ اس کا تعلق سماج سے نہیں۔ انسانیت سے ہے۔ تم ہی بتاؤ! ہمارے شہر میں اس لڑکے جیسی شکل و صورت کس کی ہے۔ تم کسی زمانے میں باغیوں کے سردار کی لڑکی کے ساتھ سُکھدیو کے عشق کو حق بجانب خیال کرتے تھے اور میری طرح یہ کہتے تھے کہ اُن دونوں کو بھگوان نے ایک دوسرے کے لیے بنایا ہے۔ میں آج بھی یہ کہتا ہوں کہ سکھدیو کے بیٹے اور تمہاری بیٹی کے ملاپ میں بھگوان کا ہاتھ ہے۔ وہ موہنی کے لیے سر کٹوانے کے لیے تیار تھا اور موہنی اس کے لیے دریا میں کُودنے اور پہاڑ سے چھلانگ لگانے کے لیے تیار تھی۔ مجھے تمہاری تکلیف کا احساس تھا لیکن جب مجھے یقین ہو گیا کہ موہنی اس کے لیے سب کچھ ہار بیٹھی ہے۔ میں اُس کا راستہ نہیں روک سکا۔ مجھے موہنی کا اتنا ہی دکھ ہے جتنا کہ رندھیر کا۔"

ارجن نے کہا "لیکن دنیا کیا کہے گی ؟"

"دنیا! میرے دوست۔ دنیا کی زبان آج تک کسی نے بند نہیں کی۔ تم دُنیا کو خوش کرنے کے لیے اپنے بچّوں کا بلیدان نہیں دیکھ سکتے۔"

"اور دھرم ؟"

"ہم دھرم کی آڑ لے کر فطرت کے خلاف جنگ کر رہے ہیں۔ انسانیت کا چہرہ مسخ کر رہے ہیں۔ ایک انسان کو دوسرے انسان سے نفرت اور حقارت کا سبق دے رہے ہیں۔ بھگوان کے بنائے ہوئے انسانوں کے درمیان اونچ اور نیچ کی دیواریں کھڑی کر رہے ہیں۔ ایسا دھرم نہ بھگوان کو خوش کر سکتا ہے اور نہ بھگوان کے بنائے ہوئے انسانوں کی بھلائی کر سکتا ہے۔"

ارجن تھوڑی دیر کے توقف کے بعد بولا "تم یہ باتیں اس لیے کر رہے ہو کہ رندھیر ایک مرد ہے تم اس کے گھر سے بھاگ نکلنے کے متعلق کئی بہانے تراش سکتے ہو۔ لیکن میں ایک لڑکی کا باپ ہوں۔ کل شہر کا ہر بچّہ اور بوڑھا مجھ سے موہنی کے متعلق پوچھے گا۔ میں انہیں کیا جواب دے سکوں گا ؟"

رام داس نے کہا "فرض کرو اگر وہ مایوسی کی حالت میں دریا میں کود جاتی یا پہاڑ سے چھلانگ لگا دیتی تو تم پوچھنے والوں کو کیا جواب دیتے ؟"

"رام داس! میری عزت بچاؤ! مجھے بتاؤ۔ وہ کہاں ہے ؟ میں اسے سمجھا لوں گا۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں اس کی خطا معاف کر دوں گا۔"

"ارجن! میں صرف یہ جانتا ہوں کہ وہ سکھدیو کے بیٹے کے ساتھ جا چکی ہے اور دنیا کی کوئی طاقت اس کا ارادہ تبدیل نہیں کر سکتی۔ ممکن ہے کہ اس کا دل تمہاری باتوں سے پسیج جائے اور وہ اپنی مرضی کے خلاف تمہارے ساتھ لوٹ آئے لیکن دوبارہ تمہارے گھر آنے کے بعد وہ ایک جیتی جاگتی موہنی نہیں ہو گی بلکہ ایک بے جان اور بے روح لاش ہو گی۔ میں جانتا ہوں کہ تم سماج کے قانون کی عزت کے لیے بڑی سے بڑی قربانی دے سکتے ہو لیکن اپنے دل سے پوچھو۔ جس میں سماج کے احترام سے زیادہ ایک باپ کی محبت کی دھڑکنیں ہیں ــــ کیا موہنی کا گھُل گھُل کر جان دینا تم برداشت کر سکو گے ؟ ارجن! میری بات کا جواب دو۔ کیا شادی

سے پہلے تمہیں اسی قوم کی ایک لڑکی سے محبت نہ تھی؟ اگر وہ تمہاری محبت کو ٹھکرا کر اپنے باپ کے ساتھ پہاڑوں میں نہ چلی جاتی تو تم اس کے لیے سماج کے ہر قانون کو توڑنے کے لیے تیار نہ تھے۔ کیا اب بھی تمہیں اس کا خیال کبھی کبھی پریشان نہیں کرتا۔ اگر وہ تمہارے ساتھ زندگی بسر کرنا منظور کر لیتی تو تم اچھوتوں کی جھونپڑیوں کو شہر کے محلات پر ترجیح دینے کے لیے تیار نہ تھے؟ یاد ہے میں تمہیں سمجھایا کرتا تھا اور تم مجھے اپنا دشمن خیال کرتے تھے کیا تم وہی ارجن ہو؟"

ارجن ایک زخم خوردہ انسان کی طرح نڈھال ہو کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے آج سے بیس سال قبل کے واقعات کی تصویریں گزر رہی تھیں۔ وہ سہانی صبح جب اس نے ایک شودر لڑکی کو دریا پر نہاتے دیکھا تھا۔ وہ چاندنی رات جب وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر یہ کہہ رہا تھا: "سنتی! میں تمہارے لیے سب کچھ چھوڑنے کے لیے تیار ہوں اور اس کے جواب میں اس کے بھولے بھالے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ بیس برس کے بعد پھر ایک بار اس کے کانوں میں گونج رہے تھے:

"نہیں! نہیں!! مجھے معلوم نہ تھا کہ تم راجہ کے سپاہی ہو۔ تمہاری گردن پہ ہماری قوم کے سینکڑوں بے گناہوں کا خون ہے۔ تم ہمارے دشمن ہو۔ میں تم سے پریم کرنے کی بجائے مرجانا بہتر سمجھتی ہوں۔ مجھے تمہاری کسی بات پر اعتماد نہیں۔"

رام داس نے کہا "کیوں ارجن! میں غلط تو نہیں کہتا؟"

ارجن چونک کر رام داس کی طرف متوجہ ہوا اور بولا: "رام داس! مجھے شرمندہ نہ کرو۔ وہ جوانی نادانی تھی میں اس وقت بے وقوف تھا۔"

نہیں! صرف تم ہی نہیں!! اس عمر میں ہر انسان بے وقوف ہوتا ہے۔

میں خود بھی اگر تمہاری یا سکھدیو کی جگہ ہوتا تو یہی کرتا۔ اور اگر رندھیر کی ماں کھشتری ہونے کی بجائے کسی اچھوت کے گھر میں جنم لیتی تو میں بھی اس کے لیے سماج کے کسی قانون کی پروا نہ کرتا۔ تم اسے جوانی کی نادانی کہتے ہو لیکن میں اسے فطرت کے قانون کی پیروی سمجھتا ہوں۔ قدرت جب دو دلوں کو ملانا چاہتی ہے تو اونچ نیچ کی دیواریں توڑ دیتی ہے۔ قدرت نے کسی کو بڑا اور کسی کو چھوٹا نہیں بنایا۔ ہمارے سماج کا یہ قانون فطرت کے قانون کے خلاف ایک بغاوت ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ سماج سے بغاوت موہنی اور رندھیر کے لیے ایک عارضی اذیت ہو گی لیکن سماج کے خوف سے اگر وہ فطرت کے قانون کو ٹھکرا دیتے تو ان پر ایک دائمی عذاب مسلط رہتا۔"

ارجن نے لاجواب سا ہو کر کہا "رام داس! مجھے معاف کرنا۔ میرے منہ سے چند تلخ باتیں نکل گئیں لیکن موہنی کی جدائی اور وہ بھی ہمیشہ کے لیے! اس کی ماں کا کیا حال ہو گا؟"

رام داس نے جواب دیا "ماں کو اپنے بچوں کی زندگی سے زیادہ کوئی شے عزیز نہیں ہوتی۔ موہنی کی ماں کے لیے اس سے بڑھ کر اچھی خبر اور کیا ہو سکتی ہے کہ موہنی زندہ ہے اور خوش ہے۔"

"لیکن اگر وہ اس سے ملنا چاہے تو پہاڑوں میں ہم اسے کہاں ڈھونڈ سکتے ہیں ——؟"

رام داس نے جواب دیا "اس بات کی ذمہ داری میں لیتا ہوں۔"

"وہ اس وقت کہاں ہے؟"

"اس وقت تم گھر جا کر بہن ساوتری کو تسلی دو۔ میں چند دنوں تک تم دونوں کو اس کے پاس لے چلوں گا۔ اگر کوئی پوچھے تو کہہ دینا۔ موہنی دریا کے پار اپنے

نانا کے پاس گئی ہے۔"

ارجن اٹھ کر نیچے اترنے لگا تو رام داس نے کہا: "ذرا ٹھہرو! میں ایک ضروری بات کہنا چاہتا ہوں۔"

ارجن مڑ کر اس کی طرف دیکھنے لگا اور رام داس بولا: "میں صبح کہیں جا رہا ہوں۔ شاید دوپہر تک نہ آسکوں۔ شہر کے بعض لوگ ابھی تک شودروں کے خلاف مشتعل ہیں۔ میرے واپس آنے تک شودروں کی بستیوں کی حفاظت تمہارے ذمے ہے۔"

ارجن نے پوچھا: "آپ کہاں جائیں گے؟"

رام داس نے جواب دیا: "ایک بُوٹی کی تلاش کے لیے۔ میرے گھٹنوں میں پھر درد ہوتا ہے۔"

رام داس کا یہ جواب ارجن کی تسلی نہ کر سکا۔ تاہم ساوتری کے خیال سے اس نے فوراً گھر پہنچنا ضروری سمجھا۔

ارجن کے جانے کے بعد رام داس نے محسوس کیا کہ اس کے دل سے ایک بھاری بوجھ اتر چکا ہے۔

تھوڑی دیر بعد وہ نیچے اترا اور تلوار اور تیر و کمان سے مسلح ہو کر گھوڑے پر سوار ہو گیا۔

صُبحِ اُمید

تقریباً آدھی رات تک رندھیر اور موہنی دشوار گزار پہاڑی راستوں میں اِدھر اُدھر بھٹکتے رہے۔ بالآخر انہیں ایک جگہ آگ نظر آئی اور رندھیر نے کہا "بس اب ہم پہنچ گئے۔ لالو کہتا تھا میں آگ جلا رکھوں گا۔ بہت ہوشیار لڑکا ہے۔"

موہنی نے پوچھا "لالو کون ہے؟"۔۔۔۔

رندھیر نے کہا "وہ ایک عجیب لڑکا ہے۔ اس کا دل شیر کا ہے۔ آنکھیں عقاب کی اور جسم چیتے کا ہے اور تم تو عمر بھر اس کے احسان کا بدلہ نہ دے سکو گی وہ ہم سے ایک لمحہ پہلے بھاگ کر پجاری کا ہاتھ نہ روکتا تو اُس کا چھُرا مادھو کی گردن کے قریب پہنچ چکا تھا۔"

"پھر بھی وہ ہے کون"

موہنی کے اس سوال کے جواب میں رندھیر نے تفصیل کے ساتھ لالو کے متعلق اپنی معلومات بیان کر دیں۔

موہنی نے کہا "میں اب سمجھی، پچھلے دنوں پتا جی چھت پر نئی چادر تان کر سو رہے تھے۔ صبح کے وقت اٹھے تو ان کا جوتا اور چادر غائب تھے۔ شاید یہ اسی کا کام ہو

اچانک ایک طرف سے آواز آئی: "دیوی! وہ چادر اس وقت بھی میرے پاس ہے لیکن جوتا میرے کسی کام نہیں آیا۔ تمہارے پتا کے پاؤں بہت بڑے ہیں۔"

رندھیر اور موہنی نے گھوڑے روک لیے اور تاریکی میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ

کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔ رندھیر نے کہا: "کون! لالو؟"

لالو نے قہقہہ لگاتے ہوئے آگے بڑھ کر رندھیر کے گھوڑے کی لگام پکڑ لی اور بولا: "کیوں جی آپ کہتے تھے آپ کو تمام راستے معلوم ہیں اگر میں آگ نہ جلاتا تو کیا بنتا ــــ اب یہاں اتر جائیے! آگے ڈھلان ذرا خطرناک ہے۔"

وہ دونوں نیچے اتر پڑے اور رندھیر نے موہنی کے گھوڑے کی لگام پکڑ لی اور لالو سے پوچھا۔ راستہ میں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟"

لالو نے جواب دیا "راستے میں تو کوئی تکلیف نہیں ہوئی لیکن میں نے یہاں پہنچ کر بدھو کے متعلق بتا دیا تھا۔ مادھو، اس کی ماں اور شانتا اب تک رو رہے ہیں۔"

---

(۲)

بوڑھا تیمو تھکاوٹ سے چور ہونے کی وجہ سے جلدی سو گیا تھا۔ لالو اب مویشیوں کے گرد پہرہ دے رہا تھا۔ کنول، رندھیر، موہنی، مادھو اور شانتا دیر تک بدھو کے متعلق باتیں کرتے رہے۔ کنول بار بار اس کی محبت، ایثار اور وفا کے واقعات بیان کر کے رو پڑتی اور رندھیر اسے بار بار تسلی دیتا۔ موہنی حیا کی وجہ سے زیادہ تر خاموش رہی۔ مادھو کے لیے اس کی آمد غیر متوقع تھی۔ اگر بدھو کی موت کا غم نہ ہوتا تو نہ معلوم موہنی کی آمد کا اس کے دل و دماغ پر کیا اثر ہوتا تاہم وہ بار بار اپنے دل سے یہ سوال کر رہا تھا کیا یہ ممکن ہے؟ کیا یہ سچ ہے؟ کیا یہ ایک خواب تو نہیں؟"

ان سب کے لیے بے آرامی کی یہ دوسری رات تھی۔ شانتا پچھلے پہر ایک پتھر پر سر رکھ کر سو گئی۔ موہنی بھی اونگھ رہی تھی اسے نیند کے خلاف جنگ کرتے ہوتے دیکھ کر کنول نے اس کا سر اپنے زانو پر رکھ کر کہا: "بیٹی سو جاؤ۔"

علی الصباح جب موہنی کی آنکھ کھلی تو کنول جھک جھک کر اسے چوم رہی تھی موہنی بانہیں پھیلا کر کنول کے ساتھ چمٹ گئی۔

"ماتا!"

"بیٹی!"

موہنی نے اظہارِ تشکر کے لیے دو آنسو بہا دیئے۔

رندھیر چشمے کے کنارے بیٹھا منہ ہاتھ دھو رہا تھا۔ شانتا بکری کے دودھ کا ایک پیالہ لے کر اس کے پاس پہنچی اور خاموش کھڑی ہو گئی۔ رندھیر اس کی موجودگی سے باخبر تھا لیکن وہ جان بوجھ کر دیر تک دوسری طرف دیکھتا رہا۔ بالآخر شانتا نے کہا "لیجئے۔"

رندھیر نے ایک شرارت آمیز تبسم کے ساتھ اس کی طرف دیکھا۔ شانتا مسکرائی اور رندھیر کو کائنات کے مغموم چہرے پر ایک دلفریب تبسم نظر آنے لگا۔

اس نے کہا: "پہلے موہنی کو پلا آؤ۔"

شانتا نے جواب دیا: "اسے ماتا نے اس وقت پلا دیا تھا جب آپ سو رہے تھے۔"

رندھیر نے پیالہ لے کر منہ سے لگا لیا۔ دودھ میں اس کے لیے آج ایک نئی مٹھاس، ایک نئی لذت تھی۔"

---

(۳)

تھوڑی دیر بعد رام داس آ پہنچا۔ لالو نے بھاگ کر اس کے گھوڑے کی لگام پکڑ لی۔ موہنی اور رندھیر نے آگے بڑھ کر اس کے پاؤں چھوئے اور ان کی دیکھا دیکھی

مادھو اور شانتا بھی اس کے پاؤں چھونے کے لیے آگے بڑھے۔ رام داس نے شانتا کے سر پر پیار سے ہاتھ رکھتے ہوئے کنول کی طرف دیکھا اور کہا: "بہن! مجھے پہچانتی ہو؟"

کنول نے اُس کی طرف احسان مندانہ نگاہوں سے دیکھا اور جواب دیا "بھلا میں آپ کو کیسے بھول سکتی تھی؟"

دونوں کچھ دیر خاموش کھڑے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔ بالآخر رام داس بولا: "بہن! یہ جگہ آپ کے لیے محفوظ نہیں۔ آپ کو فوراً یہاں سے دُور چلے جانا چاہیئے۔ اس اونچے پہاڑ کے دامن میں آپ کی قوم کے بہت سے لوگ آباد ہیں۔ کل تک آپ وہاں پہنچ جائیں گی۔ شاید راستے سے آپ واقف نہ ہوں لیکن اس پہاڑی کے پیچھے آپ کو کوئی نہ کوئی چرواہا یا شکاری ضرور مل جائیگا۔"

کنول نے جواب دیا: "میں اس علاقے کے چپے چپے سے واقف ہوں اور مجھ سے زیادہ تیجو اور لالو اُن راستوں کو جانتے ہیں۔"

تیجو ہاتھ باندھے چند قدم کے فاصلے پر کھڑا تھا۔ رام داس نے اُس کی طرف دیکھ کر سوال کیا: "تم ان کے ساتھ جا رہے ہو؟"

"جی مہاراج!" اس نے جواب دیا۔

"بہت اچھا! اب دیر نہ لگاؤ۔ میں تھوڑی دور تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔"

لالو، رام داس کے گھوڑے کی باگ مادھو کے ہاتھ میں دے کر تیجو کے ساتھ بھیڑیں اور بکریاں ہانکنے لگا۔ رام داس نے مادھو کے ہاتھ سے گھوڑے کی باگ پکڑ لی اور رندھیر اور مادھو کو دوسرے دو گھوڑے جو قریب ہی ایک جھاڑی کے ساتھ بندھے ہوئے تھے، کھول لانے کے لیے کہا۔ جب وہ گھوڑے لے آئے تو وہ موہنی اور شانتا کی طرف متوجہ ہوا: "تم دونوں گھوڑوں

پر سوار ہو جاؤ۔"

شانتا اور موہنی پاس ادب سے ہچکچائیں لیکن رام داس کے اصرار پر رندھیر نے موہنی اور مادھو نے شانتا کو گھوڑوں پر بٹھا دیا۔

رام داس نے کنول سے کہا: "بہن! تم میرے گھوڑے پر سوار ہو جاؤ۔"

کنول نے جواب دیا: "نہیں! میں پیدل چلوں گی۔"

رام داس نے کہا: "نہیں بہن! چڑھائی پر آپ کو تکلیف ہوگی۔ ہمیں دیر نہیں لگانی چاہیئے۔"

رندھیر نے رام داس کی تائید کی اور کنول مجبور ہو کر گھوڑے پر سوار ہو گئی۔ رام داس، رندھیر اور مادھو، کنول، شانتا اور موہنی کے گھوڑوں کی لگامیں پکڑ کر ایک تنگ اور دشوار گزار گھاٹی پر چڑھنے لگے۔

رام داس نے راستے میں کنول سے سکھدیو کے متعلق پوچھا اور وہ اُس کی قید سے رہا ہونے کے بعد اس کی موت تک واقعات بیان کرنے لگی۔ جب بدھو کا ذکر آیا تو وہ بے اختیار رو پڑی۔ تمام داستان سننے کے بعد رام داس نے کہا "بہن! افسوس ہے تم اتنی دیر سے یہاں تھیں اور مجھے خبر نہ ہوئی۔ مجھے بدھو کی موت کا دکھ ہے اب اس کی جگہ رندھیر اور موہنی آپ کو سونپ رہا ہوں۔"

رام داس نے ذرا مڑ کر موہنی کی طرف دیکھا۔ وہ سر جھکائے آنسو بہا رہی تھی۔

---

(۴)

دوپہر کے قریب یہ لوگ پہاڑی عبور کر کے ایک سرسبز وادی میں داخل ہوئے اور ایک جگہ رک کر تیجو اور لالو کا انتظار کرنے لگے۔ نیلگوں آسمان پر آہستہ آہستہ بادل

چھائے ہوئے تھے۔ موہنی کے چہرے سے اس کی دل کی کیفیت کا اندازہ لگاتے ہوئے
رام داس نے اس کے قریب جا کر کہا: "بیٹی! میں تمہیں ایک خوش خبری سنانا چاہتا
ہوں۔ تمہارا پتا رات میرے پاس آیا تھا۔ میں نے اس کی تسلی کر دی ہے وہ اب تم
سے خفا نہیں۔ اسے معلوم نہ تھا کہ مادھو سکھدیو کا بیٹا ہے۔ میں نے اس سے وعدہ
کیا ہے کہ بہت جلد اسے اور تمہاری ماتا کو تمہارے پاس لاؤں گا۔"

اس کے بعد وہ رندھیر سے مخاطب ہوا: "بیٹا! مجھے چند دن تک اپنے نئے
گھر کا پتہ دینا۔"

رندھیر نے مغموم لہجے میں کہا: "پتا جی! آپ ہمارے ساتھ کیوں نہیں چلتے؟"

کنول بولی: "ہاں بھیا! چلو ہمارے ساتھ۔"

موہنی نے کہا "چلو چچا!"

مادھو نے کہا: "ہاں چلیے! وہاں آپ کو کوئی تکلیف نہ ہوگی۔"

شانتا اب تک خاموش تھی۔ رام داس نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:
"لیکن بیٹی شانتا شاید مجھے ساتھ لے جانا پسند نہیں کرتی وہ ابھی تک خاموش ہے۔"

شانتا نے بدحواس ہو کر سب کی طرف دیکھا اور کہنے لگی: "پتا جی! اگر آپ
میرا کہا مان لیں تو میں ایک بار نہیں ہزار بار کہتی ہوں کہ آپ ہمارے ساتھ چلیں۔"

رام داس نے شفقت آمیز لہجے میں کہا: "بیٹی! میں تمہاری کسی خواہش کو
رد نہیں کر سکتا۔ میں بہت جلد تمہارے پاس آؤں گا۔ وہ جھونپڑی جس میں تم اور رندھیر
رہو گے، مجھے شہر کے محلات سے کہیں زیادہ عزیز ہوگی لیکن اس وقت میرے
فرائض مجھے شہر چھوڑنے کی اجازت نہیں دیتے۔ میں وہاں رہ کر ہزاروں مظلوم
لوگوں کی حفاظت کر سکتا ہوں۔ اگر میں آج شہر چھوڑ دوں تو ممکن ہے کہ میری جگہ پھر
کوئی گنگا رام جیسا آدمی شہر کا سردار بنایا جائے اور اچھوتوں کے بلیدان کے لیے

کالی دیوی کے مندر کے دروازے پھر کھل جائیں۔ جب تک مجھے یہ اطمینان نہیں
ہوتا کہ میری جگہ لینے والا کوئی رحم دل انسان ہے میں وہاں رہ کر ان لوگوں کی حفاظت
کرتا رہوں گا۔"

رندھیر نے کہا: "لیکن پتا جی ان واقعات کے بعد برہمن راجہ کے پاس جا کر آپ
کی شکایت ضرور کریں گے اور ممکن ہے کہ راجہ آپ کے ساتھ اچھا برتاؤ نہ کرے۔
بے شک وہ آپ کی بہت عزت کرتا ہے لیکن مجھے امید نہیں کہ وہ یہ سب باتیں برداشت
کرے گا!"

رام داس نے جواب دیا: "راجہ سب کچھ برداشت کر سکتا ہے لیکن یہ برداشت
نہیں کر سکتا۔ کہ وہ اپنی ریاست کے ایک حصے سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو جائے
اسے یقین ہے کہ میرے سوا کوئی اور سردار ان لوگوں کو پُرامن رکھنے میں کامیاب
نہیں ہو سکتا۔ اگرچہ اب ان لوگوں میں بغاوت کی روح باقی نہیں رہی۔ پھر بھی گزشتہ
لڑائیوں میں ناکامیوں کا اس کے دل پر گہرا اثر ہے۔ وہ دل ہی دل میں آج تک ان
برہمنوں سے نفرت کرتا ہے۔ جنہوں نے اسے سکھدیو کے خلاف بھڑکایا تھا۔
پہلے ان لوگوں کے ساتھ میری رواداری مصلحتوں کی بنا پر تھی۔ اب میں ان کے
ساتھ ہمدردی کرنا اپنا دھرم سمجھتا ہوں۔ میری رواداری ان کے لیے ایک خواب آور
نشہ تھی۔ میری ہمدردی انہیں اب خواب سے بیدار کرنا چاہتی ہے۔"

رام داس نے مادھو کی طرف دیکھا اور کہا:

"مادھو! میں تمہارے متعلق بہت مایوس ہوں۔ سپنوں سے دل بہلانے
والا انسان نہ اپنے لیے مفید ہو سکتا ہے نہ دوسروں کے لیے سماج
کو غلط قسم کے قوانین کی تبدیلی پر مجبور کرنے کے لیے خوشامد سے کام
نہ چلے گا۔ یہ دنیا ایک شاہراہ ہے جس پر مختلف قوموں کے قافلے

گزر چکے ہیں اور گزرتے رہیں گے۔ اس شاہراہ پر ہر قوم کو قدم قدم پر خوفناک گڑھوں، بھیانک تاریکیوں اور مہیب طوفانوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ اس شاہراہ پر دوڑنے والے ہر قافلے کی یہ خواہش ہے کہ وہ کسی سے پیچھے نہ رہے۔ لیکن تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ قدرت کامیابی کا سہرا صرف اُن کے سر باندھتی ہے جن کا عزم ان گڑھوں کو دیکھ کر متزلزل نہیں ہوتا، جو انتہائی پامردی کے ساتھ تاریکیوں اور طوفانوں کا مقابلہ کرتے ہیں۔ جو قافلے ان گڑھوں کو دیکھ کر ڈگمگائے جو طوفانوں اور تاریکیوں میں سہم کر رہ گئے۔ قدرت کا ہاتھ ان کی اعانت کے لیے نہ اٹھا۔ تیز رفتار قافلوں نے انہیں سہارا دے کر اپنے ساتھ شامل کرنے کی کوشش نہ کی بلکہ اپنا بوجھ ان پر لاد دیا۔ وہ گرے اور پیچھے آنے والوں کے پاؤں تلے پس کر رہ گئے۔ تاریخ کے صفحات پر صرف چند ترقی یافتہ قوموں کی داستانیں نقش ہیں لیکن آج تک پستی کے گڑھوں میں گرنے اور تاریکیوں میں بھٹک کر دم توڑنے والے انسانوں کو کسی نے توجہ کا مستحق نہیں سمجھا وہ جیسے کبھی تھے ہی نہیں.

وہ لوگ جو اس شاہراہ کی خوفناک کھائیوں کو اپنی لاشوں سے پاٹتے ہیں جو تند اور تیز طوفانوں کے مقابلے میں متزلزل نہ ہونے والی چٹانیں بن کر نکلتے ہیں جو حوصلہ شکن تاریکیوں میں ایمان و عمل کی مشعل روشن کرتے ہیں دنیا میں کامرانی اور کامیابی اُن کے پاؤں چومتی ہے۔ یہ شاہراہ کہیں بے آب و گیاہ صحراؤں اور کہیں سرسبز و شاداب نخلستانوں میں سے گزرتی ہے۔ جنھوں نے صحرا کی کلفتوں

سے اکتا کر نخلستانوں میں سستانے کی کوشش کی۔ وہ اونگھتے اونگھتے سو گئے اور وہ جو ان سے بہت پیچھے تھے بہت آگے نکل گئے اور جاتے جاتے انہیں جگانے کی بجائے غلامی کی آہنی زنجیروں میں جکڑ گئے اور پھر ان کی یہ خواہش کہ انہیں ہمیشہ کے لیے غلام رکھا جائے، محکوموں کے لیے قانون بن گئی۔

جن لوگوں میں تم نے زندگی کے چند سال گزارے ہیں وہ نئے نئے غلام ہوئے ہیں اور ان میں ابھی آزادی کی تھوڑی سی رمق باقی ہے لیکن تم اُن اچھوتوں کو نہیں جانتے جو برسوں سے غلام چلے آتے ہیں۔ وہ طاقتور کی لاٹھی کے اشارے کو بھگوان کا قانون سمجھتے ہیں۔ اگر تم انہیں جا کر یہ کہو کہ تم میں اور تمہارے اونچی ذات کے آقاؤں میں کوئی فرق نہیں تو وہ حیرت سے تمہارا منہ دیکھیں گے۔ اگر تم اُن سے یہ کہو کہ آزادی تمہارا پیدائشی حق ہے تو وہ تمہیں دیوانہ کہیں گے اور اگر تم یہ کہو کہ بھگوان کی نظر میں اونچ اور نیچ ایک سا درجہ رکھتے ہیں تو وہ تمہیں پاپی سمجھیں گے۔ حکمرانوں کی سماج کا قانون ان کے لیے دھرم بن چکا ہے اور وہ آزادی کی ہر جد وجہد کو دھرم کے خلاف اعلانِ جنگ سمجھتے ہیں اور جب کسی جماعت کے انسانوں میں کمتری کا احساس دھرم کی حد تک پہنچ جاتا ہے تو اس کی اصلاح بہت مشکل ہو جاتی ہے۔ تاہم میں تمہیں مایوس نہیں کرنا چاہتا تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ بعض قومیں عروج کی آخری بلندی سے گریں اور پستی کی انتہائی گہرائی تک پہنچ گئیں اور بعض پستی کی آخری گہرائی سے اٹھیں اور بلندی کے آخری زینے تک پہنچ گئیں۔ لیکن یاد رکھو!

تم ان لوگوں میں سے نہیں جو گری ہوئی قوم کو اٹھاتے ہیں جو گرتوں کو اپنی لاشوں سے پاٹ کر ہموار کرتے ہیں جو طاقتور سے اپنا کھویا ہوا حق واپس لینے کے لیے سینہ سپر ہونا جانتے ہیں۔ اونچی ذات والوں سے تمہاری جنگ اس لیے نہیں کہ انھوں نے انسانیت کے تمام حقوق تم سے چھین لیے ہیں۔ نہیں! تم صرف اپنے طاقتور آقاؤں سے چند مراعات چاہتے ہو، اور وہ یہ کہ وہ تمہارے لیے اپنے مندروں کے دروازے کھول دیں، تمہیں اپنے کنوؤں سے پانی پینے دیں۔ اپنے شہروں میں داخل ہونے دیں اور اپنی مورتیوں کی پوجا کرنے دیں۔

تمہاری مثال اس آدمی کی سی ہے جس کے گھر پر ڈاکو قبضہ کر لیں اور اسے زنجیروں میں کس کر ایک تنگ و تاریک کوٹھڑی میں پھینک دیں اور وہ طاقت ور لٹیروں سے مرعوب ہو کر صرف یہ کہے کہ یہ زنجیر مجھے چبھتی ہے اس لیے ذرا ڈھیلی کر دو۔ تنگ و تاریک کوٹھڑی میں میرا دم گھٹتا ہے اس لیے اس کا ایک روزن کھول دو۔ تاریکی میں میرا جی گھبراتا ہے اس لیے میری کوٹھڑی میں ایک چراغ روشن کر دو۔ جب تم میرے مکان کے کشادہ کمروں میں بیٹھ کر گاتے ہو تو میرا بھی جی چاہتا ہے اس لیے مجھے بھی گلا پھاڑنے کی اجازت دے دو۔ وہ صرف چند ٹکڑوں کی بھیک مانگتا ہے اور یہ بھول جاتا ہے کہ یہ تمام خزانہ اس کا تھا اور پھر جو ملتا ہے اسے اپنے لیے ایک بہت بڑا انعام سمجھتا ہے اور جو نہیں ملتا اُس کے متعلق یہ خیال کرتا ہے کہ یہ اس کا حق ہی نہ تھا۔ غلامی، بے بسی اور مجبوری اس کے لیے دھرم بن جاتی ہے۔ اور طاقت ور لٹیرا اسے انسان نہیں دیوتا نظر آتا ہے۔

فرض کرو اگر سماج تمہارے لیے اپنے مندروں کے دروازے کھول دے تمہیں اپنے کنوؤں سے پانی پینے، اپنے شہروں میں داخل ہونے اور اپنی مورتیوں کی پوجا کرنے کی اجازت دے دے تو کیا تمہاری مثال اس شخص سے مختلف ہو گی جس کے گھر پر قبضہ کرنے والے اس کی التجاؤں پر اس کی تاریک کوٹھڑی کا روزن کھول دیں یا اس کے سامنے ایک چراغ رکھ دیں۔

کیا یہ مراعات حاصل کرنے کے بعد تم سماج والوں کی برابری کا دعویٰ کر سکو گے؟ ہرگز نہیں۔ دو انسان ایک ہی کنوئیں کا پانی پینے ایک ہی مورتی کی پوجا کرنے اور ایک ہی شہر میں رہنے کے باوجود آقا اور غلام ہو سکتے ہیں؟ اس دنیا میں طاقت ور کا ہاتھ ہمیشہ کمزور کے اوپر رہے گا۔ کمزور طاقت ور کے برابر بیٹھ کر بھی برابری کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ طاقت، کمزور کی جھونپڑی کو گرا کر محل تعمیر کرتی ہے طاقت ور کی خواہش کمزور کے لیے قانون اور قانون سے دھرم بن جاتی ہے۔

مادھو! گری ہوئی قوم کو اٹھانے کا کام بہت کٹھن ہے تمہارا باپ ایک بہادر آدمی تھا اس کے ارادے بہت بلند تھے اور میں سمجھتا تھا کہ قدرت نے اسے ایک گری ہوئی قوم کو اٹھانے کے لیے منتخب کیا ہے۔ وہ اس ملک میں ایک بہت بڑا انقلاب لائیگا لیکن وہ حوادث کے سمندر میں فقط ایک بار غوطہ لگانے کے بعد ہمیشہ کے لیے کنارے پر بیٹھ گیا۔ وہ ان لوگوں کو جگانے کے لیے آیا تھا لیکن خود سو گیا۔ تاہم اس کے دل میں صداقت کے لیے

ایک تڑپ تھی۔ اُس نے ظلم برداشت کیا لیکن ظلم کا ساتھ نہ دیا۔
اس نے مظلوموں کے ساتھ محبت کی لیکن اس کی محبت اسے مظلوموں
کی دادرسی کے لیے سینہ سپر ہونے پر آمادہ نہ کر سکی۔

اگر بہن کنول بُرا نہ مانے تو میں یہ کہوں گا کہ اُس کے ذہنی انقلاب
کا باعث یہ تھی اور اسی طرح تمہارا انتہائے مقصود موہنی ہے۔ تم
اس سے زیادہ کچھ نہیں چاہتے۔ تم اس جگہ جا بسے ہو جہاں آزاد
لوگ بستے ہیں۔ وہاں موہنی کے ساتھ تمہیں شہروں اور مندروں کا
خیال نہ ستائے گا۔ تم یہ سب کچھ بھول جاؤ گے۔ تمہیں موتیاں بنانے
کی بھی ضرورت نہیں رہے گی۔ لیکن اپنے دل کو یہ فریب نہ دینا کہ تم
آزاد ہو اور آزاد رہو گے۔ تم بھی ان لوگوں میں جا کر سو جاؤ گے۔ اور
سونے والے زیادہ دیر امن کی نیند نہیں سوتے۔ اس وادی سے
کوئی گنگا رام پھر اُٹھے گا اور بے فکری کی نیند سونے والے
چرواہوں کو غلامی کی زنجیریں پہنا دے گا۔"

رام داس کی تقریر کے دوران مادھو کے چہرے پر کئی رنگ آئے اور
گئے۔ اُسے اس بات کا اعتراف تھا کہ موہنی اس کی زندگی کی سب سے بڑی آرزو
تھی اور وہ موہنی کے لیے زندگی کی ہر دلچسپی قربان کرنے کے لیے تیار تھا لیکن
وہ یہ ماننے کے لیے تیار نہ تھا کہ اپنی کشتی کنارے آ لگنے کے بعد وہ منجدھار میں
ڈوبنے والوں کی چیخ پکار سے کان بند کر لے گا۔ وہ ایک تھکے ہوئے مسافر کی
طرح کسی ٹھنڈے اور میٹھے پانی کے چشمے کے کنارے تھوڑی دیر ستانے
کے بعد تازہ دم ہو کر صحرا میں بھٹکنے والے مسافروں کی راہنمائی کی تدبیریں سوچنا
چاہتا تھا۔ ٹھنڈا اور میٹھا چشمہ موہنی تھی۔ جس کی تلاش میں بھٹکتے ہوئے اس نے

صحراؤں میں کئی پیاسے انسانوں کو دم توڑتے دیکھا تھا۔ موہنی کی محبت کو ایک
خواب آور نشہ سمجھ کر سو جانے کی بجائے وہ اسے شاہراہِ حیات کی بلند منازل کی
طرف قدم اٹھانے کے لیے زادِ راہ بنانا چاہتا تھا۔ موہنی کا سہارا لے کر وہ طوفان
سے لڑ سکتا تھا۔ موہنی کو مشعل بنا کر وہ اپنے راستے کے تاریک گڑھوں میں پاؤں
رکھ سکتا تھا۔

تاہم رام داس کی تقریر کے بعد وہ اپنے دل میں ایک نیا اضطراب اور ایک
نئی کشمکش محسوس کرتا تھا۔ وہ اپنے دل سے کُرید کُرید کر پوچھ رہا تھا: کیا گرے
ہوئے انسانوں کو فقط ایک نڈر اور مستقل مزاج راہنما کی ضرورت ہے؟ کیا دنیا
کے تمام مسائل کا علاج فقط طاقت ہی ہے؟ کیا کمزور، طاقتور ہو کر عام طور پر
ظالم نہیں بن جاتا؟ کیا اس شاہراہ میں آگے بڑھنے والے طاقتور انسانوں کا یہ
حق ہے کہ وہ کمزور انسانوں پر اپنا بوجھ لاد دیں۔ انہیں دھکیل کر ذلت اور غلامی
کے گڑھوں میں پھینک دیں؟ کیا طاقتور کی بادشاہت کمزور کی غلامی کا باعث
نہیں ہوتی؟"

کچھ دیر سر جھکا کر سوچنے کے بعد مادھو نے رام داس کی طرف دیکھا اور کہا،
"آپ نے مجھے غلط سمجھا۔ میں بزدل نہیں۔ مجھ سے یہ بھی ممکن نہیں کہ میں اپنی
زندگی کا آرام ڈھونڈ کر دوسروں سے بے پروا ہو جاؤں۔ لیکن گرے ہوئے انسانوں
کو اٹھانے کے متعلق میرے خیالات آپ سے بہت مختلف ہیں۔ میں طاقتور کا
یہ حق تسلیم نہیں کرتا کہ وہ کمزور کو پیس ڈالے۔ میں دنیا میں طاقت کا قانون نہیں،
انصاف کا قانون چاہتا ہوں۔ طاقت کا قانون انسانوں کو ذہنی طور پر درندہ بنا دیتا
ہے اور اس دنیا میں ایک ایسی جنگ کا بیج بوتا ہے جو کبھی ختم نہیں ہوتی۔ ظالم
کمزور ہو کر مظلوم اور مظلوم طاقتور ہو کر ظالم بنتے رہیں گے۔ غلام آقا اور آقا

غلام بنتے رہیں گے۔ میں اس دنیا میں نہ کمزور کی غلامی چاہتا ہوں اور نہ طاقتور کی بادشاہت۔ میں طاقت کے لیے نہیں انصاف کے لیے لڑنا چاہتا ہوں اور دنیا میں انصاف کا قانون وہ ہوگا۔ جو آقا اور غلام کے وجود سے منکر ہو، جس میں چھوت اور اچھوت کا امتیاز نہ ہو۔ جو انسان کو انسان کے احترام پر مجبور کرے جس کا خوف ایک طاقت ور کو کمزور کے گھر پر قبضہ کرنے سے باز رکھ سکے۔"

رام داس نے کہا: "بیٹا! یہ صرف تمہارے سپنے ہیں۔ دنیا کے کسی ملک میں ایسا قانون نہیں اور اگر کوئی ایسا قانون لے کر آیا بھی تو دنیا کے تمام سرکش انسان اس کے مقابلے کے لیے متحد ہو جائیں گے۔ دنیا میں بلند و پست کو ایک سطح پر لا کر کھڑا کرنا ایک ایسا کام نہیں جو صرف باتوں سے ہو سکے۔"

مادھو نے جواب دیا: "دنیا میں کسی شے کے نہ ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ اس کی ضرورت سے انکار کیا جائے۔ غاروں میں رہنے والے انسانوں نے جھونپڑیاں بنانے کی ضرورت محسوس کی۔ جھونپڑیاں تند ہواؤں اور تیز بارشوں میں کام نہیں دیتیں، تو وہ مٹی اور پتھر کے مکان بنانے پر مجبور ہوئے۔ امن دنیا کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ طاقت کے قانون کے ماتحت نہ ختم ہونے والی جنگیں انسان کو کسی ایسے قانون کا جویا بنا دیں گی۔ میں مانتا ہوں کہ ایسے قانون کی احتیاج زیادہ تر انسانوں کا مظلوم طبقہ محسوس کرے گا اور کمزوروں کی ہڈیوں پر اپنے محل تعمیر کرنے والے اس کے مقابلے کے لیے اٹھیں گے لیکن صداقت کا ریلا رکا ہے گا۔ ایسے قانون کی فتح ہوگی۔ اس قانون کے علمبردار کسی ایسے بھگوان کا تخیل پیش کریں گے جو سب کو ایک آنکھ سے دیکھتا ہو۔ وہ ایسے مندر تعمیر کریں گے جن کے دروازے چھوت اور اچھوت کے لیے یکساں طور پر کھلے ہوں۔ وہ دن دور نہیں جب انسان ذات سے نہیں بلکہ اعمال سے

پہچانا جائے گا۔ طاقت کی لاٹھی نیکی کی تلوار کے سامنے جھک جائے گی۔ دنیا کی یہ جنگ ظلم کے خلاف نیکی کی جنگ ہوگی۔ اور میں اگر زندہ رہا تو اس جنگ میں ایک سپاہی بن کر شریک ہوں گا اور پھر دنیا دیکھے گی کہ میں بزدل نہیں۔"

رام داس نے کہا: "بھگوان کرے وہ وقت جلد آئے اور میں بھی تمہارا ساتھ دے سکوں۔ لیکن اگر کوئی ایسے قانون کا جھنڈا بلند کرنے نہ آیا تو ۔۔۔؟"

مادھو نے مغموم لہجے میں جواب دیا: "جس کے ہاتھ میں رات کے وقت چلنے کے لیے مشعل نہ ہو اس کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ صبح کا انتظار کرے۔ میں انتظار کرتا رہوں گا۔"

رام داس نے مسکراتے ہوئے کہا: "جب تک صبح نہ ہو شہر اور مندروں کا رخ نہ کرنا۔ تم اندھیرے میں بہت کچھ کھو چکے ہو۔"

کنول بولی: "میں اب اس کی رکھوالی کروں گی۔"

کنول کو اس موقع پر بدھو کا خیال آیا اور اس کی مسکراہٹ اچانک پژمردگی میں تبدیل ہو گئی۔

رام داس نے رندھیر کی طرف دیکھا: "اچھا اب مجھے دیر ہو رہی ہے۔ بیٹا! بہن کنول کو اپنی ماں سمجھنا۔ شانتا کو کوئی تکلیف نہ ہونے دینا۔ مادھو کو اپنا بڑا بھائی سمجھنا اور مادھو تمہیں یہ کہنے کی ضرورت نہیں سمجھتا کہ موہنی کو کوئی تکلیف نہ ہو اور بہن کنول! ان کی شادی کی رسوم کے لیے ہماری سماج کا کوئی پروہت رضامند نہیں ہوگا۔ میں یہ چاہتا بھی نہیں کہ انہیں اس بات کا علم ہو۔ پندرہ دن تک رندھیر کو میرے پاس بھیج دینا۔ میں اس کے ساتھ آجاؤں گا۔ اور موہنی! تمہارے پتا کو بھی لیتا آؤں گا۔"

موہنی اور شانتا کے چہروں پر حیا کی سرخی دوڑ رہی تھی۔ رندھیر اور مادھو

کے دل میں مسرت کا ایک طوفان لہریں لے رہا تھا۔ کنول کی آنکھوں میں خوشی
کے آنسو چھلک رہے تھے۔

رخصت ہوتے وقت رام داس نے اپنا گھوڑا کنول کو دے کر پیدل لوٹنا
چاہا لیکن کنول نے رام داس کی تکلیف کے احساس سے گدھے کی سواری کو
ترجیح دی اور اسے مجبوراً اپنا گھوڑا لینا پڑا۔

---

(۵)

بادلوں کے قافلے مشرق کے اونچے پہاڑوں سے اٹھ اٹھ کر مغرب کے
وسیع میدانوں کا رُخ کر رہے تھے۔ رام داس نے پہاڑی کی چوٹی پر پہنچ کر گھوڑا
روکا اور مڑ کر نیچے دیکھنے لگا۔ کنول اور اُس کے ساتھی وادی سے گزر کر ایک
بل کھاتی ہوئی پگ ڈنڈی کے راستے پہاڑ پر چڑھ رہے تھے۔ رام داس دیر تک
انہیں دیکھتا رہا۔ جب یہ قافلہ پہاڑی کی اوٹ میں چھپ گیا۔ اس نے گھوڑے کی باگ
ڈھیلی چھوڑ دی اور آہستہ آہستہ پہاڑ سے نیچے اترنے لگا۔

خیالات کے ہجوم نے رام داس کو اپنے گرد و پیش سے بے خبر کر دیا۔ وہ تصور
میں کسی اونچے پہاڑ کے دامن میں جہاں جگہ جگہ آبشار تھے۔ کسی جھیل کے کنارے
دیودار اور چیڑ کے بلند درختوں کے درمیان ایک چھوٹی سی جھونپڑی دیکھ رہا تھا وہ
جھونپڑی جس میں اس کا بیٹا اور بہو رہتے تھے وہ ان دونوں کے درمیان بیٹھا ہوا
تھا۔ شانتا ایک ننھے سے خوبصورت بچے کو اپنی گود سے اٹھا کر اس کی گود میں ڈال
کر یہ کہہ رہی تھی۔

جاؤ اپنے بابا کے پاس! تم بہت شریر ہو اور وہ بچہ اپنے نازک ہاتھوں

سے اس کی مونچھیں پکڑنے کی کوشش کر رہا تھا اس کی انگلی پکڑ کر اپنے منہ میں ڈال
رہا تھا اور وہ اس کے ہاتھ اور پاؤں چوم رہا تھا۔

(نسیم حجازی)

کوئٹہ۔

سلطان احمد خوش نویس، گجرات۔ ۶۴ء